تحقیق و مکالمہ پر مبنی علمی و فکری جریدہ

سالنامہ خصوصی اشاعت اسلام آباد

تحقیقات

TAHQIQAAT

2022

مسلم دنیا
اور
مذہبی آزادی

تحدیات و امکانات

مدیرِ اعلیٰ محمد اسرار مدنی

تحقیق ومکالمہ پر مبنی علمی وفکری جریدہ

سالنامہ اسلام آباد

تحقیقات

TAHQIQAAT

مسلم دنیا اور مذہبی آزادی

تحدیات وامکانات

انٹرنیشنل ریسرچ کونسل
برائے
مذہبی اُمور

اسلام آباد، پاکستان
+92 311 02 99 995
+92 51 22 25 650

خصوصی اشاعت

2022

سرپرستِ اعلیٰ
پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز

مدیرِ اعلیٰ
محمد اسرار مدنی

مدیر
شفیق منصور

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ

ترتیب

- تقریظ 7
- مقدمہ 8

مذہبی آزادی: اسلامی تناظرات

- اسلام میں مذہبی آزادی اور رواداری کا تصور .... فتح اللہ گولن 19
- اسلام کے ثقافتی اور جغرافیائی مظاہر کی وسعت: رواداری کے عملی نمونے
.........ڈاکٹر سید حسین نصر 30
- مذہبی آزادی، ارتداد اور تبدیلیِ مذہب .... ہاشم کمالی 41
- انسانی حقوق اور مذہبی آزادی کا اسلامی اعلامیہ .... محبوب احمد غازی 67

مغرب، بین الاقوامی تنظیمیں اور مذہبی آزادی

- مغرب میں مذہبی آزادی اور آزادیِ اظہار: توازن کی تلاش
............نور حیات خان، غیاث احمد 79
- مسلمان اور مغرب: مذہبی تناؤ یا سیاسی کشمکش .... برنارڈ لیوئس 88
- مذہب، عقیدے کی آزادی اور اقوام متحدہ کے منشور .... رشاد بخاری 102
- مغربی سیاست و سماج میں اسلاموفوبیا: اسباب، مسائل اور تدارک
..............عبد الرشید اگوان 131

مشرق وسطی اور مذہبی آزادی

- مشرق وسطی کی خانہ جنگیاں: کیا مذہب ہی واحد وجہ ہے؟ .... ابراہیم قالن 143

- سعودی عرب کا وژن 2030ء اور مذہبی رواداری کے لیے کوششیں
.... محمد اسرار مدنی 147
- ایران میں مذہبی اقلیتوں کی صورتحال .... تحمید جان ازہری 156
- لبنان: مذہبی وفرقہ وارانہ کشمکش کی سرزمین .... شفیق منصور 163
- ترکی، اقلیتوں کے لیے محفوظ اور مثالی جگہ .... فائزہ حسیب 168
- ملائیشیا: ایک کثیر المذاہب اور تنوع پسند سماج .... رباب زینب 175

برصغیر میں مذہبی آزادی کی بنیادیں اور مسائل

- برصغیر میں ہندو مسلم تاریخی تعلقات .... شفیق منصور 185
- بھارت میں مسلم اقلیت کی صورتحال: آئینی اور انتظامی ڈھانچے کا تجزیہ
.... ڈاکٹر ایم کے صدیقی، پروفیسر اقبال انصاری 192
- بنگلہ دیش میں مذہبی آزادی اور اقلیتیں .... کرن فدا 203

پاکستان میں مذہبی آزادی کا مسئلہ

- پاکستان میں مذہبی آزادی کا سوال: دستوری مباحث .... ظفر اللہ خان 211
- مذہبی آزادی کا مسئلہ: مسلم مذہبی تحریکات کا کردار .... شمس الدین شگری 220
- اہل تصوف متشدد کیوں بنے؟ .... صاحبزادہ امانت رسول 230
- پاکستان میں مذہبی آزادی اور اقلیتوں کے تحفظ کے قوانین .. ارم خالد، مقبول انور 237
- اسلامی اور پاکستانی قانون میں مذہبی آزادی کے معیار .... ڈاکٹر محمد شاہد حبیب 246
- پاکستان میں مذہبی آزادی کا تصور اور علماء کا کردار .... مجتبیٰ محمد راٹھور 257
- مذہبی جماعتوں کے منشور میں اقلیتوں کے حقوق .... محمد اعجاز 266
- پاکستان میں انتہا پسندی کا مسئلہ اور سول سوسائٹی کا کردار .. محمد حسین، غلام مرتضیٰ 275

اقلیتیں اور توہینِ مذہب کے قوانین

- توہینِ رسالت کی سزا کے قانون میں بہتری کی ضرورت
  ....پروفیسر ڈاکٹر محمد مشتاق احمد 289
- پاکستان کی مردم شماریاں اور اقلیتوں کی اصل تعداد .... اسلام گل آفریدی 297
- پاکستان کی اقلیتیں: تعارف اور تاریخ .... شکیل انجم ساون 301
- پاکستان میں اقلیتوں کے مسائل: حقائق اور تجاویز.............. محمد اسرار مدنی 310
- احمدیوں کی مذہبی اور آئینی حیثیت کی بحث ....ڈاکٹر عمار خان ناصر 316
- پاکستان میں جبری تبدیلیِ مذہب کا مسئلہ .... ضیاءالرحمان 328
- قانونِ توہینِ مذہب: بین الاقوامی معیارات، تحفظات اور مسائل ... ضیاءالرحمان 336
- پاکستان میں اقلیتوں کے مسائل و حقوق............................ ندیم عباس 347

مسلکی و فرقہ وارانہ کشمکش

- فرقہ واریت کی جڑیں مذہبی یا سیاسی اور تاریخی؟ ....ڈاکٹر ولی نصر 357
- مذہبی و فرقہ وارانہ منافرت کیسے ختم ہو سکتی ہے؟..................... خورشید ندیم 362
- مذہبی و سماجی وحدت کے لئے مسجد و مدرسے کا کردار .... خورشید ندیم 367
- مذہبی آزادی میں حائل رکاوٹیں اور فرقہ واریت........... ڈاکٹر سید محسن نقوی 372

مذہبی آزادی اور پر تشدد واقعات: اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات و مباحث

- (۱) قومی پالیسی برائے بین المذاہب ہم آہنگی 383
- (۲) اقلیتوں کا چارٹر آف ڈیمانڈ 386
- (۳) پاکستان کی اقلیات کے بارے میں برطانوی پارلیمانی وفد کی رپورٹ 387
- (۴) سانحہِ سیالکوٹ کے بعد اسلامی نظریاتی کونسل کی کاوشیں 392
- (۵) مذہبی عدم برداشت اور اقلیتوں کے امور پر اہلِ دانش و علما کی آراء 395

- نوجوانوں کی صلاحیتوں کا ضیاع تناؤ اور لا قانونیت کو جنم دیتا ہے ... ڈاکٹر جہانزیب 395
- توہینِ مذہب کا مسئلہ اور قانونی مسائل و خلا ....پروفیسر ڈاکٹر مشتاق احمد 399
- شدت پسندی کے سدِ باب کے لیے تربیت اور صحیح معلومات کی اہمیت
.......ڈاکٹر عمیر محمود صدیقی 403
- سانحہ سیالکوٹ پر اسلامی نظریاتی کونسل کا اعلامیہ (تجاویز) 406

مذہبی آزادی اور اقلیتوں کے حقوق سے متعلق اہم عدالتی فیصلے

- (۱) جسٹس تصدق جیلانی کا فیصلہ 408
- (۲) توہینِ مذہب سے متعلق مقدمات پر سپریم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ 413

تقریظ

دورِ حاضر میں دنیا کی تمام اقوام کے ہاں جن بنیادی انسانی حقوق اور آزادیوں پر اتفاق کیا گیا ہے ان میں ایک بنیادی نکتہ مذہبی آزادی بھی ہے۔اسلام کی رُو سے تو یہ معاملہ بالکل واضح اور روزِازل سے طے شدہ ہے کہ تمام انسانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے اور یہ کہ دینِ اسلام کو قبول کرنے کے لیے کسی پر جبر نہیں کیا جائے گا اور نہ ہی مجبوری کے تحت اختیار کیا گیا مذہب اللہ کے ہاں قابل قبول ہوگا۔ چنانچہ مسلم تہذیبی تاریخ میں ہمیں مذہبی آزادی کے عظیم مظاہر ملتے ہیں۔ مختلف مسلم بادشاہتوں نے مذہبی آزادی اور بین المذاہب رواداری کو اپنے معاصر تصورات کے تحت یقینی بنائے رکھا جس کی تمام غیر جانبدار مؤرخین شہادت دیتے نظر آتے ہیں۔ تاہم دور حاضر میں جدید عالمگیریت کے نتیجے میں جب دنیا کے بیشتر ممالک میں کثیر الثقافتی اور کثیر المذہبی معاشرے وجود میں آئے تو مذہبی آزادی کے تصورات نے نیا رخ اختیار کیا اور مغربی دنیا میں مذہب فرد کا ذاتی معاملہ قرار پایا تو مذہبی آزادی کے حوالے سے اسلامی تناظر میں کئی نئے پہلو اور سوالات سامنے آئے۔ ان میں سے جہاں کچھ سوالات کا تعلق اسلامی تعلیمات کی تعبیر و تشریح کے ساتھ ہے وہیں بعض امور معاصر قوانین، تنظیموں اور اجتماعی رویوں سے متعلق بھی ہیں۔ ایک عرصے سے خواہش تھی کہ اس موضوع کو تمام جہات کے ساتھ زیر بحث لایا جائے تاکہ مذہبی آزادی کے حوالے سے اسلامی اور مغربی تناظرات منقح ہو کر سامنے آئیں۔ مجھے خوشی ہے کہ تحقیقات کے اس شمارے میں محترم اسرار مدنی صاحب نے مذہبی آزادیوں کے حوالے سے ان تمام مباحث کو سمو دیا ہے۔ امید ہے کہ یہ شمارہ اس موضوع پر ایک جامع دستاویز کی صورت سامنے آئے گا اور اہل علم کے ہاں اسے پذیرائی حاصل ہوگی۔

ڈاکٹر قبلہ ایاز

چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل

مقدمہ

عصرِ حاضر میں مذہبی آزادی کا سوال

مذہبی آزادی کا سوال عصر حاضر میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ پوری دنیا میں سیاسی اور سماجی سطح پر یہ امر واضح محسوس کیا جاسکتا ہے کہ مذہبی آزادی کو شدید خطرات لاحق ہیں۔ پھر یہ مسئلہ کسی ایک خطے یا قوم کا نہیں ہے بلکہ ساری دنیا کے ممالک میں مذہبی عدم برداشت ایک مسئلہ بن سامنے آئی ہے۔ اگرچہ وہ خطے جہاں سیاسی اور سماجی ڈھانچے کمزور ہیں اور قانون کی حکمرانی کے مسائل زیادہ ہیں وہاں مذہبی عدم برداشت کے مظاہر بھی زیادہ کھل کر سامنے آتے ہیں۔ مسلم دنیا کو بھی اس صورتحال سے استثنا حاصل نہیں ہے۔ یہاں مذہبی آزادی سے جڑے مسائل اور ان کی شدت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا اس بات کی ہمیشہ ضرورت رہی ہے کہ اس مسئلے کو تسلسل کے ساتھ موضوعِ بحث بنایا جائے۔ صرف اس معنی میں نہیں کہ مسئلے کی موجودگی پہ بات کی جائے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضرورت رہی ہے کہ مسئلے کی مختلف جہات کا زیادہ وسیع تناظر میں تجزیہ کیا جائے۔ اس کے لیے مسلم دنیا اور مغربی دنیا کے تجربات وافکار کو بھی زیر بحث لانے کی ضرورت ہے اور ان امور کو عوامی سطح پر اجاگر بھی کیا جانا چاہیے۔

مذہبی آزادی، سماجی آزادیوں کا لازمی حصہ

مسلم دنیا میں مذہبی آزادی کا سب سے بنیادی پہلو نظریاتی ہے۔ عام طور پہ اگر عدم برداشت نظر آتی ہے یا اس نوع کے واقعات و سانحے رونما ہوتے ہیں تو اس کے پیچھے یہ سبب کارفرما ہوتا ہے کہ مذہبی آزادی کا حقیقی دینی تصور ذہنوں میں راسخ نہیں ہے۔ مذہبی آزادی دراصل سماجی آزادیوں کا ایک لازمی حصہ ہے۔ سماجی آزادی یا سول فریڈم، آزادی کے ان تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے جو سماج میں رہتے ہوئے انسان کی انفرادی زندگی سے متعلق ہوں۔ اس میں انسان کی آزادی (غلامی کے

ملکیت والے تصور سے)، غور وفکر کی آزادی، اظہار رائے کی آزادی، عقیدے کی آزادی جیسی تمام آزادیاں شامل ہیں۔ یہ تصور جدید ریاست و معاشرت کی اساس ہے۔ آزادی کی تعریف پر نظر ڈالتے ہی یہ سوال ابھر کر سامنے آتا ہے کہ کیا مذہب اور آزادی میں مطابقت ممکن ہے؟ یعنی کیا مذہب اور آزادی ایک ساتھ جمع ہو سکتے ہیں؟ عموما مغربی دنیا کے جدید مفکروں کے یہاں آزادی کے حوالے سے گفتگو میں یہ احساس ابھر کر سامنے آتا ہے کہ مذہب آزادی کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے اور اس کی واضح وجہ یہ ہے کہ مغربی دنیا میں آزادی اور حقوق حاصل کرنے کے لیے معاشرے کو مذہبی پیشواؤں اور اداروں بالخصوص چرچ کی سخت گیر بیڑیوں سے لمبی لڑائی کے دور سے گزرنا پڑا ہے۔ ماقبل جدید کی تاریخ میں یورپ مذہبی اداروں کے تحت اس قدر جکڑا ہوا تھا کہ زندگی کے ہر شعبے کے تعلق سے انسان بے بس لاچار اور مذہبی پیشواؤں کا مرہون منت تھا۔ علمی و فکری معاملات ہوں یا عائلی اور سیاسی، سماجی مسائل ہوں یا معاشی، ہر سطح پر اسی مذہبی طبقے کی اجارہ داری اور قبضہ تھا۔ ایسے پس منظر میں اس تصور کا پیدا ہو جانا بعید از قیاس نہیں ہے۔ لیکن سوال اسلام اور آزادی کی باہمی نسبت کے حوالے سے اہم ہے کہ کیا اسلام اور آزادی باہم ایک ساتھ چل سکتے ہیں؟ اہل مغرب تو اس تعلق سے مذاہب کے درمیان فرق نہیں کرتے مگر خود مسلمانوں میں ایک بڑا طبقہ یہی گمان کرتا ہے کہ اسلام اور آزادی یکجا نہیں ہو سکتے۔ اور یہی نظریاتی پہلو اس مسئلے کی اساس ہے۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آزادی کی جس قدر مضبوط بنیاد مذہب کے اندر سے پیش کی جا سکتی ہے وہ جدید دنیا میں پیش کی گئی بنیادوں سے کہیں زیادہ مضبوط اور پائدار معلوم ہوتی ہے۔ وہ اس طرح کہ مغربی مفکرین کے یہاں آزادی دراصل تقاضا ہے انسانی شرف کا۔ جب کہ مذہبی تعلیمات کے مطابق کائنات کی تخلیق کا لازمی تقاضا ہی یہ ہے کہ ہر کوئی آزاد ہو اور اپنی آزادی کے ساتھ اپنے چنے ہوئے راستے کے ثمرات سے مستفید بھی ہو اور ان کے متعلق جوابدہ بھی ہو۔

معاصر معاشرت میں آزادی اظہارِ رائے کو جو حیثیت حاصل ہے اس کا اندازہ بین الاقوامی

امور سے واقفیت رکھنے والا ہر فرد لگا سکتا ہے، اور اس ضمن میں مذہبی اظہار یے سرفہرست آتے ہیں۔ آج آزادیِ تقریر و تحریر انسانی حقوق کا ایک اہم جزو ہے۔ انسان کے جذبات اور احساسات کو اگر کوئی ٹھیس پہنچی ہے تو وہ احتجاج کا حق رکھتا ہے۔ وہ اپنی مظلومیت کا اظہار کر سکتا ہے تاکہ اُس کو انصاف حاصل ہو سکے۔ دنیا کے تمام معاصر مفکرین متفق ہیں کہ انسان اپنی زندگی کے سلسلے میں آزاد ہے البتہ یہ ضروری ہے کہ اس طرز عمل سے دوسروں پر زیادتی نہ ہو۔ اگر کسی قوم یا شخص کے سیاسی، مذہبی اور اقتصادی و سماجی حقوق پامال کئے جاتے ہیں تو وہ اس کے خلاف آواز اُٹھانے کا بھرپور حق رکھتے ہیں۔ یورپ میں اس طرزِ فکر کی ابتدا وسطی دور میں ہوئی۔ برطانیہ میں اظہارِ رائے کی تاریخ کا آغاز سولہویں صدی سے ہوتا ہے۔ انسان کی انفرادی آزادی اور جمہوری حقوق کے لیے کوشش ہوئی۔ امریکہ میں اس رجحان کا آغاز اٹھارویں صدی کے وسطی دور سے ہوا۔ اقوام متحدہ کی جنزل اسمبلی میں آزادی اظہار رائے کو انسان کا بنیادی حق قرار دیا گیا۔ انسانی حقوق کے عالمی اعلامیہ کی دفعہ ۱۹ میں اسے انسانی حق مانا گیا۔

معاصر معاشرت اور مسلم تاریخ

معاصر معاشرت جن جدید تصورات پر کھڑی ہے مسلم دنیا میں ان تمام تصورات کی عملی صورت گری نہیں ہو سکی۔ اسی لیے باقی دنیا کی طرح مسلم دنیا میں بھی بلاشبہ اقلیتوں کے مسائل موجود ہیں جو کہیں کہیں شدید نوعیت کے بھی ہیں۔ یوں مسلم دنیا کے بارے میں یہ تصور راسخ ہو گیا ہے کہ ان میں اقلیتوں اور مذہبی آزادی کے لیے جگہ نہیں ہے۔ مسائل کی موجودگی کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس تصور میں کچھ غلط فہمیاں بھی شامل ہیں۔ اہل مغرب میں اسلام کے بارے یہ غلط فہمی بھی پائی جاتی ہے کہ اسلامی سوسائٹی میں اقلیتوں کے حقوق کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اس لئے مغرب سے مکالمہ میں اس نکتہ کو اجاگر کرنا ضروری ہے کہ عہدِ رسالت ﷺ اور اس کے بعد کی اسلامی دنیا بالخصوص مصر، لبنان، انڈیا اور عثمانی ترکوں کے دور میں ہمیشہ قرآنی اصول کے مطابق

لوگوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل رہی ہے۔اسلامی دنیا میں مذہبی تکثیریت کا وجود اس موقف کی واضح شہادت مہیا کرتا ہے۔ماضی میں ہسپانیہ کے مسلم عہد میں اقلیتوں کو جو حقوق حاصل رہے وہ اُس دور کے اعتبار سے ایک ایسی مثال تھی جسے آج بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔اُس وقت خصوصا یہودیوں کے لیے اگر کوئی امن کی جگہ تھی تو وہ صرف مسلم خطے تھے۔جب صلیبی جنگیں عروج پر تھیں تب بھی اقلیتوں کو اتنا تحفظ اور حقوق میسر تھے کہ یہودی اور مسیحی شہری اپنی کتب مسلمانوں کے چھاپہ خانوں سے شائع کرا رہے تھے۔

اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ آج مسلم دنیا کے کئی خطوں میں مذہبی رواداری کی عمدہ مثالیں اور نمونے بھی موجود ہیں۔ بالخصوص مشرق وسطی میں اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ خلیجی ممالک باقاعدہ ریاستی سطح پر اس حوالے سے بین الاقوامی معیار کے پرزور اقدامات کر رہے ہیں۔ادارے قائم کیے جارہے ہیں، تصنیفی و تحریری مواد شائع کیا جارہا ہے، طلبہ کی تربیت کی جارہی ہے۔ بلاشبہ اِس وقت مشرق وسطی میں بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ کے لیے جس طرز کے اقدامات ہو رہے ہیں ایسا کسی اور جگہ نہیں ہو رہا۔ یہ صورتحال وقت کے ساتھ بہتر ہوتی محسوس ہوتی ہے۔

آزادیِ اظہار کی ثقافتی حدود

البتہ نظامِ اقدار کے اختلاف کی بنا پر یہ ایک لازمی چیز ہے کہ معاشروں کے مابین تصورِ آزادی کی حدود و قیود مختلف ہوں۔ مسلم دنیا میں آزادیِ اظہار کی جو حدود ہیں وہ شاید مغرب میں اس طرح مقبول نہ ہوسکیں۔اس لیے مسلم معاشرت میں آزادی کی قیود موجود ہیں جنہیں ریاستی و سماجی دونوں سطح پر اہمیت حاصل ہے۔

اظہارِ رائے کی آزادی جدید تہذیب و تمدن کا قیمتی اثاثہ ہے۔انسانیت نے آزادی کی یہ نعمت

صدیوں کی جاں گسل قربانیوں اور مشکلات کے نتیجے میں حاصل کی ہے۔ اگر آزادیِ اِظہارِ رائے کو چند اَخلاقی ضابطوں کا پابند بنادیا جائے تو اس سے کوئی انسانی حق مجروح نہیں ہوتا کیوں کہ آزادیِ اظہارِ رائے اگرچہ ہر اِنسان کا بنیادی حق ہے، لیکن یہ حق مطلق و بے مہار نہیں ہو سکتا اور نہ کوئی ایسا دعویٰ کر سکتا ہے۔ حقوق کا معاملہ تقابلی نوعیت کا ہوتا ہے اور ان کے اطلاق کا انحصار دوسروں کے بنیادی حقوق کے حوالے سے ہوتا ہے۔ اس سوچ پر اصرار کرنا کہ آزادی کا یہ تحفہ ایک مطلق حیثیت رکھتا ہے اور اس پر کوئی قدغن نہیں ہونی چاہیے، یہ مسلم دنیا میں قبول نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا حق دوسرے کی بنیادی انسانی حقوق کی نفی کرتا ہو۔ ہر وہ ملک جو اس 'مہذب اور جمہوری' دنیا کا حصہ دار ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، اس نے اِظہارِ رائے کی آزادی کے سلسلے میں اپنی سوسائٹی کے مفادات کے پیش نظر اپنی حدود خود متعین کر رکھی ہیں تاکہ مخصوص معاشرتی انسانی رویوں کو ایک خاص سطح پر اپنے علاقائی رسوم و رواج، اخلاق، مسلمہ معاشرتی اقدار، کلچر اور مذہب کی حفاظت کی بنیاد پر برقرار رکھ سکے۔ اور ایسا ہی کچھ مسلم دنیا میں بھی نظر آتا ہے۔

پاکستان میں عدم برداشت کا کلچر اور سماجی عوامل

جہاں تک پاکستان کی بات ہے تو بلاشبہ جب ہم پاکستان میں چند بڑے مسائل کا ذکر کرتے ہیں تو ان میں سے ایک مسئلہ مذہبی ہم آہنگی کا ہوتا ہے۔ اس قضیے کا ایک دائرہ مذاہب کا ہے، جبکہ دوسرا دائرہ مذہب کے اندر فرقہ وارانہ اختلاف کا ہے۔ بعض ماہرین کے مطابق مذہبی عدم برداشت کا مسئلہ الگ تھلگ نہیں ہے، نہ یہ کہ اس کے محرکات و عوامل صرف دینی نوعیت کے ہیں، بلکہ یہ سماج کا ایک عمومی مزاج ہے جو ایسا تشکیل پا گیا ہے کہ جس میں رواداری اور مکالمہ کی جگہ نہیں رہی۔ اس کے اسباب مختلف نوعیت کے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ عدم برداشت کے رجحانات میں اضافے کی وجہ سے دنیا میں ہمارا تاثر انتہائی منفی بن گیا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارا معاشرہ مزید اس سمت کی جانب گامزن نظر آتا ہے۔ اسے بعض افراد مذہبی انتہا پسندی سے جوڑتے ہیں جبکہ مسئلہ محض مذہبی انتہا پسندی کا نہیں

بلکہ سیاسی، سماجی اور معاشی انتہا پسندی بھی ہے۔ اگر ان تمام پہلوؤں کا جائزہ لیں تو سمجھ میں آتا ہے کہ کس طرح ہمارے لوگوں میں عدم برداشت کا کلچر سرایت کر گیا۔

اس کے اسباب میں اولین سطح پر تعلیم اور تربیت کے مسائل نظر آتے ہیں۔ تعلیم اور تربیت کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ تربیت کے بغیر تعلیم اور تعلیم کے بغیر تربیت کا عمل مکمل نہیں ہوتا مگر بد قسمتی سے ہمارے سرکاری و غیر سرکاری تعلیمی اداروں میں تربیت کا فقدان غالب آرہا ہے جبکہ سوک ایجوکیشن بھی اب تعلیمی نصاب کا حصہ نہیں ہے۔ تربیت کا فقدان ہونے کی وجہ سے لوگوں میں رہن سہن کے آداب نہیں ہیں اور ہر شخص میں غصہ ہے۔ سماجی انصاف نہ ملنے کی وجہ سے بھی لوگوں میں غصہ اور نفرت پیدا ہوتا ہے بلکہ اب لوگ قانون کی حکمرانی تسلیم کرنے کے بجائے اپنے معاملات خود حل کرنا چاہتے ہیں جس کے منفی اثرات سامنے آرہے ہیں۔ ایسے ہی جب مذہبی تنازعات ہوتے ہیں تو ان میں غصہ غالب آتا ہے جس کا نتیجہ سانحات کی شکل میں نکلتا ہے۔

گویا پاکستانی معاشرہ عمومی طور پہ انتہا پسندی، عدم برداشت، غصہ، تعصب اور نفرت کی سیاست سے نمٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیونکہ سماجی، اخلاقی اور سیاسی مسائل اور ان سے جڑی گھٹن نے پورے معاشرے کو ایک عفریت کی صورت میں اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ اس وقت ہمیں ایک ایسے ماحول کی تلاش ہے جہاں باہمی سطح پہ میل جول اور برداشت کا عنصر غالب نظر آئے۔ پر تشدد اور انتہا پسندی پر مبنی واقعات سے ہماری داخلی اور خارجی دونوں سطحوں پر نہ صرف ساکھ متاثر ہوتی ہے بلکہ دنیا ہمیں منفی انداز میں اجاگر کر کے تنقیدی سوالات بھی اٹھاتی ہے۔

یہ وہ صورتحال ہے جس کی طرف ملک کے اہل فکر و دانش اشارہ کرتے رہتے ہیں اور سیاسی و سماجی مقتدرہ کو اس جانب اقدامات کی دعوت دیتے ہیں۔ اپنے مسائل کی نشاندہی سے ہی یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ معاشرہ مزید بہتر ماحول کے لیے سازگار بن سکے۔ دیکھا جائے تو ہمارے معاشرے میں ان مسائل کی قبولیت اور انہیں تسلیم کرنے کا عنصر پہلے سے زیادہ بڑھا ہے، اور وقت کے ساتھ اس

احساس میں تقویت آئی ہے، جو کہ اصلاح کے لیے پہلا زینہ ہے۔ اگر خطے کے پڑوسی ممالک میں اقلیتوں اور مذہبی آزادی کی صورتحال کا جائزہ لیا جائے تو پاکستان کا معاملہ تقابلی تناظر میں قدرے بہتر ہے، خصوصاً بھارت کے حالات یہی بتاتے ہیں۔

عدم برداشت کے خاتمے کے لیے مکالمے اور بات چیت کی روایت کو زندہ کرنا ضروری ہے۔ یہ صرف مذہبی دائرے میں نہیں بلکہ عمومی سماجی تربیت کے تناظر میں ہونا چاہیے۔ مکالمے کی روایت کے فروغ کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے تعلیمی اداروں اور ان سے منسلک شخصیات میں مکالمے کی افادیت و ضرورت کا احساس اجاگر کیا جائے۔ اساتذہ چونکہ سماج کی کردار سازی اور اخلاقیات و اقدار کی اصلاح میں کلیدی کردار کے حامل ہیں، چنانچہ ضروری ہے کہ ان کے اندر یہ احساس جاگزیں ہو کہ تعلیمی اداروں میں تنقیدی صلاحیتوں کی نمو اور منطقی سوچ بچار کی پرورش اور حوصلہ افزائی سے ایک نئے سماج کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے اور طلبہ کی تربیت کے لیے لازمی ہے کہ اساتذہ سکھانے کے عمل کے تمام رموز واو قاف سے آگاہ ہوں اور وہ صحیح نہج پر طلبہ کی تعلیم و تربیت کا فریضہ سرانجام دے سکیں۔

پاکستان میں بہت کم افراد اور ادارے نظامِ تعلیم میں امن، ہم آہنگی اور برداشت کی ثقافت کے فروغ کے لیے اساتذہ کی تربیت اور موثر علمی مباحث پر توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ پاکستانی حکومتیں بھی تعلیمی نظام میں اس طرح کی اصلاحات کے حوالے سے کوئی قدم اٹھانے میں ناکام رہی ہیں۔ اس حوالے سے اٹھائے گئے بیشتر اقدامات نصابی تبدیلیوں یا اصلاحات اور تعلیم، امن اور شعور کے فروغ کے لیے سرگرمیوں کے آغاز اور ان میں طلبہ کی شمولیت پر مرتکز رہے ہیں۔

پاکستان میں مذہبی آزادی سے متعلق قوانین تو موجود ہیں، لیکن چونکہ ہمارے ہاں مذہبی آزادی کو سماجی سطح پر زیر بحث نہیں لایا جاتا اس لیے عدم برداشت اور کشمکش کی کیفیت کو جگہ ملتی ہے اور عام لوگوں کا خیال بن گیا ہے کہ اپنے مذہب یا مسلک کو قبول کرنے کا مطلب یہ بھی ہے کہ

دوسرے کو مسترد کیا جائے۔

سماجی ہم آہنگی اور مذہبی رواداری برصغیر میں ہمیشہ رہی ہے اور ہم یہاں کے مختلف النوع کلچر اور تہذیبی ورثہ پر فخر محسوس کرتے رہے ہیں۔ اگر آج کچھ مسائل نظر آرہے ہیں تو اس کی بہت سی وجوہات ہیں جن میں سے کئی گورننس کے مسائل کے ساتھ جڑی ہیں۔ لہذا پاکستان میں مذہبی عدم برداشت کو ختم کرنے کے لیے کئی حوالوں سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اِس شمارے کی خصوصیت

اِس خصوصی شمارے میں مسئلے کے انہی متنوع پہلوؤں کو زیر بحث لایا گیا ہے اور اس کے تدارک کے لیے ناگزیر اقدامات پر خاطر خواہ کلام کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ شمارہ مذہبی رواداری سے جڑے مسائل پر قارئین کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ زیر نظر شمارہ 'تحقیقات' کا دوسرا سالنامہ ہے۔ گزشتہ برس کا خصوصی شمارہ 'مسلم دنیا اور جمہوریت: تحدیات وامکانات' کے عنوان سے شائع کیا گیا تھا۔ کوشش اور خواہش یہ ہے کہ اس سلسلے کو جاری رکھا جائے گا تاکہ ہر سال کسی ایک اہم موضوع پر وقیع مواد یکجا پیش کیا جاسکے۔

زیر نظر شمارے کو 9 حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن کے عنوانات اس طرح ہیں: 'مذہبی آزادی: اسلامی تناظرات'۔ اس کے تحت مضامین میں مذہبی آزادی کے اسلامی تصور کا خاکہ پیش کیا گیا ہے۔ دوسرا حصہ 'مغرب، بین الاقوامی تنظیمیں اور مذہبی آزادی' کے نام سے ہے جس میں مغربی دنیا اور اقوام متحدہ جیسی انسانی حقوق کی چند عالمی تنظیموں کے ہاں مذہبی آزادی کے مروجہ خدوخال اور حدود وقیود کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرا حصہ 'مشرق وسطی اور مذہبی آزادی' کے عنوان کے تحت ہے جس میں خطے کے پانچ مسلم ممالک کے اندر مذہبی آزادی کی صورتحال کے سیاسی، سماجی اور قانونی ڈھانچے کا خلاصہ دیا گیا ہے۔ چوتھے حصے کا عنوان ہے 'برصغیر میں مذہبی آزادی کی بنیادیں اور

مسائل‘۔اس میں ہندو مسلم تاریخی تعلقات کے ساتھ بھارت اور بنگلہ دیش کی موجودہ صورتحال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔پانچویں حصے بعنوان ’پاکستان میں مذہبی آزادی کا مسئلہ‘ کے تحت ملک کی مذہبی آزادی کے نظریاتی ڈھانچے پر مباحث شامل ہیں جو سیاسی، دینی، قانونی اور معاشرتی مسائل کو واضح کرتی ہیں۔اس سے اگلا حصہ ’اقلیتیں اور توہینِ مذہب کے قوانین‘ کے نام سے ہے، جس میں پاکستان کی اقلیتوں سے جڑے کئی اہم امور پر تفصیل کے ساتھ الگ الگ گفتگو کی گئی ہے۔اس کے بعد ایک حصہ ’مسلکی و فرقہ وارانہ کشمکش‘ کے عنوان سے ہے جس کے اندر شامل مضامین میں فرقہ وارانہ تناؤ کو کم کرنے کے لیے تجاویز دی گئی ہیں۔ شمارے کا آٹھواں حصہ ’مذہبی آزادی اور پر تشدد واقعات: اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات و مباحث‘ کے نام سے ہے جس میں اقلیتوں کو درپیش مسائل کی وجوہات اور پر تشدد واقعات کی روک تھام کے لیے کونسل کے نمائندہ اہل علم کے مضامین اور کونسل کے چند اہم اجلاسوں میں ہونے والے فیصلوں کا خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔جبکہ آخری حصہ ’مذہبی آزادی اور اقلیتوں کے حقوق سے متعلق اہم عدالتی فیصلے‘ کے عنوان سے ہے جس میں سپریم کورٹ کے دو اہم فیصلوں کو شامل کیا گیا ہے۔

اِن تمام حصوں میں اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات و مباحث اور عدالتی فیصلوں کے علاوہ پاکستانی اور غیر ملکی مصنفین کے کل 37 مضامین شامل ہیں۔کوشش کی گئی ہے کہ اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ جہات کا مطالعہ شامل کیا جائے اور یہ کہ تکرار سے اجتناب کیا جائے۔اِس حساس اور اہم موضوع پر اہل علم کی مستند آراء کو یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے،اس خواہش کے ساتھ کہ خود کو غیر جانبدار بھی رکھا جائے۔اپنی سعی اور خواہش کی تکمیل میں ہم کس حد تک کامیاب رہے ہیں اس کا فیصلہ قارئین پر چھوڑا جاتا ہے۔

محمد اسرار مدنی

مذہبی آزادی: اسلامی تناظرات

اسلام میں مذہبی آزادی اور رواداری کا تصور

فتح اللہ گولن

فتح اللہ گولن ترکی سے تعلق رکھنے والے معروف مبلغ اور سیاسی شخصیت ہیں۔اس کے علاوہ 'گولن تحریک' کے بانی بھی ہیں۔ اس وقت خودساختہ جلاوطنی اختیار کیے ہوئے امریکا میں مقیم ہیں۔ ان کی شہرت مکالمہ پر یقین رکھنے والی شخصیت کی ہے۔ انہوں نے ویٹی کن اور کئی یہودی تنظیموں کے ساتھ بین المذاہب مکالمے شروع کیے۔تُرک سیاست، اسلام اور جدید دنیا سے متعلقہ فکری مباحث میں پیش پیش رہتے ہیں۔ زیرنظر مضمون میں انہوں نے اسلام کے تصورِ مذہبی آزادی پر کلام کیا ہے، کہ کس طرح دینی روح میں اجتماعی و انفرادی دونوں سطح پر غیرمسلموں کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے۔اس میں انہوں نے نصوص و فقہی دلائل کی مدد سے عصرحاضر کے تناظر میں رواداری کے مفہوم کی عمدہ وضاحت کی ہے۔یہ مضمون 'فتح اللہ گولن' ویب سائٹ پر شائع ہوا۔

عصر حاضر میں مذاہب کے مابین دوریاں بڑھ رہی ہیں، تہذیبوں کا تصادم ایک ایسا نظریہ ہے جس نے کافی مقبولیت حاصل کی،اس کے علاوہ حالات اس قدر مخدوش ہو رہے ہیں کہ دنیا میں مذاہب کی بنیاد پر جنگوں کی بات بھی ہو رہی ہے۔اس مسئلے کی اصل جڑ دراصل مادیت پسندانہ تصور میں پیوست ہے، جس نے عصری سماجی زندگی میں مذہب کا عمل دخل بری طرح سے محدود کردیا ہے،اوراس کا نتیجہ انسانیت اور فطرت کے مابین توازن کے بگاڑ کی صورت میں نکلا ہے۔

معاشروں میں صرف مختصر طبقہ ایسا ہے جسے اس بات کا احساس ہے کہ سماجی ہم آہنگی، نظام فطرت کے ساتھ موافقت،انسانوں کے مابین امن واتفاق اور فرد کی ذات کے اندر حسن ترتیب، صرف اسی وقت ممکن ہوسکتا ہے جب زندگی کے مادی اور روحانی پہلوؤں میں باہمی مفاہمت اور جوڑ پیدا ہوگا۔ نظام فطرت کے ساتھ موافقت، سماج میں امن وانصاف اور تکمیل ذات صرف اسی وقت ہوسکتا ہے جب بندہ اپنے رب کے ساتھ جڑا ہو۔

مذہب متضاد چیزوں میں مفاہمت کا ذریعہ

مذہب بظاہر متضاد چیزوں مثلاً مذہب اور سائنس، دنیا و آخرت، فطرت اور صحائف آسمانی، مادیت اور روحانیت اور روح و جسم میں ہم آہنگی اور مفاہمت پیدا کرتا ہے۔ مذہب سائنسی مادہ پرستی سے ہونے والے نقصانات کے خلاف ایک مضبوط دفاع کا کام کرتا ہے۔ سائنس کو اس کے درست مقام پر لاتا ہے اور اقوام اور لوگوں کے مابین تصادم کو ختم کرتا ہے۔ فطری سائنس ایک روشن زینے کی بجائے جو کہ رب کائنات سے قربت کا ذریعہ بنتی بے یقینی اور بے اعتقادی کا ایک ایسا ذریعہ بن چکی ہے جس کی ماضی میں مثال نہیں ملتی۔

بین المذاہب مکالمے کا مقصد محض یہ نہیں کہ سائنسی مادہ پرستی کو نیست و نابود کرتے ہوئے اس کا عالمی سطح پر تباہ کن اثر ختم کیا بجائے بلکہ مذہب کی اصل روح اس چیز کی متقاضی ہے کہ مذاہب ایک دوسرے کے لیے وسعت پیدا کریں۔ یہودیت، مسیحیت اور اسلام اسی مقصد کے حصول کیلئے کوشاں ہیں۔ بحیثیت ایک مسلمان ہر فرد تمام انبیاء کرام اور تاریخ میں مختلف قوموں کے لئے بھیجی جانے والی تمام آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتا ہے۔ ایک مسلمان حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت داود، حضرت عیسیٰ اور دیگر تمام انبیاء علیہم السلام کا سچا پیروکار ہوتا ہے۔ کسی ایک بھی نبی یا آسمانی کتاب پر ایمان نہ رکھنے کا مطلب مسلمان نہ ہونا ہے، اس لئے ہم مذاہب کی بنیادی یکجہتی پر یقین رکھتے ہیں جو کہ رب کائنات کی رحمت کا ذریعہ اور مذہب پر ایمان کی آفاقیت کی دلیل ہے۔

مذہب ایمان کا ایک ایسا نظام ہے جو تمام نسلوں اور تمام عقائد کو اپنی آغوش میں لیتا ہے اور ایک ایسی شاہراہ ہے جو کہ ہر فرد کو بھائی چارے کے ہمہ گیر دائرے میں لیتی ہے۔

قطع نظر اس کے ہر مذہب کے پیروکار اپنی روزمرہ زندگی میں کس طرح اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں، مذہب بالعموم پیار محبت، باہمی احترام، رواداری، عفو و در گزر، خداترسی، انسانی حقوق کی پاسداری، امن آشتی، بھائی چارے اور آزادی جیسی اقدار کو اولیت دیتا ہے۔ ان میں سے اکثر اقدار کو حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ السلام، اور حضرت محمد ﷺ کے پیغام میں نمایاں حیثیت

حاصل تھی اور اس کے ساتھ ساتھ بدھا، زردشت، لاؤزو، کنفیوشس اور ہندو سکالرز کے پیغام میں بھی۔

اسلام عقیدے کی آزادی کو ترجیح دیتا ہے

اسلام میں "عقیدہ کی آزادی" کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو کسی اعتقاد کے اپنانے پر مجبور نہیں کیا جانا چاہیئے۔ اور کسی اعتقاد کی وجہ سے اسے نقصان نہیں پہنچایا جانا چاہیئے جس پر وہ یقین رکھتا ہے۔ اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

"لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَن يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِن بِاللَّهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انفِصَامَ لَهَا وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ"۔[1]

(دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت کا راستہ گمراہی سے ممتاز ہو کر واضح ہو چکا۔ اس کے بعد جو شخص طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آئے گا، اس نے ایک مضبوط رسی کو تھام لیا جس کے ٹوٹنے کا کوئی امکان نہیں۔ اور اللہ خوب سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔)

عقیدہ کی آزادی اہم ترین انسانی حقوق میں سے ایک ہے جس کا اسلام نے اقرار کیا ہے، اور قرآن کریم کی بہت سی اور مختلف نصوص کسی شخص کے اس عقیدے کو قبول کرنے کے حق کی تصدیق کرتی ہیں جس میں اس کا دل مطمئن ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایمان اور کفر کے درمیان بھی انتخاب کرنے کی آزادی دے رکھی ہے:

"فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ"[2] (اب جو چاہے، ایمان لے آئے، اور جو چاہے کفر اِختیار کرے۔)

اور خدا تعالی اپنے رسول ﷺ کو بھی یہی ہدایت دیتے ہیں کہ جب حق اور بھلائی کا راستہ واضح ہو جائے تو عقیدہ کا انتخاب کرنے کی آزادی کو اس شخص پر چھوڑ دیا جائے۔ فرماتے ہیں:

---

[1] البقرہ:256

[2] الکہف:29

"أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ"[3] (پھر کیاتم لوگوں پر زبردستی کروگے تاکہ وہ سب مومن بن جائیں۔)

اسلام آزادی اعتقاد کو انسانی عقل وضمیر کے لئے احترام کے اعلی درجے اور قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے، اللہ تعالی نے انسان کو ایک ایسی عقل سے نوازا ہے جو حق اور باطل کے مابین فرق کرنے کے قابل ہے اور اسے خدا کو قبول کرنے یا اس کی نافرمانی کرنے، اور ایمان اور کفر کے درمیان بھی انتخاب کرنے کی آزادی عطا کرتی ہے، آزادی غلامی کے برعکس ہے، کیونکہ انسان ہمیشہ انتخاب کی حیثیت میں رہتا ہے۔ لہذا وہ اپنے کاموں کا خود ذمہ دار ہے، اور اس پر مرتب ہونے والے نتائج کا بھی وہ خود ذمہ دار ہے:

"مَّنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهِ وَمَنْ أَسَاءَ فَعَلَيْهَا"[4] (جو کوئی نیک عمل کرتا ہے، وہ اپنے ہی فائدے کیلئے کرتا ہے، اور جو کوئی بُرائی کرتا ہے، وہ اپنے ہی نقصان کیلئے کرتا ہے)

اسلام میں مذہبی آزادی کی توثیق کا مطلب مذہبی تعدد کو تسلیم کرنا ہے۔

فکری آزادی

اسلام فکر و یقین کی آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔ بلکہ اللہ تعالی نے اسے مومنوں پر ایک تکلیفی حکم کے طور پر فرض فرمایا ہے، اس نے سب سے پہلے اپنے پیارے پیغمبر ﷺ کو انسانیت کے بارے میں اس نئے اصول کی تعلیم دینا شروع کی تاکہ اس کا ایمان پر قائم رہنے کا حرص اسے لوگوں کو زبردستی پکڑ کر انھیں اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کرے، جسے اسلام کلی طور پر مسترد کرتا ہے، لہذا رضامندی کے بغیر زور زبردستی کے ساتھ اسلام قبول کرنے کو اسلام منافقت تصور کرتا ہے، اور اسلام میں منافقت کو سراسر کفر سمجھا جاتا ہے، اور اسی وجہ سے اسلام کی دعوت رضامندی اور

---

[3] یونس: 99

[4] فصلت 46

خوشنودی پر مبنی ہے۔

بے شک اسلامی مؤقف واضح اور مضبوط ہے جو ہر انسان کو آزادی دیتا ہے کہ وہ جو چاہے عقائد اپنائے، اور اپنے لئے جو افکار چاہے اختیار کرے حتی کہ اگر اس کے عقائد ملحدانہ ہیں تب بھی کوئی شخص اسے نہیں روک سکتا جب تک اس کے یہ افکار و خیالات اس کی اپنی ذات کی حد تک ہوں اور وہ ان سے کسی کو تکلیف نہ پہنچائے۔ لیکن اگر وہ ایسے خیالات کو پھیلانے کی کوشش کرتا ہے جو لوگوں کے اعتقادات کے منافی اور ان کی ایسی اقدار سے متصادم ہوں جنہیں وہ عزیز رکھتے ہیں تب وہ لوگوں کے دلوں میں شک کا فتنہ پیدا کر کے ملک کی عمومی نظم و ضبط پر حملہ آور ہوتا ہے۔

اور جو بھی شخص کسی بھی قوم میں ریاست کے عمومی نظم و ضبط پہ حملہ کرتا ہے تو اسے سزا دی جائے گی جو بیشتر ممالک میں قتل ہے۔ چنانچہ اسلامی قوانین میں مرتد کی سزا اس لئے نہیں کہ وہ مرتد ہوا ہے بلکہ اس لئے ہے کہ اس نے اسلامی ریاست میں عمومی نظم و ضبط (قوانین) کو توڑتے ہوئے فتنہ و انتشار برپا کیا ہے۔ لیکن اگر وہ لوگوں کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا کئے اور پھیلائے بنا خود ذاتی طور پر مرتد ہو جائے تو کوئی بھی شخص اس کے ساتھ برا نہیں کر سکتا، صرف اللہ تعالی ہی ہے جو دلوں کے بھید جانتا ہے۔

تشدد اور جبر کی نفی

اسلام متشدد گروہوں کو مسترد کرتا ہے جو لوگوں کو اسلام لانے پہ زبردستی مجبور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اسلام نے اپنے کسی مبلغ کو یہ حق نہیں دیا کہ وہ لوگوں کو فرض کی ادائیگی پر مجبور کرے اور نہ ہی دینی فرائض میں کوتاہی پہ کسی شخص کو سزا دینے کا حق ہے۔ لہذا کچھ افراد جو دینی امور میں کوتاہی کرتے ہیں انہیں بعض مذہبی لوگ شرعی قواعد و ضوابط کے مطابق نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے دائرے سے ہی خارج کر دیتے ہیں۔

چنانچہ اس قسم کے لوگوں کو چاہیے کہ وہ جان لیں کہ اللہ کے حضور سب لوگ برابر ہیں اور تقوی اور عمل صالح کے سوا کسی ایک کو دوسرے پر کوئی فوقیت نہیں ہے، مذہب ایک داخلی یقین ہے

جو بیرونی دباؤ یا جبر سے مطابقت نہیں رکھتا۔ مذہب میں جبر اور زبردستی سے "مومن" نہیں بلکہ "منافق" پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو منافقوں کے نفاق کی ضرورت نہیں، چنانچہ اسلام نے آزادیٔ عقائد کے اصول میں تاکید کی خاطر اسے قرآنی نصوص میں بیان فرمایا کہ لوگوں کے عقائد پر کسی انسان کو اختیار نہیں دیا گیا ہے حتی کہ رسول اللہ ﷺ کو بھی لوگوں کے عقائد کے بارے میں اختیار نہیں ہے۔

اس بارے میں قرآن کریم میں ارشاد ہوا:

"ما عَلَى الرَّسُولِ إِلَّا الْبَلَاغُ"[5] (رسول پر سوائے تبلیغ کرنے کے کوئی اور ذمہ داری نہیں ہے۔)

پھر ایک اور جگہ فرمایا:

" لسْتَ عَلَيْهِم بِمُصَيْطِرٍ "[6] (آپ کو ان پر زبردستی کرنے کے لئے مسلط نہیں کیا گیا۔)

اللہ رب العزت نے اپنے نبی رسول ﷺ کو تمام لوگوں کے لئے بطور رہنما بنا کر بھیجا ہے اور ان پر قرآن کریم نازل کیا ہے جو ہر طرح کی رواداری اور ہمدردی کا مظاہرہ کرتا ہے اور ہر طرح کی مذہبی جنونیت اور انتہا پسندی کو رد کرتا ہے۔ اسلام اعتدال پسندی کا مذہب ہے، جس کی تعلیمات مذہب اور اعتقاد کے معاملات میں ہر طرح کے غلو اور انتہا پسندی کی مخالفت کرنے میں واضح ہیں، اور قرآن پاک نے اس آزادی کے تعین میں اعلی معیار کا مظاہرہ کیا ہے، اور مسلمانوں پر یہ عائد کیا گیا ہے کہ وہ اپنے مخالفین کے اعتقادات کا احترام کریں۔ بلکہ اس نے مسلمانوں کو سابقہ تمام آسمانی ادیان پر ایمان رکھنے کا پابند بنایا ہے، اور اسے مسلمان کے اعتقاد کا لازمی جزو بنادیا۔

اسلام کی رُو سے ایمان اور کفر کا معاملہ اللہ تعالیٰ اور اس کے بندہ کے درمیان ہوتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے ہمیں اس بات کی تعلیم دی ہے کہ ہمیں کسی انسان کے ظاہر پر حکم جاری کرنا نہیں

---

[5] المائدہ:99

[6] الغاشیہ:22

چاہیے کیونکہ صرف اور صرف اللہ ہی دلوں کی باتوں کو جانتا ہے - ظاہر ہمارا ہے اور باطن اللہ تعالی کا، اسی لئے اپنے بندوں کا حساب کتاب کرنے کا حق صرف اسے حاصل ہے۔

دیگر تہذیبوں و ثقافتوں کے ساتھ پرامن بقائے باہمی

اسلام میں مذہبی بقائے باہمی کا مطلب دوسری مختلف ثقافتوں اور تہذیبوں کے ساتھ پُرامن بقائے باہمی ہے، اور اسکا مقصد ہمیشہ انسان کی فلاح و بہبود ہی رہا ہے، دوسرے مذاہب کے ساتھ اسلام کی بقائے باہمی کی کئی دلیلیں قرآن مجید میں صاف واضح ہیں، فرمان الہی ہے:

(کہہ دو کہ اے اہل کتاب جو بات ہمارے اور تمہارے دونوں کے درمیان یکساں (تسلیم کی گئی) ہے اس کی طرف آؤ، وہ یہ کہ خدا کے سوا ہم کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا کارساز نہ سمجھے، اگر یہ لوگ اس بات کو نہ مانیں تو ان سے کہہ دو کہ تم گواہ رہو کہ ہم خدا کے فرماں بردار ہیں)۔[7]

رسول پاک محمد ﷺ پر ایمان نہ لانے کے باوجود، اسلام یہودیوں اور مسیحیوں کو اہل کتاب سمجھتا ہے، کیونکہ اسلام رنگ، نسل، جنس یا مذہب کے اختلاف کو "خلاف" نہیں گردانتا، پس عقیدہ کے اختلاف کے باوجود اسلام کے رحمت، رواداری اور امن و سلامتی پر مبنی اصلاحی پہلوؤں نے اس اختلاف کو اپنی کامل اور جامع تعلیمات کے اندر خوبصورتی سے سمولیا ہے، یہاں تک کہ اسلام نے حضرت موسی علیہ السلام اور حضرت عیسی علیہ السلام پر ایمان (یعنی ان کو نبی سمجھنا) ایمان کی درستگی کی دلیل مانا ہے۔

دوسرے مذاہب کے ساتھ پُرامن بقائے باہمی کا اہم ترین ثبوت یہ بھی ہے کہ دینِ اسلام نے مسلمان مرد کا یہودی یا عیسائی عورت سے نکاح جائز قرار دیا ہے۔ اللہ تعالی کا فرمان ہے:

(آج تمہارے لیے پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں، اور ان لوگوں کا ذبیحہ بھی جنہیں الہامی

---

[7] آل عمران: 64

کتاب دی گئی تمہارے لیے حلال ہے اور تمہارا ذبیحہ ان کے لیے حلال ہے، اور اسی طرح پاک دامن مسلمان عورتیں اور ان لوگوں میں سے پاکدامن عورتیں جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی تمہارے لیے حلال ہیں جب کہ تم انہیں ان کے مہر ادا کر دو، مگر شرط یہ کہ تم انہیں قیدِ نکاح میں لانے والے عفت شعار بنو، نہ کہ محض ہوس رانی کی خاطر اعلانیہ بدکاری کرنے والے اور نہ خفیہ آشنائی کرنے والے، اور جو شخص احکامِ الٰہی پر ایمان لانے سے انکار کرے اس کا سارا عمل برباد ہو گیا اور وہ آخرت میں بھی نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گا۔)[8]

مذہبی اختلاف کی بنا پر کسی غیر مسلم کی جان و مال کو تلف کرنا حرام ہے

دین و مذہب کا اختلاف قطعی طور پر کسی کو قتل کرنے اور مال لوٹنے کا سبب نہیں بن سکتا۔ کسی انسان پر ظلم و زیادتی کرنا خواہ اس کا تعلق کسی مذہب سے ہو اور وہ ظلم و زیادتی خواہ قتل کی شکل میں ہو، ایذار سانی یا اس کے اوپر جھوٹے الزام اور تہمت کی شکل میں، سب حرام ہے۔ ایسی ہر قسم کی زیادتی کا قصاص یعنی بدلہ واجب ہو گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی"۔[9] (اے ایمان والو! تم پر ان کے خون کا بدلہ (قصاص) فرض کیا گیا ہے جو ناحق قتل کیے جائیں۔)

یہاں قَتْلٰی کا لفظ عام ہے جو مسلمان اور غیر مسلم دونوں کو شامل ہے اور قصاص میں بھی یہی حکم ہے جیسے جان کا بدلہ جان؛ یہ مسلم اور غیر مسلم ہر کسی کی جان ہو سکتی ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وَكَتَبْنَا عَلَیْهِمْ فِیْهَاۤ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَیْنَ بِالْعَیْنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ"[10]

---

[8] المائدہ:5

[9] البقرہ:178

[10] المائدہ،45

(اور ہم نے اس (تورات) میں ان پر فرض کر دیا تھا کہ جان کے بدلے جان اور آنکھ کے عوض آنکھ اور ناک کے بدلے ناک اور کان کے عوض کان اور دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں (بھی) بدلہ ہے۔)

اسی طرح اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم شہری کا مال چرائے تو اس پر حد جاری کی جائے گی۔ علامہ ابن رشد کہتے ہیں کہ اس معاملے میں مسلمانوں کا اجماع ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم شہری کا مال چرائے تو اس پر حد جاری کی جائے گی۔[11]

لہٰذا یہ امر متحقق ہو جاتا ہے کہ مذاہب کا اختلاف جان و مال کو دوسروں کے لیے حلال نہیں کرتا۔

غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کا تحفظ

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کو برقرار رکھا۔ علامہ ابن قیم ''احکام اہل الذمۃ'' میں فتح خیبر کے موقع پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول مبارک نقل کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح خیبر کے بعد وہاں کے غیر مسلموں کو ان کی عبادت گاہوں پر برقرار رکھا اور ان کی عبادت گاہوں کو مسمار نہیں فرمایا۔ بعد ازاں جب دیگر علاقے سلطنت اسلامی میں شامل ہوئے تو خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اِتباعِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کرتے ہوئے ان ملکوں میں موجود غیر مسلموں کی کسی عبادت گاہ کو مسمار نہیں کیا۔[12]

قرآن و حدیث کی رُو سے اسلامی ریاست پر لازم ہے کہ وہ تمام مذاہب کے مذہبی مقامات اور عبادت گاہوں کی حرمت کا خیال رکھے اور انہیں تحفظ فراہم کرے۔ قرآن مجید میں سورۃ الحج میں

---

[11] ابن رشد، بدایۃ المجتہد، 2/229

[12] ابن قیم، اَحکام اَہل الذمہ، 3/1199

ارشاد گرامی ہے:

"وَلَوْ لَا دَفْعُ اللهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللهِ كَثِيْرًا"[13]

(اور اگر اللہ انسانی طبقات میں سے بعض کو بعض کے ذریعے ہٹاتا نہ رہتا تو خانقاہیں اور گرجے اور کلیسے اور مسجدیں (یعنی تمام ادیان کے مذہبی مراکز اور عبادت گاہیں) مسمار اور ویران کر دی جاتیں جن میں کثرت سے اللہ کے نام کا ذکر کیا جاتا ہے۔)

امام ابو بکر الجصاص "احکام القرآن" میں درج بالا آیت کی تفسیر میں امام حسن بصری کا قول نقل کرتے ہیں:

"يَدْفَعُ عَنْ هَدْمِ مُصَلَّيَاتِ أَهْلِ الذِّمَّةِ بِالْمُؤْمِنِيْنَ"۔[14] (اللہ تعالیٰ مومنین کے ذریعے غیر مسلم شہریوں کے کلیساؤں کا انہدام روکتا ہے (یعنی مسلمانوں کے ذریعے ان کی حفاظت فرماتا ہے۔)

اسی آیت کی تشریح میں امام ابو بکر الجصاص مزید فرماتے ہیں:

"فِي الْآيَةِ دَلِيْلٌ عَلَى أَنَّ هَذِهِ الْمَوَاضِعَ الْمَذْكُوْرَةَ لَا يَجُوْزُ أَنْ تُهْدَمَ عَلَى مَنْ كَانَ لَهُ ذِمَّةٌ أَوْ عَهْدٌ مِنَ الْكُفَّارِ۔"[15]

(اور آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ مذکورہ جگہوں (یعنی عبادت گاہوں) کا گرانا جائز نہیں اگرچہ وہ غیر مسلم شہریوں کی ہی ہوں۔)

اسی آیت کریمہ کی تشریح میں اخفش بیان کرتے ہیں کہ غیر مسلم شہریوں کی عبادت گاہیں ہر گز گرائی نہیں جائیں گی یعنی اسلامی ریاست کا فریضہ ہے کہ انہیں کامل تحفظ فراہم کرے۔ ہر قوم اپنی اقدار کا تحفظ کرتی ہے، اپنی روایات اور ثقافت کو فروغ دینا اس کا جمہوری حق ہے۔ چنانچہ مذہبی

---

[13] الحج، 40

[14] جصاص، أحکام القرآن، 5/83

[15] جصاص، أحکام القرآن، 5/83

اختلافات کے باوجود مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ غیر مسلموں کی عبادت گاہوں کا تحفظ کریں۔

علامہ ابن قیم ''احکام اہل الذمۃ'' میں لکھتے ہیں:

يَدْفَعُ عَنْ مَوَاضِعِ مُتَعَبَّدَاتِهِمْ بِالْمُسْلِمِيْنَ.... كَمَا يُحِبُّ الدَّفْعَ عَنْ أَرْبَابِهَا وَإِنْ كَانَ يُبْغِضُهُمْ، وَهَذَا الْقَوْلُ هُوَ الرَّاجِحُ، وَهُوَ مَذْهَبُ ابْنَ عَبَّاسٍ۔[16]

(اللہ تعالی مسلمانوں کے ذریعے ان کی عبادت گاہوں کا دفاع فرماتا ہے۔ جیسا کہ وہ ان کے معبودوں کا دفاع کرتا ہے مخالف اور ناپسندیدہ عقیدہ ہونے کے باوجود۔ یہی قول راجح ہے اور یہی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا موقف بھی ہے۔)

اسلام اپنی روح میں الگ تھلگ دین نہیں ہے، بلکہ دیگر تہذیبوں، ادیان اور ثقافتوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور یہی تعلیم وہ اپنے ماننے والوں کو بھی دیتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی بھی مسلمان آج یہ سمجھتا ہے کہ تصادم سے حق کو فروغ ملتا ہے تو وہ غلط فہمی کا شکار ہے۔ بطور ایک شہری کے ریاست کے اندر تمام انسان مساوی حقوق رکھتے ہیں۔

[16] ابن قیم، اَحکام اہل الذمہ، 3/1169

اسلام کے ثقافتی اور جغرافیائی مظاہر کی وسعت: رواداری کے عملی نمونے

ڈاکٹر سید حسین نصر

ڈاکٹر سید حسن نصر ایرانی نژاد مفکر اور اسلامی علوم کے ماہر ہیں۔ عرصے سے امریکا میں مقیم اور جارج واشنگٹن یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔انہوں نے ادیان، تصوف اور سیاسیات پر خاطر خواہ کام کیا ہے جسے نہایت قدردانی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔اس مضمون میں انہوں نے روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح دنیا کے مختلف علاقوں میں اسلامی ثقافت و تہذیب کی الگ الگ مثالیں ملتی ہیں جومقامی رنگوں میں گندھی ہوئی ہیں اور یہ اس بات کی عکاسی کرتی ہیں کہ اسلام کا زاویۂ نظر تنگ اور سخت گیر نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر یہ صلاحیت ہے کہ وہ حالات اور مقام کے اعتبار سے اپنے آپ میں لچک پیدا کرسکے۔ ڈاکٹر حسین نے تاریخی حوالوں کی مدد سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام اور اسلامی اقدار نے اپنے لیے سماجی و ثقافتی سطح پر کوئی ایک ڈھانچہ وضع نہیں کیا، بلکہ یہ جہاں بھی پہنچے ایک الگ ثقافت کی نظیر پیش کی۔یہ مضمون ان کی کتاب 'اسلام کی ازلی اقدار' سے لیا گیا ہے۔

عام طور پر لوگوں کے درمیان ہونے والی مذہبی مباحث کو دیکھا جائے تو لوگ اسلامی تمدن کی تقسیم کرتے ہوئے عربی اسلام، ایرانی اسلام اور ترک اسلام کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ان کے نزدیک گویا اسلام کی تین اقسام ہیں، حالانکہ اسلام حقیقت میں ایک سے زیادہ نہیں ہے۔البتہ قومی، لسانی اور ثقافتی اعتبار سے مختلف اقوام جن میں سے ہر کوئی امت مسلمہ کا ایک حصہ ہے، اپنے اپنے مقامی تشخص کی حامل ہیں۔اسلام جہاں بھی پہنچا اس نے وہاں کے موجودہ ثقافتی تشخص کو جڑ سے نہیں اکھاڑا بلکہ اس کی حفاظت اور اصلاح کی کوشش کی، تاکہ وہ اس کی روح اور وحی الٰہی کے ظاہری احکام کے ساتھ سازگار ہو جائیں۔اسی وجہ سے دارالاسلام کی وسیع سلطنت نے ثقافتی مظاہر کو بالکلیہ مٹانے کی بجائے ان میں پائے جانے والے ثقافتی نمونوں کو مجاز حد تک اپنے اندر جذب کیا اور ان میں کچھ اضافے کیے تاکہ ایک بہترین شکل مرتب ہو کر سامنے آسکے۔ ذیل میں انہی مختلف ثقافتی نمونوں کا تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

عرب دُنیا

اسلامی دنیا میں پہلا ثقافتی خطہ، دنیائے عرب ہے جو عراق اور خلیج فارس سے ماریطانیہ تک اور ۱۴۹۲ء سے پہلے جزیرہ ایبری کے جنوبی حصے تک کے علاقے پر مشتمل تھا۔ ظاہر ہے کہ بہت سے مغربی مؤرخین کے خیال کے برعکس دنیائے عرب اصلاً دنیائے اسلام کے مترادف نہیں۔ اصل میں عرب مسلمان جن کی تعداد تقریباً ۲۲ کروڑ ہے وہ سارے مسلمانوں کی تعداد کے پانچویں حصے سے بھی کم ہیں، لیکن چونکہ پیغمبر اسلام ﷺ عرب تھے اور پہلا اسلامی معاشرہ عرب سرزمین پہ ہی میں وجود میں آیا، اس لیے عرب خطہ دارالاسلام ہونے کے ناطے سے امت اسلامی کا سب سے قدیم حصہ قرار پایا اور اسی لیے یہ مرکزیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ کی سب سے بڑی تعجب خیز باتوں میں سے ایک یہ ہے کہ جب عرب سپاہیوں نے عرب سرزمین سے باہر قدم رکھا تو وہ سب سرزمینیں، جو شمال اور مغرب کی جانب ان کے تصرف میں آئیں، انہوں نے اسلامی اور عربی دونوں اثرات اپنائے۔ لفظ عرب جب ''دنیائے عرب'' جیسی تراکیب میں استعمال ہوتا ہے تو وہ عربی زبان پر دلالت کرتا ہے لیکن عرب قوم پر نہیں۔ اگرچہ عربوں کی اکثریت دنیائے عرب میں آباد ہے لیکن ہمارے خطے کی ''دنیائے عرب'' کے نام سے شہرت کی اصلی وجہ وہاں عربی زبان کا چلن ہے، جو مراکش سے عراق تک سارے علاقے میں رائج ہے، حتیٰ کہ مصر جیسا ملک بھی اپنے بے مثال قدیم ماضی کے باوجود عربی زبان کی طرف مائل ہوا اور سچی بات یہ ہے کہ آج تک عربی ثقافت کی مرکزیت کا اختصاص مصر ہی کو حاصل ہے۔ اس کے برعکس اہلِ ایران جنہوں نے ساسانی شہنشاہیت کے زمانے یعنی ساتویں صدی عیسوی میں عربوں سے شکست کھائی اور اسلام قبول کرلیا، انہوں نے نہ صرف فارسی زبان کی اسی طرح حفاظت کی، بلکہ ایران کی قدیم زبانوں کی مدد سے فارسی زبان کو مکمل کیا اور اپنے ممتاز ثقافتی خطے کو دوام بخشا۔ ساسانی شہنشاہیت میں اگر کوئی استثنا تھا تو وہ عراق تھا، جہاں ساسانی پایۂ تخت واقع تھا۔ اس نے نہ صرف عربی زبان کو قبول کیا بلکہ بعد میں عباسی خلافت کا مرکز بھی بن گیا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہاں بھی طاقتور ایرانی عوامل کا اثر و نفوذ بدستور برقرار رہا۔

یہ بات قابل توجہ ہے کہ ہم اسلام کے پھیلاؤ کا مسیحیت کے یورپ میں پھیلاؤ کے ساتھ

موازنہ کریں۔ یورپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو قبول کر کے ''جہانِ ابراہیمی'' کا حصہ بن گیا، لیکن اس کے برعکس غیر عرب مسلمانوں نے اسلام تو قبول کیا، لیکن سامی اثرات کو بہت کم قبول کیا، جس کی وجہ یہ تھی کہ خود مسیحی مذہب پولس قدیس کے ہاتھوں یورپ پہنچنے سے پہلے اپنی سامی اثرات کو کھو چکا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یورپ مسیحی ہو گیا لیکن آرامی زبان کا رواج دوسری سامی زبانوں کے ہمراہ اس براعظم میں نہ ہو سکا، جبکہ عربی زبان مشرق قریب اور افریقہ تک میں بلکہ ایرانیوں اور ہندوستان کے درمیان بھی پھیل گئی جو زبان اور نسل کے اعتبار سے یورپی خاندان سے تھے۔ انجیل نہ یونانی زبان میں لکھی گئی اور نہ آرامی زبان میں کہ جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام گفتگو کرتے تھے، بلکہ سب سے پہلے اور عام تحریر کے حوالے سے لاطینی زبان میں منتقل ہوئی اور اس طرح زبان کے لحاظ سے اپنی اصل سے دور ہو گئی۔ لاطینی زبان مغرب میں دین اور تعلیم کی زبان کی حیثیت سے اسی مقام کی حامل ہے، جو عربی زبان کو دنیائے اسلام میں اس اعتبار سے حاصل ہے یا عبرانی زبان کو یہودیوں کے مذہب میں حاصل ہے۔ یہ وہ صورتحال ہے کہ لاطینی زبان مسیحی مذہب کی حمد کی زبان ہے اور اس لحاظ سے حمد کی دوسری زبانوں مثلاً یونانی اسلاوی وغیرہ سے فرق نہیں رکھتی۔ اس وجہ سے آج کی عرب دنیا کا عربی ہونا اور عربی زبان کی غیر عرب مسلمانوں میں اہمیت کو یورپ کے مسیحی ہونے اور قرونِ وسطیٰ کے دوران مغرب میں لاطینی زبان کے کردار کو یکساں قرار نہیں دیا جا سکتا، ہر چند کہ ان دونوں دنیاؤں کے درمیان متعدد مشابہتیں موجود ہیں۔

عرب خطہ جس کی خصوصیت عربی زبان سے ہے وہ نہ صرف دین کی زبان کی وجہ سے سب مسلمانوں کے درمیان رائج ہے بلکہ اس کا عمل دخل روزمرہ کی زندگی میں بھی ہے اور یہ پھر مشرقی اور جنوبی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور اس کی سرحد لیبیا کے درمیان سے گزرتی ہے۔ عرب سرزمین جو قدیم عربی میں ''المغرب'' کے نام سے مشہور تھی، اب بھی ''مغرب قریب'' کے نام سے مشہور ہے اور ان میں مغربی لیبیا، تیونس اور الجزائر کا بہت سا حصہ شامل ہے۔ دوسرا ''مغربِ بعید'' ہے۔ جس میں مغربی الجزائر، مراکش اور ماریطانیہ شامل ہیں۔ تاریخِ اسلام کے آغاز ہی سے اندلس جزیرہ ایبری کے مسلمانوں کے علاقے کے حصے کے طور پر تقسیم ہو گیا تھا۔ البتہ مغربی حصے میں

غیر عرب اہم گروہ رہتے ہیں جن میں سب سے نمایاں گروہ بربروں کا ہے جو زیادہ تر اطلس کے کوہستانوں میں رہتے ہیں اور ان کی اپنی مخصوص زبان ہے۔

ایران

اسلامی ثقافت کا دوسرا خطہ جہاں کے لوگوں نے عربوں کے بعد دینِ اسلام کو قبول کیا اور پھر ان کے ساتھ مل کر اسلامی تمدن کے پھیلاؤ کے سلسلے میں کوششیں کیں 'ایران تھا جو موجودہ ایران، افغانستان و تاجکستان (ازبکستان کے کچھ شہروں سمیت) پر مشتمل تھا۔ ان ملکوں کی زیادہ تر زبان فارسی تھی جو تین مختلف مقامی ناموں فارسی، دری اور تاجک سے موسوم تھی اور ان تینوں کے درمیان اختلافات کی نوعیت وہی تھی جو آج ہم آسٹریلیا، انگلستان اور ٹیکساس کی انگریزی میں دیکھتے ہیں۔ اسی طرح مشرقی قفقاز، خراسان قدیم، ماوراء النہر اور آج کے پاکستان کے کچھ حصے جہاں بعد میں متعدد قومی جغرافیائی اور سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں، بھی اس خطے میں شامل تھے۔ ان علاقوں کے بھی اکثر باشندے ایرانی نسل ہی سے تعلق رکھتے تھے جو آریانی یا ہند آریانی یا یورپین نام سے مشہور ہیں۔ فارسی زبان بھی اس خطے میں رائج دوسری ایرانی زبانوں مثلاً کردی، بلوچی، پشتو کی طرح ہندی اور یورپی زبانوں ہی کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ اس خطے کی آبادی تقریباً سو ملین افراد پر مشتمل ہے لیکن اس کے اثرات اپنی سرحدوں سے باہر اور ایشیا کے اسلامی ثقافت کے دوسرے خطوں میں ترکوں اور ہندوستانیوں سے لے کر چینیوں تک مکمل طور پر واضح ہیں۔

حضرت سلمان فارسیؓ پہلے ایرانی تھے جنھوں نے اسلام قبول کیا۔ وہ غلام تھے جنہیں رسول اکرم ﷺ نے آزاد کیا اور انہیں اپنے اہل بیت کے زمرے میں شمار کیا۔ ایرانی ابتدا ہی سے پیغمبر اکرم ﷺ کے اہل بیت اور آل اطہار کے لیے، جن میں سے امام ہشتم علی ابن موسیٰ الرضاؑ بھی شامل ہیں اور جن کا روضہ ایران میں ہے خصوصی احترام کے قائل تھے۔ البتہ اگر کوئی یہ سمجھے کہ ایرانی ہمیشہ شیعہ اور عرب ہمیشہ سنی تھے تو یہ درست نہیں ہوگا۔ اہل تشیع عربوں ہی میں سے اٹھے اور دسویں صدی عیسوی میں اکثر مشرقی عرب علاقے شیعہ ہو گئے۔

خراسان جو کہ ایران کا ایک بڑا صوبہ تھا، اہل سنت کا فکری مرکز سمجھا جاتا تھا۔ شیعہ مذہب نے ایران میں صفوی بادشاہوں کے زمانے میں غلبہ حاصل کیا اور شیعہ آبادی اس وقت بڑھی جب افغانستان جو بلوچستان کا کچھ حصہ تھا، ایران سے جدا ہو گیا اور ایران موجودہ شکل میں سامنے آیا۔

افغانستان آٹھویں صدی عیسوی سے صفوی دور کے طولانی زمانے میں ایران کا حصہ تھا اور اس کے بعد یہ ہوا کہ افغان قبائل کے رہنماؤں نے صفویوں پر غلبہ پایا اور آخری صفوی بادشاہ کو قتل کر دیا۔ تھوڑے عرصے بعد مشرق کے آخری فاتح بادشاہ نادر شاہ نے دہلی تک ساری سرزمینوں کو فتح کر لیا لیکن نادر شاہ کی وفات کے بعد افغانستان آزاد ہو گیا اور آخر کار انگریزوں کے دباؤ کے تحت انیسویں عیسوی میں ایران، ہرات اور مغربی افغانستان پر اپنے قبضے سے دستبردار ہو گیا اور یوں آج کا افغانستان وجود میں آ گیا۔

افریقہ

اسلامی ثقافت کا تیسرا خطہ براعظم افریقہ ہے۔ رسول اکرم ﷺ کے غلاموں میں سے حضرت سلمان فارسیؓ کے علاوہ صحابہؓ میں سے ایک اور معروف غیر عرب افریقہ کے سیاہ فام حضرت بلال حبشیؓ تھے جو آپؐ کے موذن تھے۔ حضرت بلالؓ کا وجود سیاہ فاموں کے درمیان اسلام کے سریع پھیلاؤ اور اسلامی ثقافت کے افریقہ کے علاقے میں تعارف کا سبب بنا، اور ایتھوپیا کے علاقے سے ہوتا ہوا مالی اور سینیگال تک پھیل گیا۔ کہتے ہیں کہ حضرت بلالؓ کی اولاد مالی کے علاقے میں ہجرت کر گئی اور رسول اکرم ﷺ کی وفات کے بعد وہاں اسلام پھیلانے میں مصروف ہو گئی۔ رسول اکرم ﷺ کے کچھ صحابہؓ چاڈ کے علاقے کو بھی ہجرت کر گئے۔ عام طور پر افریقہ میں اسلام تاجروں کے ذریعہ یہاں تک کہ دسویں صدی میں گھانا میں ایک طاقتور اسلامی حکومت قائم ہو گئی اور چودھویں صدی عیسوی تک مالی میں مسلمان حکومت دنیائے اسلام کی سب سے امیر شہنشاہیت تصور کی جاتی رہی، جہاں کا سب سے معروف حاکم منہ موسیٰ تھا جو اسلامی دنیا کے قابل ترین حکمرانوں میں سے ایک تھا۔

مشرقی افریقہ میں اسلام مغربی افریقہ سے پہلے پہنچا اور اس کا راستہ مغربی افریقہ سے مختلف تھا۔ عرب اور ایرانی مہاجروں نے مغربی افریقہ کے ساحلوں پر گہرا اثر ڈالا۔ بارھویں صدی میں افریقا میں سواحلی بادشاہت وجود میں آئی اور عربی، فارسی اور بانتو زبانوں کی آمیزش سے ایک جدید زبان سواحلی کے نام سے ابھری جو سیاہ فام افریقہ کے مسلمانوں کی شاید سب سے ہم اسلامی زبان ہے۔ سیاہ فام افریقہ کا اسلامی ثقافت کا حامل خطہ عربی اور ایرانی خطے کے برعکس کہ جہاں صرف ایک زبان کا غلبہ ہے، بڑے وسیع رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ یہاں پر ہر علاقے کی اپنی مستقل زبان ہے۔ ان زبانوں میں سے کچھ اس خطے کے مسیحیوں کی زبانیں بھی ہیں جو ثقافتی اعتبار سے افریقہ کے مسیحیوں کے لیے اہمیت کی حامل ہیں، اگرچہ شمالی افریقہ اسلام کے ظہور میں آنے کے تقریباً سو سال بعد عربی زبان سے آشنا ہوا۔ سیاہ فارم افریقہ کا خطہ ۱۵ کروڑ افراد پر مشتمل ہے اور متنوع ثقافتوں کا حامل ہے اور وہ قابل توجہ قومی اور ثقافتی صورتحال کے ساتھ سیاہ فام افریقہ کی ثقافت کی مقامی وحدت کو سمیٹے ہوئے اسلام کی اپنی جامع وحدت کو بھی پیش کرتا ہے۔

ترکی

اسلام کا چوتھا ثقافتی خطہ، ترکی کا علاقہ ہے جس میں ہمہ قسم کے لوگ رہتے ہیں اور مختلف زبانوں میں بات کرتے ہیں۔ ان زبانوں میں سب سے اہم ترکی زبان ہے، لیکن آذری، چیچنی، یقوری، ازبکی، قرقیزی اور ترکمانی زبانیں بھی ان میں سے ہیں۔ اس خطے کے لوگ جو دراصل صحرا نشین تھے، آلتائی کوہستانوں سے وسطِ ایشیا کو فتح کرنے کے لیے جو ایرانیوں کے قبضے میں تھا' جنوب کی طرف چل پڑے اور انہوں نے اس علاقے کی قدیم شکل کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا، لیکن ثقافتی طور پر فارسی زبان سے دور نہ سکے۔ جب ترک اُس عہد کے ایران میں داخل ہوئے تو تب وہ سالہا سال پہلے اسلام قبول کر چکے تھے اور درحقیقت اسلام کے عظیم سپوتوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ترکوں نے نہ صرف یہ کہ ایران کے مقامی حاکموں مثلاً ساسانیوں پر فتح حاصل کی بلکہ مغرب کی جانب اناطولیہ پر بھی چڑھ دوڑے اور ۱۰۷۱ء میں انہوں نے ملاز گرت کی جنگ میں بیزانس کے لشکروں کو روند ڈالا اور یہ اسلام کی تاریخ کی فیصلہ کن جنگوں میں سے ایک تھی۔ اس فتح نے ترک صحرا نشینوں پر اناطولیہ

کی بلندیوں کے دروازے کھول دیے اور اس خطے میں ترک زبان و ثقافت کے آغاز کے سبب عثمانی سلطنت کی تاسیس ہوئی جو ۱۴۵۳ء میں قسطنطیہ کی فتح کا موجب بنی۔ ترک عسکری لحاظ سے طاقتور تھے اور انہوں نے بہت سی اسلامی سرزمینوں مثلاً ایران اور مصر کو اپنے ماتحت کرلیا۔ آج ترک باشندے جو ۱۵ کروڑ سے زیادہ آبادی کے حامل ہیں' مقدونیہ سے سائبیریا اور سارے ولاڈی واسٹک تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے ترک گروہ دوسرے غیر ترک علاقوں مثلاً ایران، افغانستان، مصر، اردن، شام اور روس میں آباد ہیں۔ روس میں ترکی بولنے والی اقلیتیں ان لوگوں میں سے ہیں جو رُوس کے زار خاندان کے بادشاہوں کی فتوحات کے ہاتھوں مغلوب ہو گئے تھے۔

پاک وہند

اسلامی ثقافت کا پانچواں خطہ برصغیر پاک وہند ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی کی پہلی دہائی کے قریب محمد بن قاسم کے لشکر نے سندھ کو فتح کیا اور یوں چند صدیوں بعد برصغیر میں اسلام کے نفوذ کی راہ ہموار ہو گئی لیکن اسلام کے پھیلاؤ کے اصلی عوامل سارے ہندوستان میں صوفیاء کے گروہ تھے۔ ترک بادشاہوں نے بھی کئی بار ہندوستان پر حملے کیے اور گیارھویں صدی عیسوی کے بعد سے ہندوستان پر انگریز استعمار کے زمانے تک ہندوستان کے زیادہ تر علاقے خاص طور پر شمالی علاقے جہاں سولہویں صدی عیسوی میں مغلوں نے ایک عظیم سلطنت قائم کی تھی، مسلمان حکمرانوں کے زیر نگیں رہے۔ اگرچہ ہندوستان کی مقامی آبادی میں ترک اور ایرانی عناصر بھی دیکھے جا سکتے ہیں لیکن ثقافتی اور لسانی اعتبار سے وہ بہت زیادہ متنوع واقع ہوئے ہیں۔

فارسی زبان تقریباً ہزار سال تک ہندوستان کے مسلمانوں کی علمی اور ادبی زبان رہی لیکن مقامی زبانیں مثلاً سندھی، گجراتی، پنجابی اور بنگالی بھی اسلامی زبانوں میں اہم مقام کی حامل رہی ہیں۔ آہستہ آہستہ چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی میں ہندی اور فارسی اور کسی حد تک ترکی زبان کی آمیزش سے ایک نئی زبان اُردو کے نام سے وجود میں آئی۔ یہ زبان عربی و فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، اور سواحلی، ترکی عثمانی اور دیگر اسلامی زبانوں کی طرح اسلامی بول چال میں ایک اہم ذریعہ ابلاغ کے

طور پر سامنے آئی اور بعد میں پاکستان کی قومی زبان قرار پائی۔ ہندوستان کے اسلامی ثقافتی خطے میں پاکستان، بنگلادیش، نیپال اور ہندوستانی مسلمان اور سری لنکا کے اسلامی معاشرے شامل ہیں۔ یہ کوئی چالیس کروڑ کی آبادی ہے جو باقی چاروں خطوں سے زیادہ ہے۔ اس آبادی کے زیادہ ہونے کی دو وجوہات ہیں۔ ایک اُنیسویں صدی سے ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کی آبادی میں غیر معمولی اضافہ اور دوسرے یہ کہ برصغیر کی تقریباً ایک چوتھائی ہندو آبادی نے اسلام قبول کر لیا تھا کیونکہ یہ دین خوش قسمتی سے ان لوگوں کے لیے جو ہندو قوانین کے چنگل میں گرفتار تھے، نجات کا پیغام لے کر آیا تھا۔ برصغیر کے مسلمانوں نے اسلامی فنون و ثقافت کے بعض عظیم ترین آثار کو جنم دیا، اگرچہ وہ ترک بادشاہوں کے زیر نگیں رہے تاہم انہوں نے ثقافت کے اعتبار سے فارسی زبان کو بہت زیادہ عزیز سمجھا۔

ملایا

اسلامی ثقافت کا چھٹا خطہ جنوب مشرقی ایشیا کا ملایا کا علاقہ ہے۔ اسلام تیرھویں صدی عیسوی کے بعد عربی بولنے والے تاجروں کے ذریعے خلیج فارس اور بحر ہند کے راستے یہاں پہنچا۔ اس قافلے میں ہندوستان کے تاجر اور صوفیا بھی شامل تھے۔ ملایا کا اسلام بھی اپنے عظیم قومی تشخص سے بھرا ہوا ہے اور اپنی خاص خصوصیات کا حامل ہے۔ اس علاقے میں بھی اسلامی تمدن پر تصوف کے گہرے اثرات موجود تھے اور یہاں در حقیقت اسلام کی اشاعت بڑی حد تک اسی گروہ کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ یہاں ملایا تشخص اور اسلامی تمدن کے مابین بہت سی قربتیں پائی جاتی ہیں۔ یہاں ملایائی اور جاوی زبانیں رائج ہیں اور اس علاقے میں تقریباً ۲۲ کروڑ مسلمان آباد ہیں۔ اگرچہ اس خطے کے اسلامی تمدن کے ساتھ الحاق کو کوئی زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن اس کے باوجود ملایا کے مسلمانوں کی مکہ و مدینہ سے شدید وابستگی اور رسول اکرم ﷺ کی سنتِ مبارکہ سے عشق مشہور ہے۔ افریقہ اور ہندوستان کی طرح ملایا میں بھی اسلامی تمدن تصوف کی جانب مائل ہے اور ظاہری امور اور عمل میں صوفی اثرات وہاں پر غالب ہیں۔

چین

ان چھ اسلامی ثقافتی خطوں کے بعد ایک چھوٹے علاقے یعنی چینی خطے کا ذکر بھی ضروری ہے، جو ساتویں صدی عیسوی میں وجود میں آیا۔ ظہورِ اسلام کے بعد جلد ہی مسلمان تاجر چین کی بندر گاہ کانتون جیسی جگہوں پر جا کر بس گئے۔اسی زمانے سے اسلام چین میں پہنچا لیکن اسلام کا آغاز زیادہ تر سنکیانگ سے ہوا جسے مسلمان جغرافیہ دان مشرقی ترکستان کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

چینی مسلمان بھی ترکی زبان کے خاندان ایغوری سے تعلق رکھتے ہیں۔ان میں چینی زبانوں کی مشہور زبان ''ھوئی'' بھی ہے۔ھان نامی چینی قوم میں بھی مسلمان پائے جاتے ہیں۔چین میں مسلمانوں کی تعداد ایک بڑا راز رہی ہے اور اس بارے میں ڈھائی کروڑ سے دس کروڑ تک کے اعداد سننے میں آتے ہیں۔ چینی مسلمان فن معماری اور خوش نویسی میں ممتاز رہے ہیں اور وہ عقلی روایات سے بھی مکمل طور پر بہرہ ور ہیں۔وہ ایرانی تصوف کے انتہائی قریب ہیں۔ساتویں صدی عیسوی کے بعد سے چین میں اسلام کی علاقائی روایت آہستہ آہستہ ترقی کرتی گئی۔

یورپ

چینی مسلمانوں کے بعد یورپ میں آباد مسلمانوں کا ذکر بھی اہم ہے۔ان میں بلغاریہ، یونان اور مقدونیہ میں بسنے والے ترک ہی نہیں بلکہ یورپ میں آباد خود مقامی گروہ بھی شامل ہیں جو پانچ سو سال پہلے مسلمان ہوئے۔ان میں سے البانوی لوگوں کے گروہ قابل ذکر ہیں جو سارے البانیہ، کوسووا اور مقدونیہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔اسی طرح بوسنیا کے گروہ جو اکثر بوسنیا میں اور کسی حد تک کرواسی اور صربستان میں رہتے ہیں اور ان کی ثقافت کا فہم بھی اسلامی سلطنت کے سمجھنے میں مفید ہے اور ساتھ ہی اسلامی دنیا اور مغرب کے درمیان دوستانہ روابط کے سلسلے میں آج کے یورپ میں ایک اہم وسیلہ ہے۔

آخر میں یورپ اور امریکا میں نئے اسلامی معاشروں کا جن میں باہر سے آنے والے اور اسلام

قبول کرنے والے مقامی باشندے (نو مسلم) بھی شامل ہیں' ذکر لازم ہے (البتہ بہت سے مسلمان اس بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ انہیں نو مسلم کی بجائے واپس آنے والے (Reverts) کہا جائے۔ یہ لوگ کئی ملین کی تعداد میں یورپ میں آباد ہیں۔ تقریباً کئی ملین شمالی افریقہ کے مسلمان فرانس میں بستے ہیں۔ تقریباً تین ملین ترک اور کرد جرمنی میں ہیں۔ دو ملین سے زیادہ برصغیر پاک وہند کے مسلمان مہاجرین انگلستان میں رہتے ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کے اور کئی چھوٹے لیکن بہت اہم گروہ بھی یورپ کے تمام ملکوں میں آباد ہیں۔

امریکا میں بھی رہنے والے مہاجر مسلمان مشرقی عرب علاقوں، ایران اور برصغیر سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں نو مسلم بھی ہیں جو حبشیوں اور سفید فام لوگوں کے درمیان پائے جاتے ہیں۔ امریکا میں سیاہ فام لوگوں کے درمیان اسلام کی اشاعت کا آغاز عالیجاہ محمد نامی شخصیت سے ہوا۔ اس نے ان علاقوں میں ملتِ اسلامی کو زندہ کیا اور نسل پرستی کے خلاف جنگ کی حمایت کی۔ یہ تحریک بعد میں دو شاخوں میں بٹ گئی اور اس کے اکثر ارکان دوسرے امریکی سیاہ فام مسلمانوں کے ساتھ جلد ہی اسلام کے اصل اصولوں کے ساتھ مل گئے۔ اس ضمن میں مالک الشبز (Al.Haji Malik Shabazz) کا' جو اکثر ملکم ایکس (Malcolmx) کے نام سے مشہور ہے، بہت اہم کردار ہے۔ پچاس لاکھ مسلمان یورپ میں، تقریباً ساٹھ لاکھ مسلمان امریکا میں، ۵ لاکھ کینیڈا میں اور لگ بھگ ۲۰ لاکھ سے زیادہ مسلمان جنوبی امریکا میں رہتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں کہ اسلامی دنیا کو بین الاقوامی سطح پر دیکھنے کی کوشش کریں تو مغربی خطوں میں بسنے والے مسلمان اور ان کی ثقافت بھی ایک اہم عنصر بن کر سامنے آتی ہے۔

اسلامی ثقافت کے یہ خطے جن کا اختصار کے ساتھ ہم نے ذکر کیا ایک نمائش گاہ کی طرح ہیں جس میں قومیتوں کا ایک متنوع گلدستہ، مختلف فنون اور موسیقی کا مجموعہ اور انسانی زندگی کے مختلف آداب دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اسلام بورینو کے جنگلوں سے لے کر کوہ ہندوکش کے پہاڑوں تک اور پھر ماریطانیہ کے بیابانوں تک اپنے پیروکار رکھتا ہے جن کے درمیان سفید فام' سیاہ فام' زرد فام اور حقیقت میں دوسری نسلوں کے لاتعداد لوگ دیکھے جاسکتے ہیں۔ لیکن اس واضح تنوع کے اندر ایک

ایسی وحدت موجود ہے جس کا سرچشمہ اسلام ہے اور مشرق سے لے کر مغرب تک ہر روز مکہ کی طرف منہ کر کے نمازوں کی اقامت میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کی پیروی کا زریں نمونہ سامنے آتا ہے اور ہم آہنگی کی مثال ابھر کر سامنے آتی ہے۔

اسلامی دنیا میں موجود وحدت کبھی بھی متحد الشکل ہونے کے معنی میں نہیں رہی، بلکہ اس کی امتیازی خصوصیت ہمیشہ تنوع پسندی ہی رہی ہے۔ اس وحدت کو سمجھنے اور اس میں موجود تنوع کے ادراک کے لیے ہمیں چاہیے کہ ہم اس راستے کو تلاش کریں جس پر چل کر اسلام نے ان سارے انسانی معاشروں کو اپنی طرف کھینچا اور ان کے مابین اختلافات کے عین عروج میں ایک عالمگیر تمدن کی تشکیل کی۔

مذہبی آزادی، ارتداد اور تبدیلِ مذہب

ہاشم کمالی

ہاشم کمالی افغان نژاد مفکر ہیں اور ملائیشیا میں مقیم ہیں۔ انہوں نے بیس برس سے زائد عرصے تک ملائیشیا کی 'بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی' میں شعبہ علوم اسلامیہ میں بطور پروفیسر خدمات انجام دیں۔ ان کا شمار انگریزی زبان میں شریعت اسلامیہ پر لکھنے والوں میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے مصنفین میں ہوتا ہے۔زیرنظر مضمون میں انہوں نے مذہبی آزادی کی اسلامی عصری تفہیم سے جڑی چند جہات پر کلام کیا ہے کہ کس طرح انسانی شرف اور وقار کو دین اسلام میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس کے ضمن میں انہوں نے ارتداد کے مسئلے پر روشنی ڈالی ہے کہ اسلامی فقہی لٹریچر میں اس کی سزا کا تاریخی پس منظر کیا رہا ہے، اور عصرحاضر میں اس تصور کی کیا توجہات ممکن ہیں۔اس حوالے سے انہوں نے ایک متعلقہ حدیث مبارکہ کی تشریحات پر بھی آراء پیش کی ہیں۔ اور آخر میں ملائیشیا میں ارتداد کے قانونی ڈھانچے پر تجزیہ بھی پیش کیا ہے جو دیگر مسلم ممالک کے لیے استفادے کا باعث ہوسکتا ہے۔ یہ مضمون 'مذہبی آزادی کا اسلامی مقدمہ' کے عنوان کے تحت2019ء میں جکارتہ میں منعقد ہونے والی ساتویں 'اسلام اینڈ لبرٹی کانفرنس' میں پیش کیا گیا اور انگریزی کتاب 'اسلام میں مذہبی آزادی کا مقدمہ' میں شامل ہے۔

مذہبی آزادی: تعریف اور نمایاں خصوصیات

مذہبی آزادی ایک ایسا اصول ہے جو فرد یا کمیونٹی کے لیے نجی اور عوامی مقامات پر اپنے مذہب یا عقیدے کو ظاہر کرنے کی حمایت کرتا ہے جس کے تحت اس مذہب کی تعلیم، اس پر عمل، عبادت، اور اس کا کھلا اظہار کر سکتے ہیں، اور اسی کے تحت میں مذہب یا عقیدہ تبدیل کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

مذہبی آزادی کی سب سے مؤثر اور عمدہ تعریفات میں سے ایک انسانی حقوق کے عالمی اعلامیہ (1948) کے آرٹیکل 8 میں دی گئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

ہر فرد کو فکر، ضمیر اور مذہب کی آزادی کا حق ہے۔ اس حق میں اپنے مذہب یا عقیدے کو تبدیل کرنے کی آزادی بھی شامل ہے، اور ساتھ ہی کوئی بھی فرد یا کمیونٹی نجی اور عوامی مقامات پر اپنے مذہب یا عقیدے کو ظاہر کر سکتے ہیں، اس حق کے تحت مذہب کی تعلیم، اس پر عمل، عبادت، اور اس کا کھلا اظہار بھی شامل ہیں۔

مذہب یا عقیدے کی آزادی کو 1976 کے شہری و سیاسی حقوق کے بین الاقوامی معاہدے میں بھی شامل کیا گیا ہے۔ بین الاقوامی قانون کے تحت، مذہبی آزادی کے دو اجزاء ہیں: (۱) مذہب یا عقیدہ رکھنے یا نہ کرنے کی آزادی؛ اور (۲) اپنے مذہب یا عقیدے کو ظاہر کرنے کی مکمل آزادی، انفرادی سطح پر بھی اجتماعی سطح پر بھی، اس آزادی میں مذہب کی تعلیم، اس پر عمل، عبادت اور اس کا اظہار بھی حصہ ہے۔[1]

مذہب کی آزادی ایک بنیادی انسانی حق ہے، جو اکثر دوسرے بنیادی حقوق اور آزادیوں کے احترام کے معاملے میں ایک پیمانے کے طور پر کام کرتا ہے۔ مذہبی رواداری کو بھی بجا طور پر تکثیری اور متنوع معاشروں میں برداشت کا نمونہ سمجھا جاتا ہے، تاہم مشاہدہ یہ کیا گیا ہے کہ مذہبی آزادی کے نظریات اور عملی اطلاق کے درمیان اکثر ایک خلیج پائی جاتی ہے۔ برطانوی فلسفی جان اسٹیورٹ مل کا یہ تبصرہ مشہور ہے کہ جس چیز کی لوگ زیادہ پرواہ کرتے ہیں یا اس میں حساسیت دکھاتے ہیں، اس چیز میں عدم رواداری انسانوں میں عام بات ہوتی ہے، اس حد تک کہ مذہبی آزادی کو عملی طور پہ اس وقت تک یقینی نہیں بنایا جاسکتا جب تک کہ مذہبی بے حسی کے آثار نمودار نہ ہوں۔ جب بھی سماج میں اکثریت کے جذبات حقیقی اور شدید ہوتے ہیں تو مذہبی رواداری کو خطرہ لاحق رہتا ہے۔[2]

ایک مذہبی ریاست کا تشخص رکھنے والے ملک میں، مذہبی آزادی کا عام طور پر یہ مطلب سمجھا جاتا ہے کہ حکومت ریاستی مذہب کے علاوہ دیگر مذاہب پر عمل کرنے کی پوری اجازت دیتی ہے اور دوسرے مذاہب کے ماننے والوں پر کوئی جبر نہیں کرتی۔ عقیدہ کی آزادی قابل احترام ہے کیونکہ یہ

---

[1] EU Guidelines on the Promotion and Protection of Freedom of Religion or Belief

[2] John Stuart Mill as quoted in C.L. Ten (Religious Toleration and Beyond)

اس حق کو ماننے کی اجازت دیتی ہے کہ کوئی شخص یا گروہ کس مذہب یا عقیدے کو اپنانا چاہتا ہے۔ لیکن عموماً مذہبی ریاست میں عوامی سطح پر اور کھلے عام دیگر مذاہب و عقائد پر عمل کرنا ذرا دشوار ہوتا ہے۔[3]

کثیر الثقافتی اور تکثیری معاشروں میں شہری امن اور خوشحالی کے لیے مذہبی آزادی ایک ناگزیر شے ہے۔ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ مذہبی آزادی کے اشاریوں سے دیگر سماجی آزادیوں کے احترام، حکومتوں کی ذمہ دارانہ رویوں اور ترقی یافتہ شہری معاشروں کی حیثیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ جبکہ مذہبی آزادی سے انکار کا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ دیگر شہری اور سیاسی حقوق کے حوالے سے بھی مشکلات کا سامنا ہو گا۔ مذہب یا عقیدے کی آزادی کو انسانی حقوق کی فراہمی میں ایک پیمانے کے طور پہ دیکھا جاتا ہے، جہاں مذہبی آزادی پر حملہ ہوتا ہے، اکثر وہاں دیگر بنیادی حقوق کو بھی خطرات لاحق ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مذہبی آزادی کا اظہارِ رائے اور اجتماع کی آزادی کے سمیت دیگر انسانی حقوق اور آزادیوں کے ساتھ گہرا ربط ہوتا ہے۔

مذہبی آزادی اخلاقی آزادی کی بنیاد ہے۔ اسے نہ صرف جبر سے استثنیٰ کے طور پر بلکہ اس سے بھی زیادہ، ایک سچائی کی حیثیت میں پرکھا جاتا ہے۔ جبر کے ذریعے سچائی کے وجود کو باقی نہیں رکھا جاسکتا۔ جیسا کہ علامہ محمد اقبال کا کہنا ہے کہ ایک ایسا فرد جس کی حرکات و سکنات مکمل طور پر ایک مشین کی طرح متعین کردی جائیں، وہ نیکی کو جنم نہیں دے سکتا۔ گویا آزادی نیکی کے جنم اور اس کے فروغ کے لیے لازمی شرط ہے۔ خدائے بزرگ و برتر نے انسانوں پر جو بے پناہ بھروسے کا اظہار کیا ہے، اس میں بھی نظر آتا ہے کہ انسان زمین پر بطور نائب امانت کے بوجھ کو آزادی کے بغیر نہیں اٹھاسکتا۔ اقبال کا تصور ہے کہ قدامت پسندی مذہب میں بھی اتنی ہی بری ہے جتنی کہ انسانی سرگرمیوں کے کسی بھی دوسرے شعبے میں۔ اس لیے کہ یہ فرد کی کی تخلیقی آزادی کو ختم کردیتی ہے اور ایک تازہ روحانی تجربے کی راہیں مسدود کردیتی ہے۔ انسانی شخصیت کی نشوونما کے لیے مذہب کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے علامہ اقبال کہتے ہیں کہ ایک غیر صحت مند مسابقتی معاشرے پر غلبہ پانے

[3] Freedom of religion- Wikipedia nnps://en.wikipedia.org

کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی غیر بوجھل ذات اور اپنے مستقبل کی ایک نئی صبح کی جانب میلان رکھے۔ایک تہذیب اپنی تشکیل کردہ مخصوص مذہبی وسیاسی اقدار پر مبنی اپنے داخلی طرزِ عمل کی وجہ سے اپنی روحانی وحدت کھو چکی ہے۔ اقدار کے حقیقی تصور کو دوبارہ اجاگر کرنے اور اپنی ذات کی قوتوں کو از سرِ نو مربوط کرنے کے لیے بلاشبہ مذہب ایک ناقابل تردید اصول ہے۔تاہم جبر کے تحت کسی صحت مند قدر کا احیاء ممکن نہیں ہے۔فرد کی داخلی ثمر آور جبلتوں کو تقویت دینے کے لیے مذہبی آزادی ضروری ہے۔ آج تمام بڑے مذاہب کے رہنماؤں اور پیروکاروں کی بھاری اکثریت مذہبی آزادی کی بھرپور حمایت کرتی ہے کہ جس میں فرد کو یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ کسی بھی دینی روایت کے ساتھ اپنا ربط قائم کرے یا نہ کرے۔

ایسے وقت میں جب دنیا بھر کے ممالک اور معاشروں میں انسانی وقار کو مختلف شکلوں میں پامال کیا جارہا ہے -اکثر مذہب کے نام پر- تو یہ اور بھی ضروری ہو جاتا ہے کہ وقار اور آزادی کی بنیادی اقدار پر دوبارہ زور دیا جائے۔ تمام مذاہب انسانوں کو بنیادی طور پر مساوی تسلیم کرتے ہیں، چاہے ان کا تصورِ انسان کوئی بھی ہو۔

انسانی وقار اور آزادی

مذہبی آزادی اور دیگر تمام بنیادی آزادیوں کا احترام، انسانی وقار کا حصہ اور ایک بنیادی اصول ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نسل، رتبے، رنگ یا کسی بھی دوسرے پس منظر سے قطع نظر، تمام انسان وقار اور احترام کی بنیادی سطح کے حقدار ہیں۔

مذہبی آزادی دراصل اس بات کا اظہار ہوتی ہے کہ کسی انسان کا انفرادی پہلو کونسا ہے۔ اس سے فرد کی شناخت اور مقصدِ زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اس آزادی کو مسترد کرنا یا اپنی مرضی سے اسے محدود کرنے کا مطلب انسان کی تخریبی ذہنیت کو فروغ دینا ہے۔ جنونیت، بنیاد پرستی اور انسانی وقار کے منافی طرز عمل کو کبھی بھی جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

مذاہب کے تمام مقدس صحائف انسانی وقار کی گہری قدر کو آشکار کرتے ہیں۔ اس وقار کو

مادیت سے بلند ہونے اور سچائی کو تلاش کی صلاحیت کے طور پر جانا جاتا ہے، اسے ایک آفاقی بھلائی کے طور پر بھی تسلیم کیا جانا چاہیے، جو انسانیت کی تکمیل اور ایک ہدایت یافتہ معاشرے کی تعمیر کے لیے ناگزیر چیز ہے۔ قرآن کریم میں بلا تفریق تمام انسانوں کے لیے وقار واحترام کی بات کی گئی ہے:

"اور ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی ہے اور خشکی اور دریا میں اسے سوار کیا اور ہم نے انہیں ستھری چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر انہیں فضیلت عطا کی۔[4]"

انسانی احترام کے تناظر میں قرآن کریم کی یہ آیت اکلوتی نہیں ہے، انسانی عظمت کے بہت سے مظاہر قرآن میں دوسری جگہوں پر بھی پائے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر بنی نوع انسان کی تخلیق اور اس کی جسمانی تصویر کے حوالے سے، قرآن کی ایک آیت بتاتی ہے کہ اللہ تعالی نے انسانوں کو "بہترین شکل میں" پیدا کیا:

"لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيۤ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ"[5] (ہم نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا)

ایک اور جگہ فرمایا:

"صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ"۔[6] (تمہاری صورت بنائی اور بہترین صورت عطا کی)

ایسے ہی فرمایا:

"وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي"[7] (اور میں نے اس میں اپنی روح پھونکی)

اس کے بعد، انسانوں کو زمین پر خدا کے امانت دار اور نائب کے طور پر نامزد کرنا، اور ساتھ ہی ایسے دوسرے اعلانات کہ خدا نے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اسے انسانوں کے فائدے کے لئے

---

[4] الاسراء:70

[5] التین:6

[6] غافر:64

[7] الحجر:29

مسخر کر دیا ہے، وغیرہ، یہ سب دلالت کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں انسانی وقار و عظمت کو تسلیم کیا گیا ہے۔

مفسر قرآن علامہ آلوسی نے اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے کہ "ہر انسان اور نسل انسانی کے تمام افراد بشمول متقی اور گنہگار، وقار، عزت اور احترام کے حقدار ہیں جسے نہ چھینا جا سکتا ہے اور نہ ہی جھٹلایا جا سکتا ہے۔"[8] ایک سوال جو بہت سے مفسرین نے اٹھایا ہے وہ یہ ہے کہ انسانی وقار و عظمت کا معیار یا اس کی بنیاد کیا ہے۔ جسمانی خوبصورتی ہے، روحانی عظمت، ذاتی صفات، یا معاشرے میں حیثیت ایک معیار ہے؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ابن عباسؓ، جو ترجمان القرآن کے نام سے مشہور تھے، کے مطابق، خدائے بزرگ و برتر نے انسان کو عقل و فہم سے نوازا ہے، جو اس کی عظمت کا واحد معیار ہے۔ اس طرح یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ ہر انسان کو پیدائش کے وقت سے ہی اسی بنیاد پر احترام کا حق حاصل ہے اور یہ گویا ہر ایک کا فطری حق ہے۔ اور چونکہ یہ خدا کا دیا ہوا ہے، اس لیے کوئی انسان اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

اسلامی تعلیمات میں مذہبی آزادی کا اصو مسلمہ ہے جس میں دیگر مذاہب کے ساتھ بقائے باہمی کو بھی تسلیم کیا گیا ہے اور نصوص میں متعدد مقامات پر لوگوں کی یہ آزادی دی گئی ہے کہ وہ جس مذہب کو قبول کرنا چاہتے ہیں کر سکتے ہیں، مثال کے طور پہ:

"لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ"[9] (تمہارے لیے تمہارا دین اور میرے لیے میرا دین ہے۔)

"فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ"۔[10] (جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر اختیار کرے)

---

[8] روح المعانی، 15/17

[9] الکافرون: 6

[10] الکہف: 29

"لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ"۔[11](دین میں کوئی جبر نہیں۔)

"اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَھُمْ وَلَا لِیَھْدِیَھُمْ سَبِیْلًا"۔[12]

(بے شک وہ لوگ جو ایمان لائے پھر کفر کیا پھر ایمان لائے پھر کفر کیا پھر کفر میں بڑھتے رہے تو اللہ ان کو ہر گز نہیں بخشے گا اور نہ انہیں راہ دکھائے گا۔)

"وَلَوْ شَآءَ رَبُّکَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ کُلُّھُمْ جَمِیْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُکْرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ"۔[13]

(اور اگر تیرا رب چاہتا تو جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کے سب ایمان لے آتے، پھر کیا تو لوگوں پر زبردستی کرے گا کہ وہ ایمان لے آئیں۔)

قرآن کریم مزید اعلان کرتا ہے کہ اللہ تعالی پر ایمان ایک انفرادی معاملہ ہے اور ہر فرد اپنے انتخاب کا ذمہ دار ہے:

"مَّنِ اھْتَدٰی فَاِنَّمَا یَھْتَدِیْ لِنَفْسِہٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا یَضِلُّ عَلَیْھَا ؕ وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۗ وَمَا کُنَّا مُعَذِّبِیْنَ حَتّٰی نَبْعَثَ رَسُوْلًا"۔[14]

(جو سیدھے راستے پر چلا تو اپنے ہی لیے چلا، اور جو بھٹک گیا تو بھٹکنے کا نقصان بھی وہی اٹھائے گا، اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا، اور ہم سزا نہیں دیتے جب تک کسی رسول کو نہیں بھیج لیتے۔)

یہ بات بھی سمجھنا ضروری ہے کہ قرآن کریم تصادم کی بجائے بین المذاہب مکالمے کی ترغیب دیتا ہے، مثال کے طور پر ایک جگہ فرمایا گیا:

---

11 البقرہ:225

12 النساء:137

13 یونس:99

14 الاسراء:15

”قُلْ يَآ اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ“[15]

(کہہ اے اہلِ کتاب! ایک بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے کہ سوائے اللہ کے اور کسی کی بندگی نہ کریں اور اس کا کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور سوائے اللہ کے کوئی کسی کو رب نہ بنائے، پس اگر وہ پھر جائیں تو کہہ دو گواہ رہو کہ ہم تو فرمانبردار ہونے والے ہیں۔)

مجموعی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے بھی مذہبی عقیدے اور عمل میں انتخاب کی آزادی کو برقرار رکھا۔ مکہ اور مدینہ میں نبی کریم ﷺ نے دیگر مذہبی برادریوں کے ساتھ بہت زیادہ رواداری کا مظاہرہ کیا۔ انہیں اپنے مذاہب کو ظاہر کرنے اور ان پر عمل کرنے اور یہاں تک کہ اپنی زندگیوں کو اپنے مذہبی اصولوں اور اقدار کے مطابق چلانے کی اجازت دی گئی۔ مسلمانوں کو یہ تعلیم دی گئی کہ وہ دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ بدسلوکی نہ کریں، نہ انہیں برا بھلا کہیں۔ ایک موقع پر جب نبی کریم ﷺ کچھ غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ نہ کر سکے، تو قرآن نے آپ ﷺ کو حکم دیا کہ وہ ان سے یہ کہیں:

‘تمہارے لیے تمہارا دین اور مرے لیے میرا دین۔’

رواداری کے اسی اصول کو نبی کریم ﷺ نے "مدینہ کے آئین" میں شامل کیا، جو کہ مختلف قبائل اور مذہبی گروہوں کے درمیان پرامن تعلقات قائم کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ اس دستاویز کی ایک شِق میں کہا گیا ہے کہ: "بنو عوف کے یہودی دیگر اکائیوں کے ساتھ ایک اُمت (قوم) ہیں۔ یہودیوں کے لیے ان کا دین اور مسلمانوں کے لیے ان کا مذہب۔"[16]

یہ تو آنحضرت ﷺ کا مجموعی طرزِ عمل ہے۔ البتہ ایک حدیث آپ ﷺ سے مروی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ:

---

15 آل عمران: 64

16 میثاقِ مدینہ

"من بدَّل دينه فاقتلوه"[17] (جس نے اپنا مذہب تبدیل کیا اسے قتل کر دو۔)

بد قسمتی سے اس حدیث کو سیاق و سباق سے ہٹ کر عام کیا گیا ہے۔ تاریخی ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ موت کی سزا چند مخصوص افراد کو دی گئی جنہوں نے اسلام ترک کر دیا تھا۔ ان کی سزائے موت واضح طور پر اسلام ترک کرنے کے علاوہ دیگر وجوہات کی بنا پر تھی۔

زیر نظر حدیث ایک عام عبارت ہے جس کا اطلاق ممکنہ طور پہ کئی جہات پر ہو سکتا ہے، اس میں چونکہ عمومیت ہے ایسے کیسز بھی شامل ہو سکتے ہیں جو یقینی طور پہ مراد نہیں سکتے، جیسے کہ اگر کوئی ہندو اپنا مذہب تبدیل کر کے اسلام قبول کر لے۔ ظاہر ہے حدیث کا مقصود یہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح حدیث کے اطلاق کا دائرہ اس صورت میں بھی محدود ہو جاتا ہے کہ جب کوئی شخص جبراً اسلام کو ترک کرے مگر دل سے وہ مسلمان ہی ہو۔[18]

مزید یہ کہ احناف کے نزدیک مرتد عورت کی سزا موت نہیں بلکہ قید ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زیر نظر حدیث میں مذکر کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے، جو عورتوں پر اس کے اطلاق کے بارے شک کے عنصر کو جنم دیتا ہے، اور جب کسی حکم میں شبہ موجود ہو تو سزا معطل کر دی جاتی ہے۔ اندلس کے نامور فقیہ ابراہیم الشاطبیؒ نے اس حدیث کی تشریح میں یہ نکتہ شامل کیا ہے کہ حدیث میں کسی مذہب کو تبدیل کرنے کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اگر اگر کوئی شخص دین کے اندر اس کی قطعی تعلیمات کو تبدیل کر دے تو اسے قتل کیا جائے۔ امام شاطبیؒ نے حدیث کی ظاہری مراد کی صورت میں یہ کہا ہے کہ کسی کو صرف اسی صورت میں مرتد قرار دیا جا سکتا ہے جب وہ بغیر کسی مجبوری یا جبر کے ایسا اقدام کرے، اور اگر وہ ارتداد کی نسبت اپنی طرف کرنے سے انکار کرے تو اس پر ارتداد کا حکم جاری نہیں ہو گا۔[19]

---

[17] البخاری، حدیث: 6922

[18] امام شوکانی، نیل الاوطار، 7/219

[19] Muhammad Khalid Masud, Freedom of Religion in Age of Multi-Religious Societies

اصول فقہ کے قواعد کے مطابق، جب کسی نص میں احتمالات آجائیں تو وہ خود بخود قطعی کے درجے سے گھٹ کر ظنی بن جاتی ہے۔ اسی طرح زیر نظر حدیث میں سزائے موت صرف ایسے ارتداد کے ساتھ مخصوص ہے جس میں جنگ (حِرابہ) بھی شامل ہو۔ اس مفہوم کی تائید میں ایک اور حدیث میں ملتی ہے، جو درج ذیل ہے:

"لا يحل دم امرئ مسلم إلا بإحدى ثلاث: الثَّيِّبُ الزاني، والنفسُ بالنفس، والتاركُ لدينه المفارقُ للجماعة"۔[20]

(کسی مسلمان کا خون حلال نہیں، مگر تین میں سے کسی ایک صورت میں حلال ہے: یہ کہ وہ شادی شدہ زانی ہو، قتل کے بدلے میں اسے قتل کیا جائے اور وہ جو اپنے دین کو ترک کر کے مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو جائے۔)

اسلام کے ابتدائی زمانے میں خلافت راشدہ کے بعد مسلمان فقہاء نے مذہبی زندگی کو چلانے کے لیے اصولوں کا ایک مجموعہ تیار کیا۔ مجموعی طور پر، انہوں نے مذہبی آزادی پر بہت سی پابندیاں لگائیں اور ان کی خلاف ورزی کرنے پر سزائیں مقرر کیں۔ ان فقہا کا بنیادی مقصد مذہب کی درست روح کا تحفظ کرنا اور مذہبی امور میں ارتداد، توہین رسالت، بدعت اور منافقت کے جیسے امور کی روک تھام تھا۔ تاہم، پہلے اس سیاق وسباق کو سمجھنا بھی ضروری ہے جس میں یہ اصول وضع کیے گئے اور ان کا پرچار کیا گیا۔

اموی اور ابتدائی عباسی ادوار میں (8ویں سے 10ویں صدی عیسوی) کے دوران اسلام تیزی سے پھیل رہا تھا۔ تب مسلمان نئی نئی سیاسی طاقت کا تجربہ کر رہے تھے اور زیادہ سے زیادہ غیر مسلموں کی زمینوں اور برادریوں کو اپنی سلطنت کا حصہ بنا رہے تھے۔ جزوی طور پر اس توسع کے بعد کچھ مسائل جنم لے رہے تھے اور مسلم فقہاء یہ سوچ رہے تھے کہ کس طرح اپنی حکمرانی کو مضبوط کیا جائے اور کثیر الثقافتی اور کثیر الاعتقادی معاشروں میں لوگ کس طرح زیادہ سے زیادہ اسلام کے ساتھ جڑے رہیں۔

---

20 سنن ابن ماجہ، حدیث: 2534

یوں فقہ میں ایک موقف ترتیب پا گیا۔ پھر جب دوسری تیسری صدی ہجری میں نئی نسل پروان چڑھی تو انہوں نے راسخ العقیدگی پر زور دینا شروع کر دیا اور اس فکر کو تقویت دے کر دیگر عقائد و نظریات کو انحراف یا بدعت کہنا شروع کر دیا گیا۔ تاہم یہاں پر سوال یہ ہے کہ کیا ایک خاص ماحول کے نتیجے میں پروان چڑھنے والی آراء قرآن اور اسلام کی اصل روح کے عین مطابق ہیں یا نہیں؟

مذہبی آزادی کے حوالے سے بڑے مذاہب کا نقطہ نظر: ایک تاریخی خاکہ

اکثر مذہبی روایات میں اس تصور کو قبول کیا گیا ہے کہ مذہبی آزادی تمام انسانوں کا بنیادی حق ہونا چاہیے، خصوصاً مذہب کو تبدیل کرنے کے معاملے میں کہ جب ایک مذہب کا پیروکار اپنے مذہب کو چھوڑ کر دوسرے مذہب کو اختیار کرتا ہے، تو اس اقدام پر رواداری کا مظاہرہ ہونا چاہیے۔ اگرچہ مذہبی تبدیلی، یا ارتداد کے خلاف قوانین بھی ابھی تک غالب توحید پرست مذاہب میں موجود ہیں، چاہے مسیحیت ہو، یہودیت ہو یا اسلام (اسلام میں یہ تصور قرآن کا نہیں، بلکہ حدیث اور فقہ میں موجود ہے۔) ماضی میں بہت سے لوگوں کو اپنا مذہب تبدیل کرنے یا کسی خاص مذہب کو قبول نہ کرنے پر موت کی سزائیں سنائی جا چکی ہیں۔ مثلاً چودھویں اور پندرہویں صدی عیسوی میں اسپین میں کثیر تعداد میں مسلمان اور یہودی افراد کو کافر اور مذہب دشمن قرار دے کر کے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔[21]

جیسا کہ برکلے سوئڈلر نے لکھا ہے کہ چوتھی صدی عیسوی کے اوائل میں بادشاہ قسطنطین کے اقتدار سے پہلے تک مسیحی مفکرین اور مصنفین کے ہاں مذہبی آزادی کا تصور راسخ رہا، لیکن اس کے بعد جب مسیحیت کو ریاستی مذہب قرار دیدیا گیا تو پھر ایسا نہیں رہا۔ سوئڈلر کی رائے ہے کہ مذہب کو ریاست سے الگ کرنا انسانی تاریخ کا سب سے مؤثر اور نمایاں ترین اقدام ہے۔ پہلے مذہب ہی وہ ساری اخلاقی بنیادیں فراہم کرتا تھا جس پر ریاست اور قانون کی عمارت استوار ہوتی تھی۔ مذہب و ریاست کے مابین یہ رشتہ بہت زیادہ قریبی تھا۔ مذہبی آزادی کو تسلیم کرتے ہوئے ایک غیر جانبدار ریاست کا ظہور پہلی بار جدید مغربی تاریخ میں ہوا، خاص طور پر 1789ء کے امریکی دستور میں کہ جس

[21] Leonard Swidler, Freedom of Religion and dialogue: Moving Globalization from Destruction to Construction

کے بعد مذہبی آزادی کے تصور کو آئینی درجے تک پہنچادیا گیا۔

قرونِ وسطیٰ کے دوران کہ جب رومی سلطنت کے مغربی نصف حصے میسیحیت کو عروج حاصل ہوا تو اس وقت وہاں تقریباً سبھی لوگ میسیحیت اختیار کر چکے تھے۔ زیادہ تر رومن کیتھولک یورپی ریاستوں نے بھی قرون وسطیٰ کے دوران مذہبی آزادی پر سخت پابندیاں عائد کیے رکھیں۔ اس حوالے سے سب سے زیادہ قابل ذکر واقعہ یہ تھا کہ 1492ء میں اسپین سے تمام یہودیوں کو نکال دیا گیا۔ جو لوگ اسپین باقی رہے اور میسیحیت قبول کرلی ان پہ خفیہ طور پر یہودیت پر عمل کرنے کا الزام لگایا گیا اور انہیں مقدمات کا سامنا رہا۔ ان پر ظلم وستم کے باوجود، یہودی یورپ میں بسنے والا سب سے بڑا غیر میسیحی مذہب تھا۔

1492ء میں اسپین کے شہر غرناطہ کے سقوط کے بعد، معاہدے کے تحت مسلم آبادی کے ساتھ مذہبی آزادی کا وعدہ کیا گیا تھا، لیکن یہ وعدہ وفا نہیں ہوا۔ 1501ء میں غرناطہ کے مسلمانوں کو کہا گیا کہ یا تو وہ میسیحیت اختیار کریں یا ہجرت کر جائیں۔ اکثریت نے مذہب تبدیل کرنے کا اعلان کیا، لیکن صرف ظاہری طور پر، انہوں نے پہلے جیسا لباس پہننا اور وہی زبان بولنا جاری رکھا، اور خفیہ طور پر اسلام پر عمل کرتے رہے۔ مولدین (Moriscos) یعنی وہ مسلمان جنہیں نے میسیحیت اختیار کی تھی، انہیں بالآخر بادشاہ فلپ ثالث کے ایک حکمنامے کے تحت 1614ء میں اسپین سے نکال دیا گیا۔[22]

اس میں شک نہیں کہ نہ تو مغرب اور نہ ہی اسلامی دنیا کے پاس کوئی واضح فارمولا ہے کہ کس طرح مذہبی آزادی کو مکمل طور پہ یقینی بنایا جائے اور ایسے ہی مذہب و ریاست کے درمیان تعلق کو کس طرح ایک ٹھوس اور قابل قبول شکل دی جائے۔ تاہم، تاریخی لحاظ سے دیکھا جائے تو مسلم ممالک نے غیر مسلموں کے ساتھ نسبتاً بہتر سلوک کیا۔ مسلمانوں کے درمیان رہنے والے غیر مسلم اپنے عقیدے پر عمل کرنے میں آزاد تھے۔ مذہبی تکثیریت موجود تھی، اور عیسائیت، یہودیت اور ہندومت سمیت دیگر مذاہب کے مذہبی قوانین اور عدالتوں کو اسلامی قانونی فریم ورک کے اندر جگہ دی گئی تھی۔ خلافت کے ابتدائی مراحل، اندلس، برصغیر پاک وہند اور عثمانی سلطنت میں یہ چیزیں

---

[22] Saeed, Limitations on Religious Freedom in Islam, 369

نمایاں طور پہ دیکھی جاسکتی ہیں۔ قرون وسطی کے اسلامی معاشروں میں، قاضی عام طور پر غیر مسلموں کے دینی و سماجی آداب میں مداخلت نہیں کر سکتا تھا جب تک کہ وہ رضاکارانہ طور پر اسلامی قانون کے مطابق فیصلہ کرانے کا انتخاب نہ کرتے۔ اس طرح اسلامی ریاستوں میں رہنے والی غیر مسلم کمیونٹیز کے پاس عام طور پر شریعت سے آزادانہ طور پر اپنے قوانین ہوتے تھے جن کے مطابق وہ فیصلے کرتے، جیسا کہ یہودیوں کے پاس 'ہلاخاہ' کے نام سے قوانین اور رسوم وروایات کا ایک تحریری مجموعہ تھا۔

حتی کہ غیر مسلموں کو ان مذہبی رسومات پر عمل کرنے کی بھی اجازت تھی جو اسلامی قانون میں ناجائز تھیں، جیسے شراب پینا اور سور کا گوشت کھانا، نیز وہ مذہبی رسومات جو مسلمانوں کے لیے سخت ناگوار تھیں، ان پر بھی عمل ہوتا رہا، جیسے زرتشتی رسم میں بے حیائی کی شادی جس میں ایک مرد اپنی ماں، بہن یا بیٹی کے ساتھ نکاح کرتا تھا۔

پال ہیجز نے 10 جولائی 2015 کو واشنگٹن پوسٹ میں شائع ہوئے ڈینیل فلپوٹ کے مضمون کا حوالہ دیا ہے جس کا عنوان تھا "کیا مسلم ممالک واقعی مذہبی آزادی کے لیے ناسازگار ہیں؟" اس مضمون کا ایک ایک اقتباس یہ ہے: اس بات پر کافی تاریخی شواہد موجود ہیں کہ تنویری عہد میں یورپ میں مذہبی آزادی کا جو تصور مغرب کے ہاں متشکل ہوا جسے ہم روشن خیالی کہتے ہیں، وہ تصور دراصل سلطنت عثمانیہ میں اُس وقت نظر آنے والی رواداری سے لیا گیا تھا۔ جغرافیائی اعتبار سے آبادی کے ایک بہت بڑے حصے پر حکمرانی کے سبب عثمانیوں کے زیرِ انتظام مختلف مذہبی روایات کے حامل طبقات رہتے تھے جو ان کی رعایا تھے، لہٰذا ان سب کے لیے ہم آہنگی کے ماحول کو یقینی بنانے کے لیے ٹھوس پالیسیاں متعارف کرائی گئی تھیں۔ تب یورپ میں ایسا کچھ نہیں تھا اور اس نے عثمانی سلطنت سے یہ تصور سیکھا۔[23]

مزید برآں اسلامی فقہ کے سرکردہ مکاتب فکر نے یہ بھی ایک عمدہ تصور پیش کیا تھا کہ ریاست و حکومت سے متعلقہ امور مشاورت (شوریٰ) کی بنیاد پر چلائے جائیں گے، ان میں مفادِ عامہ (مصلحہ) کی رعایت رکھی جائے گی اور اجتہاد کو بروئے کار لایا جائے گا۔ مسلم فقہاء کے ہاں اس قدر

---

[23] Paul Hedges, Tne need for religious literacy in Kuala Lumpur, New Straits Times, August 3, 2015, 29

حساسیت اور باریک بینی دیکھنے کو ملتی ہے کہ انہوں نے اپنی تحریروں میں 'اسلامی ریاست' کی اصطلاح کا استعمال نہیں کیا، بلکہ خلافت، امارت، سلطنت، امامت جیسے الفاظ استعمال کیے، لیکن 'دولۃ اسلامیہ' کی اصطلاح نہیں استعمال کی۔ یہ اصطلاح سب سے پہلے محمد رشید رضا (متوفی 1935) نے استعمال کی تھی۔ الماوردی نے خلافت کا مقصود یہ لکھا ہے "مذہب کی حفاظت اور دنیاوی امور کو چلانا"، (حراسۃ الدین و سیاسۃ الدنیا)۔ ریاست مذہب کو ختم ہونے اور اس میں گمراہی در آنے سے بچاتی ہے، لیکن وہ مذہب کے اصولوں کے حوالے سے کوئی حکم جاری نہیں کرتی اور نہ ہی ان کی جزئیات میں کوئی دخل دیتی ہے۔ شریعت کسی ایسی مذہبی ریاست کا تصور پیش نہیں کرتی ہے کہ جس کی قیادت علماء وفقہاء کریں، بلکہ شریعت میں منتخب نمائندوں کا تصور دیتی ہے جو مشاورت اور بیعت کے ذریعے عہدہ سنبھالتے ہیں۔ بظاہر مذہب اور ریاست کے درمیان مکمل علیحدگی ممکن نہیں، تاہم باریک بینی اور مصلحت کے اصولوں کے تحت دیکھا جائے تو ان کے درمیان عملی علیحدگی کی نشاندہی ہوتی ہے۔ دراصل یہ خود مسلمانوں کو طے کرنا ہے کہ وہ اس تعلق کو رائے عامہ، مصلحت اور مشاورت کے اصولوں کے تناظر میں کیسے تشکیل دیتے ہیں، اور اس میں ترجیح یہ ہے کہ ریاست و مذہب کو الگ رکھا جائے۔

مذہبیت کا عروج اور مذہبی آزادی پر پابندیاں

رپورٹس کے اعداد و شمار یہ بتاتے ہیں کہ دنیا چار دہائیاں پہلے کی بہ نسبت اب زیادہ مذہبی ہو چکی ہے، اور یہ رجحان آگے بھی جاری رہے گا۔ رپورٹس کے یہ بھی اشاریے ہیں کہ غیر مذہبی تصورات میں عالمی سطح پر کمی کا امکان ہے۔ 1970 میں دنیا کی تقریباً 80 فیصد آبادی مذہبی تھی، اور 2010 تک یہ تناسب بڑھ کر تقریباً 88 فیصد ہو گیا تھا، جبکہ 2020 تک یہ شرح 90 فیصد تک پہنچ گئی۔ مذہب کے ماننے والوں میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے، خصوصاً چین میں لوگوں کا مسیحیت اور بدھ مت اختیار کرنا ایک بڑی وجہ ہے۔ 1970 میں لاادری (Agnostic) اور ملحد آبادی 19.2 فیصد تک تھی، جس کی بڑی وجہ مشرقی یورپ اور چین میں کمیونزم کا عروج تھا۔ تاہم، 1991 میں سوویت یونین کے سقوط کے بعد غیر مذہبیوں کی ایک بڑی تعداد مذہب کی طرف لوٹنے لگی۔ مسیحیت اور اسلام دو بڑے مذاہب ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ مستقبل قریب میں بھی ایسا ہی رہے گا۔ 1970

میں یہ دونوں مذاہب عالمی آبادی کا 48.8 فیصد تھے اور 2020 تک یہ تعداد 57.2 فیصد تک پہنچ گئی تھی[24]۔

مذہبی آزادی کے لیے قرآن کی مضبوط حمایت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سے شواہد کے باوجود، عصر حاضر کے بہت سے مسلم اکثریتی ممالک میں مذہبی آزادی کے لیے جگہ کچھ خاص حوصلہ افزا نہیں۔ اسی طرح انسانی حقوق کی تنظیموں اور حکومتی اداروں کی رپورٹس اس بات کی نشاندہی کرتی ہیں کہ عالمی سطح پر مذہبی آزادی کی خلاف ورزیوں میں بڑے پیمانے پر رجحانات کا اضافہ ہو رہا ہے۔ حکومتی اور غیر ریاستی دونوں سطح پر مذہبی رواداری کو خطرات لاحق ہیں، ابتدائی سطح کے بھی (مثلاً، انتظامی مشکلات یا پابندیاں) اور انتہائی نوعیت کے بھی (جیسے نسل کشی وغیرہ)۔

اگرچہ کچھ خلاف ورزیاں براہ راست مذہبی وجوہات سے متعلق ہیں، جبکہ کچھ دیگر اسباب ایسے بھی ہیں جو مذہب کی وجہ سے نہیں ہیں لیکن وہ بعض طبقات پر مذہبی رواداری کا دائرہ تنگ کرتی ہیں۔ مذہبی رواداری سے متعلق خلاف ورزیوں کے بنیادی عوامل میں مخصوص مذہبی گروہوں کی عدم برداشت اور تنگ نظر تشریحات کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی اور اقتصادی عوامل بھی شامل ہیں۔ قومی سلامتی کے تحفظ کی آڑ میں مذہبی آزادی کی بہت سی خلاف ورزیوں کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔

دنیا بھر میں مذہبی آزادی پر کام کرنے والے متعدد اداروں کے مطالعات بتاتے کہ صورتحال مزید بگڑ رہی ہے۔ پیو ریسرچ (Pew Research) کی ایک رپورٹ کے مطابق، دنیا کے 25 سب سے زیادہ آبادی والے ممالک میں، پاکستان، ترکی، مصر اور انڈونیشیا کا شمار ان خطوں میں ہوتا ہے جہاں مذہبی عقیدے اور عمل کے حوالے سے سب سے زیادہ پابندیاں عائد ہیں۔

مذہبی آزادی کی خلاف ورزیوں میں ایک بڑا حصہ انتہا پسند اسلام سے متعلق ہے (پاکستان، شام، یمن کی مثالیں)، اور کچھ کا تعلق آمرانہ حکومتوں سے ہے (مثلاً برما، چین)، جبکہ ایک سبب ہندو انتہا پسندی (بھارت) سے متعلق ہے۔ "سیکولر" مغرب میں بھی مذہبی گروہوں کے خلاف عدم

[24] Anugran Kumar, Study: World is Turning More Religious; Atneism Declining, Tne Cnristian Post CP World, July 20, 2013

برداشت اور دشمنی میں اضافہ محسوس کیا گیا ہے۔ مذہبی آزادی کی خلاف ورزیوں کے ذمہ دار کلیدی غیر ریاستی عناصر میں مجموعی طور پہ داعش (ISIS)، صومالیہ میں الشباب اور افغانستان میں طالبان شامل ہیں۔

مذہب بیزاری، میڈیا اور ریاستی پالیسیاں

مغربی میڈیا میں 'آزادی' کو عام طور پر مطلق اور تقریباً مقدس چیز بنا کر پیش کیا جاتا ہے، جبکہ ساتھ ہی مذہب کو غیر مرغوب اور فرسودہ تصور کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، ڈنمارک میں شائع ہونے والے کارٹونز کے تناظر میں آزادی کا استعمال توہین کے ہتھیار کے طور پر کیا گیا جس کی وجہ سے مسلم دنیا میں بہت سی جگہوں پر سخت مظاہرے ہوئے اور جانی مالی نقصان ہوا[25]۔ مغربی میڈیا میں آزادی کا یہ تصور خود مغرب کے اپنے اخلاقی فلسفے اور مذہبی اخلاقیات کے بھی خلاف ہے۔ مغربی تہذیب کو اکثر 'یہودی- مسیحی' تہذیب کہا جاتا ہے، لیکن نہ تو یہودیت اور نہ ہی مسیحیت اپنے ماننے والوں کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ دوسرے لوگوں کی توہین کی جائے یا انہیں تکلیف دی جائے، دونوں مذاہب انسانوں سے محبت کرنے کے اصول کو تسلیم کرتے ہیں (اور اس مسلمان بھی خارج نہیں)۔

مسلم دنیا کے بارے میں مغربی تاثرات ایک تو استعماری دور کی باقیات ہیں، بلکہ جب 1970 کے اوائل سے بعض مسلم ریاستوں نے اپنے تیل کے اثاثوں پر کنٹرول حاصل کرنا شروع کیا تو اس سے بھی مغربی گرفت کو ایک چیلنج کا سامنا کرنا پڑا اور میڈیا نے منفی رخ تراشنا شروع کر دیا۔ اسی طرح امریکی معاشرے کے اہم شعبوں پر صیہونی اثر ورسوخ میں اضافہ ہوا اور ساٹھ کی دہائی میں اسرائیلی قبضے کے خلاف فلسطینیوں کی مزاحمت تیز ہوئی تو امریکی میڈیا نے "مسلم دہشت گردی" کی تصویر گری کو تیز کر دیا۔ ''یہ واضح نہیں ہے کہ کیا مرکزی دھارے کا مغربی میڈیا مستقبل قریب میں

---

[25] طہٰ جابر العلوانی، لا اکراہ فی الدین، 90

اسلام اور شدت پسندی کو مساوی بنا کر پیش کرنے کی روایت ترک کردے گا یا نہیں۔"[26]

ارتداد اور مذہبی آزادی: مختلف آراء

قرآن میں ارتداد کا ذکر کم از کم 21 مقامات پر کیا گیا ہے، لیکن کہیں بھی اس کے لیے کسی سزا کی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ طٰہٰ جابر العلوانی کا کہنا ہے کہ اگرچہ قرآن مسلمانوں کے اسلام چھوڑنے کے عمل کی بھرپور مذمت کرتا ہے، لیکن اس کے لیے دنیاوی سزا کا تعین نہیں کرتا۔ علوانی کے مطابق نبی کریم ﷺ کے زمانے میں ارتداد ایک سیاسی مسئلہ تھا، اس لیے اگر کوئی شخص دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر اسلام کو چھوڑ دیتا، تو اس شخص کے لیے کوئی سزا نہیں تھی۔[27] طہ جابر العلوانی کا مزید کہنا ہے کہ قرآن میں تقریباً 200 آیات ضمیر اور عقیدہ کی آزادی کی تائید کرتی ہیں۔ دوسری طرف، قرآن میں کسی بھی قسم کے جبر کی حمایت کا اشارہ بھی نہیں ہے کہ جس سے فرد کے عقیدہ کی آزادی کے حق کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔

قرآن کریم میں بارہا اہل مدینہ کے بعض لوگوں میں منافقت کے وجود کا حوالہ ملتا ہے جو عملی طور پہ پوری طرح مرتد تھے۔ تاہم، ان میں سے کسی کو بھی موت کی سزا نہیں دی گئی۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے محض عقیدے میں تبدیلی کی وجہ سے کسی شخص کو قتل کرنے کا حکم دیا ہو۔ بعض معاملات میں موت کی سزا کی جو مثالیں ملتی ہیں وہ توہین مذہب اور حرابہ کے مقدمات تھے، نہ کہ صرف مذہب کی تبدیلی کے۔ اسلاف میں سے بہت سے ممتاز اہل علم نے بھی اس نظریے کی حمایت کی ہے کہ ارتداد قابل سزا جرم نہیں ہے۔ امام ابو حنیفہ کے استاد ابراہیم النخعی اور سفیان الثوری جنہیں 'امیر المؤمنین فی الحدیث' کے نام سے جانا جاتا ہے، دونوں کا موقف ہے کہ مرتد کو دوبارہ اسلام کی دعوت دی جائے، لیکن اسے موت کی سزا نہ دی جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ مرتد کو اس وقت تک دعوت دی جاتی رہنی چاہیے جب تک یہ امید ہو کہ وہ دوبارہ اسلام قبول کرلے

---

[26] ایضا

[27] ایضا

گا۔ عبدالوہاب الشعرانی نے بھی امام نخعی اور امام ثوری کے موقف کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ 'مرتد کو مستقل توبہ کی دعوت دی جاتی رہنی چاہیے'۔ [28]

بیسویں صدی کے بہت سے سرکردہ علماء نے بھی ارتداد کی سزا پر نصوص کا از سرنو جائزہ لیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سزائے موت قرآنی تقاضا نہیں ہے اور نہ ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں اس کی کوئی بنیاد ملتی ہے۔ اسماعیل بدوی اور عبدالحکیم حسن العلی کا کہنا ہے کہ امام نخعی کے زمانے تک اسلام کافروں اور مرتدین کی دشمنی کے شر سے محفوظ تھا۔ ان کا موقف ہے کہ امام نخعی نے زیر نظر حدیث کا سیاسی تناظر میں اطلاق کیا اور اس سے مقصود وہ لوگ تھے جو اسلام دشمنی پر اُتر آتے۔ راقم نے اپنی تحقیق کا نتیجہ بھی یہی ہے کہ ایک وقت میں اس حدیث کی قتل کے تحت تشریح ایک عارضی قانون سازی (تشریعِ زمانی) کے تحت تھی جس کا ہدف صرف اسی مرحلے میں درپیش مسئلے کو حل کرنا تھا، اس کی یہ تشریح مستقل نہیں ہے۔ ابتداء یں جب ارتداد کی نام نہاد جنگیں ہوئیں اور قبائلی رہنماؤں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تو تب اس کا حدیث کا مخصوص مرحلے میں یہ اطلاق سامنے آیا تھا۔ خلیفہ مسلمین حضرت ابو بکرؓ نے منکرین کے اس عمل کو ارتداد کے ساتھ تشبیہ دی (حضرت عمر الخطابؓ کا موقف بھی تاریخ کا حصہ ہے کہ انہوں نے اختلاف کیا اور کہا کہ یہ بغاوت ہے، ارتداد نہیں ہے)، لیکن تاریخ، میں حضرت ابو بکرؓ کے نظریے کو شہرت ملی اور مسلم فقہاء نے بھی یہی نقل کیا، اور اس مسئلے میں یہ حدیث فقہ کا حصہ بن گئی۔ [29]

جامعہ الازہر کے سابق صدر محمود شلتوت کا نقطہ نظر یہ تھا:

حدیث "من بدل دينه فاقتلوه" کی شرح میں اہل علم کی مختلف آراء ہیں، جن میں سے بہت سے علماء اس بات پر متفق ہیں کہ حدیث کو مطلق نہیں رکھا جا سکتا، اور یہ کفر بذات خود قتل کی سزا کا موجب نہیں۔

---

28 تقی الدین ابن تیمیہ، الصارم المسلول، 321

29 Kamali, Freedom of Expression in Islam, 93

صبحی المحمسانی[30] اور سلیم العوا[31] بھی اسی طرح کی رائے دیتے ہیں کہ سزائے موت کا اطلاق محض ارتداد کی وجہ سے نہیں کیا جاتا تھا، جب تک کہ اس کے ساتھ سیاسی خیانت یا سنگین غداری (حرابہ) کے اسباب شامل نہ ہوتے۔ لہٰذا سزائے موت کا مقصد حرابہ کی سزا دینا تھا جس میں دشمن کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف سازش اور بغاوت کی جاتی تھی۔

آیت اللہ مطہری نے کا موقف ہے کہ جبر اسلام کی روح سے مطابقت نہیں رکھتا۔ کسی کو بھی اس قسم کا عقیدہ حاصل کرنے پر مجبور کرنا ناممکن ہے جو اسلام کا تقاضا ہے، بالکل ایسے ہی جس طرح کسی چھوٹے بچے کو ریاضی کا کوئی مسئلہ حل کرنے کے لیے مارنا درست نہیں ہے۔ ملائیشیا سے تعلق رکھنے والے قانون کے ممتاز پروفیسر شاد سلیم فاروقی نے بھی یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ: یہ واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے ارتداد ایک گناہ (آخرت میں قابلِ سزا) ہے، اور جرم نہیں ہے (جو دنیا میں سزا کا موجب ہو)۔

پیغامِ عمان (Amman Message)

شیعہ سُنی تقسیم مذہبی آزادی کے حوالے سے دونوں فریقین کے لیے تشویش کا مسئلہ ہے۔ سنی اکثریتی ممالک میں رہنے والے اہلِ تشیع اور شیعہ اکثریتی ممالک میں رہنے والے سنی شہریوں کو بہت سے مثبت اقدامات کے باوجود، اپنے مسالک کی پیروی اور آزادانہ اظہار کے معاملات میں مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ 2004 میں اس مسئلے کے حل کے لیے ایک جامع فکری اقدام کی صورت پیغامِ عُمان کی کاوش سامنے آئی جو خصوصی توجہ کی حقدار ہے۔

پیغامِ عمان نومبر 2004 میں کئی سرکردہ علماء کی سرپرستی میں جاری کیا گیا، جن میں شیخ الازہر سید طنطاوی، شیخ یوسف القرضاوی، آیت اللہ خامنہ ای اور آیت اللہ سیستانی جیسے نام شامل تھے۔ اس

---

30 بیروت میں مقیم ماہر قانون ہیں اور عدالتِ مرافعہ کے صدر رہیں۔

31 مصری مفکر و مصنف ہیں۔ اہل علم کے ہاں اعتدال پسند سمجھے جاتے ہیں۔ سیاستِ شرعیہ پر ان کا کام پوری دنیا میں معتبر و مقبول ہے۔

کے بعد ایک بڑی بین الاقوامی کانفرنس میں معروف علمانے اس کی تائید کی۔ پیغامِ عمان میں مسلمانوں کے مابین رواداری اور اتحاد کا مطالبہ کیا گیا۔ ستمبر 2001 میں جب عراق پر امریکی حملہ ہوا تو اس کے بعد ملک میں گروہی تشدد کی فضا ابھری اور مسلمانوں میں تشدد اور دہشت گردی کے حوالے سے پریشان کن اضافہ سامنے آیا۔ یہ صورتحال اس پیغام کو مرتب کرنے کا محرک بنی۔ پیغامِ عمان کا آغاز مندرجہ ذیل تین سوالات سے ہوا جو اُردن کے شاہ عبداللہ دوم نے تمام اسلامی مکاتبِ فکر کی نمائندگی کرنے والے معزز ممالک کے سب سے سینئر مذہبی علماء کو بھیجے: (1) مسلمان کون ہے؟ (2) کیا کسی شخص کو کافر قرار دینا جائز ہے؟ اور (3) فتویٰ جاری کرنے کا استحقاق کس کو ہے؟

ان علماء کی طرف سے موصول ہونے والے جوابات کی بنیاد پر، بادشاہ نے جولائی 2005 میں عمان میں 50 ممالک سے دنیا کے 200 معروف اسلامی اسکالرز (راقم سمیت) کی ایک بڑی بین الاقوامی اسلامی کانفرنس بلائی۔ علمائے کرام نے متفقہ طور پر درج ذیل تین اہم نکات کی شکل میں کانفرنس کا اعلامیہ جاری کیا:

(1) جو بھی فرد چار سنی مکاتب فکر (حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی)، دو شیعہ مکاتبِ فکر (جعفری، زیدی) اور اباضی اور ظاہری مکاتبِ اسلامیہ میں سے کسی بھی مسلک کو مانتا ہے وہ مسلمان ہے۔

(2) ان مکاتب و مسالک کے درمیان اختلافات اتنے نہیں جتنے زیادہ مشترکات ہیں۔ مذکورہ آٹھ مکاتب کے پیروکار اسلام کے بنیادی اصولوں، ایمان کے چھ ستونوں اور اسلام کے پانچ ارکان پر اتفاق رکھتے ہیں۔

(3) ان مکاتب کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ فتویٰ جاری کرنے کے علمی منہج پر عمل پیرا ہوا جائے جس کے لیے جاری کنندہ کا ہر طرح سے اہل ہونا ضروری ہے۔ کوئی بھی شخص مطلق اجتہاد کرنے اور نیا مذہب بنانے کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور نہ ہی ایسے فتوے جاری کر سکتا ہے جو قبول شدہ اصولوں سے ہٹ کر ہوں۔

پیغامِ عمان کا خلاصہ مسجد الہاشمیہ میں بلند آواز سے پڑھا گیا اور اس بات پر زور دیا گیا کہ مذکورہ

بالا مکاتب کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک دوسرے کے معاملے میں انصاف، اعتدال، باہمی رواداری، ہمدردی اور مکالمے کو یقینی بنایا جائے گا۔

پیغامِ عمان پر دستخط کرنے والے اہل علم نے مسلمانوں کے درمیان اختلافات کو دور کرنے، باہمی احترام کو یقینی بنانے، بھائی چارے کے تعلق کو مضبوط کرنے اور خدا کی محبت میں متحد رہنے پر زور دیا۔ مسلمانوں سے یہ بھی کہا گیا کہ وہ اپنے مابین تنازعات اور بیرونی مداخلت کو نہ پنپنے دیں۔

جولائی 2005 سے جولائی 2006 تک کے ایک سال کے عرصے میں، پیغامِ عمان کے مواد کو چھ دیگر بین الاقوامی اسلامی علمی کانفرنسز میں بھی متفقہ طور پر منظور کیا گیا، اس تحریک کا اختتام جولائی 2006 میں جدہ کی 'بین الاقوامی اسلامک فقہ اکیڈمی' میں منعقدہ کانفرنس میں ہوا۔ مجموعی طور پر دنیا بھر سے 500 سے زائد مسلم علماء نے پیغامِ عمان کی تائید کی۔

ملائیشیا کا تجربہ

ملائیشیا میں اسلام کی ایک خوشگوار و غیر سخت گیر تاریخ رہی ہے کیونکہ اس ملک میں اسلام عسکری فتح کے ذریعے نہیں بلکہ مسلمان صوفیوں اور تاجروں کے ذریعے آیا تھا۔ ابتداء سے ہی ملائیشیا میں مالے کمیونٹی اسلام سے زیادہ قریب رہی جو اکثریت میں ہے۔

1957 کی دہائی میں ملائیشیا کے وفاقی آئین نے اسلام کو ملک کا سرکاری مذہب قرار دیا، لیکن ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ دیگر تمام مذاہب پر امن اور ہم آہنگی کے ساتھ عمل کیا جا سکتا ہے، آرٹیکل 3 (1)۔ آرٹیکل 11 (1-4) کے تحت ہر کسی کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہب کا اظہار کرے، اس پر عمل کرے اور تبلیغ کرے۔ آرٹیکل 11 (4) میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ کوالالمپور اور لابوان[32] کے علاقوں میں مسلمانوں کو دیگر کسی مذہب کی تبلیغ کو محدود یا اسے ممنوع قرار دیا جا سکتا ہے۔ تنظیموں اور جماعتوں کے لیے بھی مذہبی آزادی کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اس طرح، یہ بھی کہ ہر مذہبی گروہ کو اپنے

---

32 مشرقی ملائیشیا کا ایک علاقہ۔

معاملات چلانے، مذہبی مقاصد کے لیے ادارے قائم کرنے اور برقرار رکھنے کا حق حاصل ہے۔

بہت سے غیر مسلموں کو شکایت ہے کہ آرٹیکل 11(4) کے تحت غیر مساوی سلوک کیا جاتا ہے کہ جس کی بناپر مسلمانوں میں کسی دوسرے مذہب کی تبلیغ نہیں کی جاسکتی۔ یہ درحقیقت ایسا ہی ہے، لیکن اس کا ایک پس منظر ہے۔ یہ قانون ملائشین اور غیر مالے آبادی کے درمیان آزادی سے پہلے ہی سے موجود ہے۔ یہ ایک باہمی سمجھوتہ تھا تاکہ اس علاقے کی ملائیشین آبادی کے مذہبی اسلامی رجحان کو استعماری سرکاری حمایت میں چلنے والی مذہبی تنظیموں کے اثرورسوخ سے بچایا جاسکے۔[33]

ملائیشیا کے آئین میں مذہب تبدیل کرنے کے حق کا واضح طور پر ذکر نہیں کیا گیا ہے، اگرچہ ایک غیر مسلم کے لیے اسے آئین کی طرف سے فراہم کردہ مذہبی آزادی کا ایک مضمر حصہ سمجھا جاتا ہے۔ البتہ 1990 کے ایک مقدمے میں عدالت نے فیصلہ دیا تھا کہ اٹھارہ سال سے کم عمر بچے اپنے والدین کے مذہب پر رہیں گے۔

مسلمانوں کے معاملے میں تبدیلیِ مذہب اور ارتداد کئی بڑے مذہبی اور سیاسی مسائل کو جنم دیتا ہے۔ چونکہ اسلام سرکاری مذہب ہے اور آئینی توضیح کے مطابق ملائی فرد کا مسلم عقیدے کا حامل ہونا ضروری ہے، اس لیے ملائیشی شہریوں کے لیے ارتداد عدالتی و قانونی مسائل کا سبب بنتا ہے۔ مذہبی آزادی میں مذہب کو ترک کرنے کی آزادی بھی شامل ہے، یہ تصور مسلمانوں کے حوالے سے قابل قبول نہیں ہے۔[34] ایسا لگتا ہے کہ 1990 کی دہائی سے ملائیشیا میں قدامت پسندانہ نظریات مضبوط ہوئے ہیں۔ ملائیشیا کی کچھ ریاستوں (13 میں سے چھ) نے ارتداد کے نتیجے میں دوبارہ بحالی کے قوانین اور پروگرام متعارف کرائے ہوئے ہیں، یہاں تک کہ تعزیری پابندیاں بھی جو اسلام سے خارج ہونے والے شہریوں کو حراست میں رکھنے اور انہیں دوبارہ تبلیغ و تعلیم دینے کی اجازت دیتی ہیں۔ تاہم، ایسی ریاستیں بھی ہیں جو قرآنی موقف کے مطابق مذہبی آزادی، اور ملائیشیا کے آئین کی رعایت رکھتی ہیں، اور انہوں نے ارتداد کے معاملے میں محض رجسٹریشن کی شرط عائد کی ہوئی

[33] Shad Saleem Faruqi, Constitutional perspectives on Freedom of Religion, 2015, 5

[34] ایضا

ہے۔[35]

ارتداد کے قوانین پیچیدہ آئینی مسائل کو جنم دیتے ہیں اور ایسی بحثوں کو ابھارتے ہیں جو مذہب کو آئین کے خلاف کھڑا کرتی ہیں، اور اس نازک سماجی ڈھانچے کو متاثر کرتی ہیں جس نے 60 سال سے زیادہ عرصے سے تمام ملائیشین باشندوں کو جوڑے رکھا ہے۔ اس مسئلے کے تحت درج ذیل عدالتی تناظرات اور تنازعات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ہائی کورٹ کے مطابق، مذہب سے خارج ہونے کا عمل مذہب کی آزادی کا حصہ نہیں ہے، کم از کم مسلمانوں کے معاملے میں ایسا بالکل نہیں: داؤد ممات بمقابلہ مجلس اگامہ [2002] کے مقدمے میں یہی فیصلہ سنایا گیا۔ جبکہ کامریہ علی بمقابلہ کیراجان نیگیری کیلانتن [2002] کے مقدمہ میں اس کے برعکس فیصلہ دیا گیا جس کے تحت مسلمانوں کو بھی مذہب ترک کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن یہ ترکِ مذہب یکطرفہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک مسلمان جو ارتداد کا اعلان کرنا چاہتا ہے اسے پہلے شرعی عدالت سے تصدیق حاصل کرنے کے لیے رجوع کرنا پڑے گا کہ اس نے مذہب چھوڑ دیا ہے۔ گویا ارتداد کا اعلان کافی نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان کی طرف سے ارتداد کا عمل مرتد اور اس کے مسلمان شریک حیات کے درمیان طلاق کا سبب بنتا ہے، اور اس کے ساتھ بچوں کی پرورش اور سرپرستی کے مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ مسئلہ یہ بھی ہے کہ شرعی عدالتوں میں ارتداد اختیار کرنے والوں کی سماعت ہی نہیں ہوتی۔

ملائیشیا میں حکومت نے شہریوں کے درمیان بین النسلی اور بین مذہبی ہم آہنگی کو فروغ دینے کی غرض سے اہم پالیسیاں شروع کی ہیں۔ 1969 کے نسلی فسادات کے تقریباً فوراً بعد، 'رکونیگارا' دستاویز کو ایک نئے قومی نظریے کے طور پر آگے لایا گیا تھا جس میں کچھ کلیدی اصول بیان کیے گئے تھے۔ ان میں قانون کی حکمرانی، آئین کی بالادستی اور بادشاہ اور ملک سے وفاداری شامل ہیں۔ ہم آہنگی کے لیے اٹھائے گئے دیگر اقدامات میں مخصوص قومی اسکول اور غیر نصابی سرگرمیاں بھی شامل ہیں

---

35 ایضا

جن میں تمام نسلی اور مذہبی پس منظر سے تعلق رکھنے والے ملائیشیائی باشندوں کی شمولیت کو یقینی بنایا گیا۔ 2006 میں حکومتی کابینہ نے نسلی تعلقات سے متعلق یونیورسٹی کی ایک متنازعہ کتاب کو تعلیمی سرکل سے خارج کرنے کا فیصلہ کیا تھا جس پر بہت سے لوگوں نے تنقید کی تھی کہ وہ غیر مسلموں کے لیے غیر حساس ہے۔

خلاصہ

ایک عقیدے اور تہذیب کے طور پر، اسلام نے مذہبی آزادی اور دوسرے مذاہب کے ساتھ بقائے باہمی کے اصول کو تسلیم کی ہے۔ قرآن اور سنت دونوں میں تمام مسلمانوں سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ نسلی، سیاسی اور معاشی پس منظر سے قطع نظر ان اصولوں کی پیروی کریں گے۔ فکری لحاظ سے مذہبی آزادی اسلام میں ایک ٹھوس تصور ہے، آج مسلمانوں کے لیے چیلنج یہ ہے کہ آزادی کے اس نظریے اور عمل کے درمیان پائے جانے والے فرق کو ختم کیا جائے۔ مسلمانوں کے لیے چیلنج حقیقی مذہبی تعلیمات واحکامات تک رسائی نہیں ہے، بلکہ ان تعلیمات کو عملی طور پہ مختلف مسلم وغیر مسلم طبقات کے ساتھ تعلقات کی استواری میں منطبق کرنا ایک بڑا چیلنج ہے۔

جہاں تک مذہب اور ریاست کے درمیان تعلق کی بات ہے تو اسلامی تناظر میں یہ کافی پیچیدہ مسئلہ ہے۔ تاہم، قرآن اور سنت میں کوئی واضح حکم نہیں ہے کہ مذہب اور ریاست کا ایک دوسرے سے کیا تعلق ہونا چاہیے۔ قرآن میں تو اس موضوع پر کوئی اشارہ نہیں دیا گیا، اس بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات پیش کی جاتی ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ: 'أنتم أعلم بامور دنياكم' (تم اپنے دنیاوی معاملات میں زیادہ بہتر جانتے ہو۔)

عصر حاضر کے نظریات اور لٹریچر مذہبی آزادی کے تحفظ اور فروغ کے لیے متعدد شعبوں میں عملی اقدامات کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ اس ضمن میں کچھ نکات پیش ہیں:

(ا) انسانی حقوق کا نقطہ نظر: اس کے تحت خلاف ورزیوں کی نگرانی اور رپورٹنگ کی جائے اور ذمہ دار لوگوں کا محاسبہ کیا جائے۔

(۲) تنازعات کے حل کا نقطہ نظر: مذہبی آزادی کی خلاف ورزیوں سے بچنے کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار کرنا اور حل تلاش کرنا۔

(۳) بین المذاہب ہم آہنگی کا نظر: مذہب کیا ہے اور کیا نہیں ہے، اس حوالے سے مستند معلومات اور تعلیم پر زور دیا جائے۔

ایک ہمہ گیر نقطہ نظر عملی لحاظ سے بھی ایک بڑے فریم ورک کا تقاضا کرتا ہے جس میں ہر شعبہ و فریق اپنی سطح پہ خدمات انجام دے۔ مذہب اور عقیدے کی آزادی پر اقوام متحدہ کے خصوصی نمائندے نے زور دیا ہے کہ بین الاقوامی برادری کو مذہب اور عقیدے کی آزادی کے فروغ میں کردار ادا کرنا چاہیے۔ مذہبی آزادی کی خلاف ورزی کے خلاف آواز اٹھانا بھی ایک اہم پہلو ہے اور یہ مزید خلاف ورزیوں کو روکنے کا ایک طاقتور ذریعہ ہو سکتا ہے۔ یہ کام مختلف طریقوں سے کیا جا سکتا ہے جن میں تقاریر، سیمینارز کا انعقاد اور تقریبات میں شرکت، اخباری مضامین لکھنا، مختلف پس منظر کے حامل طبقات کو جمع کر کے ان کی میزبانی کرنا، خلاف ورزیوں کے متاثرین کی عیادت کرنا شامل ہیں۔

مسلم مفکرین اور علماء کو چاہیے کہ وہ اپنی روایات کی گہرائی میں جا کر میں کھوج لگائیں تا کہ اسلاف کی بصیرت کو از سر نو دریافت کیا جا سکے۔ انہیں یہ جاننے کی بھی ضرورت ہے کہ اسلام کے ساتھ وفادار رہتے ہوئے مذہبی آزادی کی عصری تفہیم کی حمایت کرنے کے لیے اسلاف کی روایات سے کونسے سبق حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

پیغامِ عمان اکیسویں صدی کے سرکردہ اسلامی رہنماؤں کے قابل اعتماد اتفاق رائے کی نمائندگی کرتا ہے۔ سنی شیعہ تفریق کے حوالے سے مسلم اتحاد کے اس پیغام کا حقیقی طور پر احترام کیا جانا چاہیے اور اس پر عمل کو یقینی بنانا چاہیے۔

ملائیشیا میں کئی حوالوں سے دباؤ اور پیچیدگیوں کے باجود مجموعی طور پہ یہ ملک بقائے باہمی اور عوام میں ایک دوسرے کے لیے احترام کے جذبات پیدا کرنے میں کافی حد تک کامیاب رہا ہے۔ ملک

میں امن، جمہوریت اور معاشی خوشحالی دیکھنے کو ملتی ہے۔ تاہم یہ امکانات موجود ہیں کہ تناؤ کا ماحول جنم لے۔ اس لیے ابلاغ کے بہتر وسائل کا استعمال کرتے ہوئے لوگوں میں مزید آگاہی پیدا کرنے اور اشتعال انگیزی کے خلاف ضبط نفس کی تربیت و ماحول کی آبیاری جاری رکھنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔

انسانی حقوق اور مذہبی آزادی کا اسلامی اعلامیہ

محبوب احمد غازی

عصرحاضر کی جدید قومی ریاستیں انسانی حقوق کے حوالے سے کئی بین الاقوامی تنظیموں کے ساتھ معاہدوں میں بندھی ہیں۔ ان میں سے ایک اعلامیہ اقوام متحدہ کا بھی ہے جسے تمام ممبر ممالک تسلیم کرتے ہیں۔تاہم مسلم ممالک میں چند حوالوں سے ایسے معاہدوں اور اعلامیوں پر خدشات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس لیے مسلم ممالک نے نوے کی دہائی میں ایک اعلامیہ منظور کیا تھا جو بہت اہمیت کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ ذیل میں اس کی چیدہ چیدہ دفعات کی تلخیص پیش کی جاتی ہے۔ مضمون کے مترجم محبوب احمد غازی ادارہ 'انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی' میں بطور ریسرچر اور سینئر منتظم خدمات انجام دیتے ہیں۔

5 اگست 1990ء کو قاہرہ میں مسلم ممالک کے وزرائے خارجہ کی انیسویں اسلامک کانفرنس میں ایک اعلامیہ منظور کیا گیا جو انسانی حقوق سے متعلق تھا۔ یہ اعلامیہ اس لیے اہمیت کا حامل ہے کہ اسے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں وضع کیا گیا ہے اور اس کی حمایت تمام مسلم ممالک کے نمائندگان نے کی۔ ویسے تو انسانی حقوق کے مختلف اعلامیے وضع کیے جا چکے ہیں جن میں اقوام متحدہ کا اعلامیہ سرفہرت ہے اور جس پر عمل کرنے کے لیے تمام رکن ممالک پابند ہیں۔ تاہم دیگر اعلامیوں میں بعض شقیں ایسی ہیں جو مغربی تصورِ انسان کی بنیاد پر مرتب کی گئی ہیں اس لیے مسلم ممالک میں چند امور سے متعلق ایک گونہ پس و پیش بھی موجود ہے۔ اس ضمن ضرورت تھی کہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بھی ایک اعلامیہ وضع کیا جائے جسے دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ مزید یہ کہ اس اعلامیے کے نکات سے اسلام کے تصورِ انسان و سماج واضح ہو کر سامنے آ جاتا ہے جس سے بالعموم آزادی اور بالخصوص مذہبی آزادی سے متعلق چیزیں بھی سامنے آتی ہیں۔ ذیل میں اس اعلامیہ کی نمایاں شقیں پیش کی جاتی ہیں:

اعلامیہ

تنظیم اسلامی کانفرنس (OIC) کے ممبر ممالک!

امت اسلامیہ کے تاریخی و تہذیبی کردار کی پر زور تائید جسے اللہ تبارک وتعالی نے بہترین امت بنایا ہے اور اس امت نے انسانیت کو عالمی اور متوازن تہذیب سے روشناس کرایا جس تہذیب کی بنیاد دنیاوی اور اخروی زندگی کے مابین یقین اور علم پر مشتمل ہے اور اس امت نے مختلف رسوم ورواج اور نظریات کے مابین الجھے اور پریشان حال لوگوں کی صحیح رہنمائی کی اور اس مادہ پرستانہ تہذیب کے گوناگوں مسائل کا حل پیش کیا۔

انسانی حقوق کو یقینی بنانے کے لئے بنی نوع انسان کی کوششوں میں تعاون کرنے کی دلچسپی اور کسی بھی آدمی کو استحصال اور تکالیف سے محفوظ رکھنا اور شریعت اسلامیہ کے مطابق آدمی کی آزادی و حق اور باعزت زندگی کو یقینی بنانا۔

مادہ پرستانہ علوم و تہذیب کے ترقی یافتہ دور میں پہنچی ہوئی انسانیت اور ضلالت و گمراہی کے اندوہناک وادی میں بھٹکے ہوئے لوگوں کی صحیح رہنمائی اور انہیں ان کے حقوق کے صحیح استعمال کے لیے بیداری کو یقینی بنانا۔

اور اس بات کا یقین کرنا کہ مذہب اسلام میں دنیاوی آزادی اور بنیادی حقوق اس کا جزء لا نیفک ہے، اور کسی کو اس بات کا حق حاصل نہیں ہے کہ اسلام کے بنیادی اصولوں کو مکمل طور پر خارج کردے یا اس کی خلاف ورزی کرے یا احکام ربانی کے ان پختہ اصولوں کو نظر انداز کردے جن کا انکشاف خدا کی آخری کتاب میں کیا گیا ہے، اور خدا نے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ اپنے آخری اور مکمل پیغام کو بھیجا تاکہ انسانیت عبادات کی بجاآوری کے لئے اپنے آپ کو تیار کرے، ان احکامات اور طریقوں کے خلاف کرنا بہت بڑا گناہ ہے، امت کا ہر ہر فرد اور مجموعی امت ان احکامات پر عمل درآمد کر کے اپنی نجات کو یقینی بنائے۔

شق:۱

الف- پوری انسانیت ایک خاندان کی مانند ہے جس کے ارکان خدا کی اطاعت اور آدم کی اولاد ہونے کی بنیاد پر ایک دوسرے سے بندھے ہوئے ہیں، معاشرہ کا ہر شخص بنیادی انسانی اعزاز، فرائض اور ذمہ داری کے اعتبار سے بغیر کسی رنگ و نسل، زبان و جنسیت، مذہبی عقائد، سیاسی الحاق، سماجی مرتبہ اور دیگر نظریات کی بنیاد پر بغیر کسی امتیاز و تفریق کے برابر ہیں، اسلام انسانیت کو عزت و شرف کے درجہ کمال پر پہنچانے کی ضمانت لیتا ہے۔

ب- تمام انسانیت خدا کی رعایا ہے، خدا کے نزدیک اس کے بندوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے جو انسانیت کو فائدہ پہنچائے، اور کسی بھی انسان کو صرف تقوی اور اعمال حسنہ کی بنیاد پر فوقیت حاصل ہوگی۔

شق:۲

الف- زندگی خدا کا عطیہ ہے اور تمام انسانیت کو زندگی کے حقوق کی ضمانت حاصل ہے، ہر فرد واحد و معاشرہ اور ریاست کی ذمہ داری ہے کہ ان کے حقوق کی پامالی سے حفاظت کرے، بغیر کسی شرعی جواز کے کسی کی جان لینا سخت ممنوع ہے۔

ب- انسانیت کو کچلنے اور نسل کشی کے لئے کسی بھی طرح کے وسائل کو اختیار کرنا قطعاً ممنوع ہے۔

ج- خدائی منشا کے مطابق حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے انسانی زندگی کا تحفظ شریعت کے تناظر میں ہر شخص کی ذمہ داری ہے۔

د- جسمانی اذیت سے تحفظ ایک یقینی حق ہے، یہ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ اس تحفظ کو یقینی بنائے، اور بغیر کسی شرعی دلیل کے ان قوانین کی عہد شکنی کرنا سخت ممنوع ہے۔

شق:۳

الف- جنگ اور طاقت کے استعمال کے وقت کسی بھی بوڑھے شخص، عورت، بچے اور ان لوگوں کو جو جنگ میں حصہ نہ لیں انہیں قتل کرنا سخت جرم ہے۔ مجروحین اور بیمار اشخاص کو طبّی سہولیات حاصل ہوں گی، جنگی قیدیوں کو کھانا، کپڑا اور رہنے کی جگہ بھی مہیا کرائی جائے گی، مردہ شخص کے جسم کا مثلہ کرنا سخت ممنوع ہے، جنگی قیدیوں کا تبادلہ اور جنگ کی وجہ سے بکھرے ہوئے خاندانوں کے لئے ملاقات کا موقع فراہم کرنا ایک اہم ذمہ داری ہے۔

ب- درختوں کو کاٹنا، کھیتیوں اور مویشیوں کو نقصان پہنچانا، دشمن کے علاقے میں شہری بلڈنگ و عمارت کو بم یا دیگر آلات کے ذریعہ تباہ و برباد کرنا سخت ممنوع ہے۔

شق:۴

تمام انسانوں کو زندگی میں اور موت کے بعد ان کے ناموں کا احترام اور ان کی عزت کے تحفظ کا حق حاصل ہے، معاشرہ اور ریاست ان کی لاش اور جائے تدفین کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔

شق:۵

الف- خاندان معاشرہ کی بنیاد ہے اور شادی خاندان کو تشکیل دینے کا ایک عملی نمونہ ہے۔ ہر مرد و عورت کو شادی کرنے کا حق حاصل ہے اور انہیں رنگ و نسل و قومیت کی بنیاد پر ان حقوق سے متمتع ہونے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

ب- معاشرہ اور ریاست کی ذمہ داری ہے کہ شادی میں آنے والی تمام رکاوٹ کو دور کر کے شادی کی کاروائی کو آسان بنائے اور خاندان کے تحفظ و بقاو خوشحالی کو یقینی بنائے۔

شق:٦

الف- انسانی عت و شرف میں عورت مرد کے برابر ہے اور اسے زندگی سے لطف اندوز

ہونے اور اپنی ذمہ داری کو بروئے کار لانے کا حق حاصل ہے، وہ اپنی شہری انفرادیت اور معاشی خود مختاری اور اپنے نام و نسب کا مکمل حق رکھتی ہے۔

ب- شوہر فیملی کی خوشحالی اور کفالت کا ذمہ دار ہے۔

شق: ۷

الف- پیدائش کے وقت ہی سے ہر بچہ کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ والدین، معاشرہ اور ریاست بچے کی مناسب دیکھ بھال، تعلیم، آسائش و آرام، حفظان صحت اور اخلاقیات پر مکمل توجہ دیں۔ جنین اور ماں کو خاص تحفظ و توجہ کا حق حاصل ہوگا۔

ب- والدین یا ولی کو اپنی پسند کے مطابق بچے کے تعلیمی کورس کے انتخاب کا حق حاصل ہے۔ اس انتخاب میں والدین کو بچے کا شوق، مستقبل، اخلاقی اقدار اور شریعت کے اصولوں کو ملحوظ رکھنا ہوگا۔

شق: ۸

الف- ہر انسان کو اس کے فرائض اور ذمہ داری کے تئیں جو قانونی حق دیا گیا ہے اسے اختیار کرنے کا پورا پورا قانونی صلاحیت کے مطابق لطف اندوز ہونے کا حق حاصل ہے اور اگر اس کی یہ صلاحیت ختم ہو جائے یا کمزور ہو جائے تو والدین کو اس کی نمائندگی کا حق حاصل ہوگا۔

شق: ۱۰

الف- طلب علم فرض ایک اہم ذمہ داری ہے، اور معاشرہ و ریاست کی ذمہ داری ہے کہ ذمہ داری ہے کہ وہ تعلیمی حصول کے ذرائع کو مہیا کرائیں، ریاست مطلوبہ تعلیمی طریقہ و وسائل کو مہیا کرانے کی یقین دہانی کرے اور معاشرہ کے رجحان کے مطابق تعلیمی تنوع کی ضمانت دے، اور انسانیت کی فلاح و بہبود کی خاطر لوگوں کو اس لائق بنائے کہ وہ مذہب اسلام اور حقیقت کی دنیا سے روشناس ہو

سکیں۔

ب۔ تمام انسانوں کو مختلف اداروں سے دنیاوی اور دینی تعلیم کے حصول کا حق حاصل ہے؛ تاکہ وہ اس کے حصول کے بعد مناسب انداز میں اپنی شخصیت کو پروان چڑھا سکیں اور اس طرح وہ خدا پر اپنے یقین کو مضبوط کر کے اپنے ہر طرح کے حقوق و فرائض و ذمہ داری کا دفاع کر سکتے ہیں۔

شق: ۱۱

یقیناً اسلام ایک صحیح دین فطرت ہے، کسی بھی آدمی کی مجبوری کا فائدہ اٹھانا، غربت کی بنیاد پر اس کا استحصال کرنا اور اگر کوئی اسے دوسرا مذہب قبول کرنے یا الحاد پر مجبور کرے تو اسے نظر انداز کرنا سخت ممنوع ہے۔

شق: ۱۲

ب۔ کسی بھی طرح کا استعمار جو کہ غلامی کی مذموم شکل ہے سخت ممنوع ہے، استعمار یہ سے پریشان حال لوگوں کو اپنی آزادی اور قضیہ میں خود مختاری کا مکمل حق حاصل ہے، یہ تمام لوگوں اور ریاست کی ذمہ داری ہے کہ استعماریت سے جوجھ رہے لوگوں کی کوششوں میں مکمل تعاون کرے اور ہر طرح کے استعمار کا خاتمہ کرے اور ہر ریاست و فرد کو اپنی شناخت، دولت اور قدرتی وسائل کو تصرف میں لانے کا مکمل حق حاصل ہے۔

شق: ۱۳

ہر آدمی کو شرعی دائرہ کے مطابق کسی بھی جگہ آنے جانے، یا پھر ملک یا بیرون ملک اپنی رہائش کی جگہ کا انتخاب کرنے کا مکمل اختیار و حق حاصل ہے، اور اگر کسی شخص کو کسی بنیاد پر بے جا آزار پہنچایا جا رہا ہو تو اسے نقل مکانی کا حق حاصل ہے، جس ملک میں مہاجرین پناہ لیں گے اس ملک کی حکومت مہاجروں کے جان و مال کے تحفظ کی ضامن ہو گی تا آنکہ مہاجرین اپنے وطن پہنچ جائیں۔

شق: ۱۴

ہر باصلاحیت و بے عیب شخص کام کا رکھتا ہے جس کی ذمہ داری معاشرہ وریاست کے سر جاتی ہے، ہر شخص کو اپنی پسند و خواہش کے مطابق کام کے اختیار کا حق حاصل ہے، ملازم کو ہر طرح کے تحفظ و امان اور سماجی ضمانت حاصل ہے، ملازم کو اس کی صلاحیت کے بقدر ہی کام دیا جائے گا، اس کا استحصال نہیں کیا جائے گا، اور نہ ہی اسے کسی ایسے کام پر مجبور کیا جائے گا جو کہ اس کے بس میں نہ ہو، ملازم کو بغیر کسی مرو عورت کی تفریق کے وقت متعینہ پر انہیں ان کے کام کی اجرت دی جائے گی، اسی طرح انہیں رعایتی رقم، چھٹیاں اور اپنے کام کے مطابق ترقی بھی حاصل ہو گی، ساتھ ساتھ اس کا بھی مطالبہ ہو گا کہ وہ اپنا کام یکسوئی اور انہماک اور نہایت محتاط طریقہ سے کریں، اگر ملازمین یا مزدور کسی بات پر ناراض ہو جائیں تو ریاست کی ذمہ داری ہے کہ اس جھگڑے کو اپنی مداخلت سے حل کرے، شکوہ و شکایت کو ختم کر کے حق بات کو واضح کرے اور بغیر کسی تعصب کے انصاف نافذ کرے۔

شق: ۱۵

ہر فرد کو بغیر کسی تسلط، فریب کاری اور بغیر کسی دوسرے شخص کو نقصان پہنچائے جائز و درست دولت و ثروت کمانے کا حق حاصل ہے، اور ربا ہر حالت میں ممنوع ہے۔

شق: ۱۶

ہر شخص کو قانونی اور جائز طریقہ سے خود کو یہ کسی دوسرے شخص کو یا معاشرہ کو نقصان پہنچائے بغیر اپنی ذاتی ملکیت حاصل کرنے کا حق حاصل ہے اور اس ذاتی ملکیت پر اسے مکمل استحقاق حاصل ہے، ریاست کو عوامی فوائد کے علاوہ اور بروقت مناسب عوض کی ادائیگی کے علاوہ کسی شخص کی املاک کو زبردستی لینے کی قطعی اجازت نہیں ہے، قانون کے متعین کردہ دفعات کے علاوہ کسی کے املاک کو ضبط کرنا سخت ممنوع ہے۔

شق:۱۷

ہر شخص کو اپنے علم و ادب و فن کاری اور میکانیاتی علوم کے فروغ سے لطف اندوز ہونے کا حق حاصل ہے اور انہیں اپنی صلاحیتوں کے مطابق بروئے کار لانے اور وسائل کے استعمال کا حق حاصل ہے اور انہیں اس طرح کے وسائل مہیا کرانا شرعی اصول کے متضاد بھی نہیں ہے۔

شق:۱۸

الف- ہر شخص کو ایک صاف ستھری اور پاکیزہ فضا جو کہبرائی اور اخلاقی گراوٹ سے اک ہو اور اس میں سانس لینے و زندگی گزارے کا حق حاصل ہے، ایسی فضا جو اس کی ذاتی ترقی کو پروان چڑھائے اور اس طرح کے حقوق کو مہیا کرانا معاشرہ اور ریاست کی ذمہ داری ہے۔

ب- ہر شخص کو طبّی و سماجی توجہ کا حق حاصل ہے، معاشرہ اور ریاست کی ذمہ داری ہے کہ لوگوں کو ان کی خصوصیات کے مطابق اپنے موجودہ مسائل کو مد نظر رکھتے ہوئے انہیں یہ سہولیات مہیا کرائے۔

ج- ریاست ہر شخص کی ذاتی زندگی کے حق کو یقینی بنائے اور وہ لوگ جو اپچی کفالت خود نہ کر سکتے ہوں ان کے لئے کپڑا، مکان، کھانا، تعلیم، طبّی سہولیات اور دیگر بنیادی ضرورتوں کے حصول کے طریقوں کو ممکن بنائے۔

شق:۱۹

الف- ہر شخص کو اس کے مذہب، اس کی خود مختاری، عزت و شرف اور جائیداد کا بذات خود تحفظ کا حق حاصل ہے۔

ب- ہر شخص کو اپنے تعلقات و جائیداد کے بارے میں اپنے گھر میں، اپنی فیملی کے بیچ، اپنے ذاتی معاملات کو بیرونی مداخلت کے بغیر حل کرنے کا مکمل حق حاصل ہے، اس کے خلاف تانک

جھانک کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے اور نہ ہی اسے کڑی نگرانی میں رکھنے یا اس کے نام پر بٹہ لگانے کی کسی کو اجازت ہے، ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ دوسرے اشخاص کو اس کے ذاتی معاملات میں بغیر کسی واقفیت کے دخل اندازی سے روکے۔

ج- ہر شخص کا ذاتی گھر ہر حالت میں قابل احترام ہے، گھر کے مکین کی اجازت کے بغیر کسی بھی غیر قانونی طریقہ سے کسی کو گھر میں گھسنے کی اجازت نہیں ہوگی اور نہ ہی اس گھر کو منہدم کیا جائے گا، نہ ہی قرقی کی جائے گی اور نہ ہی مکین کو بے دخل کیا جائے گا۔

شق: ۲۰

الف- حاکم و محکوم میں تفریق کے بغیر ہر فرد قانون کی نظر میں برابر ہے۔

ب- ہر شخص کو انصاف کے لئے رجوع کرنے کا حق حاصل ہے۔

ج- ہر شخص اپنی ذمہ داری کے تئیں جوابدہ ہے۔

د- شریعت کی بیان کردہ تفصیلات کے علاوہ کوئی بھی چیز جرم یا سزا نہیں سمجھی جائے گی۔

ج- جب تک کسی شخص کا جرم منصفانہ عدالتی کاروائی سے ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک اسے محصوم سمجھا جائے گا اور اسے ہر طرح کے دفاع کا حق حاصل ہوگا۔

شق: ۲۱

بغیر کسی قانونی وجوہات کے کسی شخص کو قید کرنے یا اس کی آزادی کو سلب کرنے یا اسے جلاوطن کرنے اور سزا دینے کا کسی کو حق حاصل نہیں ہے، اور نہ ہی اس پر جسمانی، نفسیاتی تشدد اور تذلیل روا رکھنے کی اجازت ہے۔ اس کی جان اور صحت کو خطرے میں ڈال کر بغیر اس کی اجازت کے اس پر طبّی اور سائنٹفک تجربات کنے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔

شق: ۲۲

کسی بھی مقصد اور ارادہ کی خاطر کسی شخص کو یرغمال بنانا سخت ممنوع ہے۔

شق: ۲۳

الف- ہر شخص کو شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے آزادانہ طور پر اپنی رائے اور سوچ کے اظہار کا حق حاصل ہے۔

ب- بلاشبہ خبریں معاشرہ کے لیے انتہائی اہم ہیں مگر ان کا غلط استعمال کسی کے تقدس کو پامال کرنے کے لیے یا نبیوں کی بے حرمتی کرنے کے لئے کرنا ایک واضح خلاف ورزی ہے، ان کا غلط استعمال اخلاقی اقدار کی بنیادوں کو کھوکھلا اور معاشرہ کو نقصان اور اجزاء میں تقسیم کر دیتا ہے۔

ج- کسی بھی شخص کو قومیت یا عقائد کی بنیاد پر نفرت پھیلانے یا پھر کسی بھی طرح کے نسلی اختلافات کو بھڑکانے اور شہہ دینے کی قطعاً اجازت نہیں ہے۔

شق: ۲۴

ہر شخص کو بالواسطہ یا بلاواسطہ اپنے ملک کے عوامی معاملات میں نظم و ترتیب میں حصہ لینے کا حق حال ہے، اور عوامی انتظامی کاروائی کو شریعت کے مطابق یقینی بنانے میں اسے مکمل اختیار حاصل ہے۔

مغرب، بین الاقوامی تنظیمیں اور مذہبی آزادی

مغرب میں مذہبی آزادی اور آزادیِ اظہار: توازن کی تلاش

نور حیات خان، غیاث احمد

عام طور پہ مذہبی آزادی کی جانچ کے لیے جو پیمانہ استعمال کیا جاتا ہے وہ آزادیِ اظہار کا ہے کہ کوئی فرد کس حد تک اپنے عقیدے اور ضمیر کے مطابق قول و عمل میں آزاد و خودمختار ہے۔ مغرب میں آزادیِ اظہار کو جس حد تک اہمیت حاصل ہے اس پر بحث چلتی رہتی ہے، کیونکہ اس کے زمرے میں بعض اوقات مذہبی تقدسات پر انگلیاں بھی اٹھائی جاتی ہیں، جبکہ اسلامی اور مشرقی ثقافت میں آزادیِ اظہار اس حوالے سے حدودوقیود کا پابند ہے۔زیرنظر مضمون میں اسی پہلو پر بات کرتے ہوئے واضح کیا گیا ہے کہ اس قدر کو مکمل طور پہ غیر مقید نہیں چھوڑا جاسکتا، بلکہ ایک متوازن و ہم آہنگ سماج کی تشکیل کے لیے ضروری ہے کہ احترام و اعتدال کو یقینی بنایا جائے۔ مضمون نگار بالترتیب نمل یونیورسٹی اور جی سی یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔

آزادیِ اظہار کے اصول کیا ہیں؟

اکیسویں صدی کا آغاز جن واقعات سے ہوا، انھوں نے اسلام اور مغرب کی تاریخی آویزش کو ایک نئی شکل دے دی اور ہر دو فریق جن خدشات، خطرات اور تنازعات کا شکار ہوئے، وہ عالمی نقشے پر بعض بنیادی تبدیلیوں کا سبب بن گئے۔ مغرب اور مشرق کے مابین اختلافات کے اسباب جہاں عصری سیاسی و معاشی امور سے جڑے مفادات ہیں، وہیں سب سے سے پہلا اور مرکزی سبب تہذیبی ہے، یہی وجہ ہے کہ بیسویں صدی کا اختتام جن فکری مباحث پہ ہوا وہ 'تہذیبوں کا تصادم' کے عنوان کے تحت تھیں۔اس میں بلاشبہ مذہب کا واضح عمل دخل ہے کہ اسلامی تہذیب میں دینی اخلاقیات کو الگ نہیں کیا جاسکتا۔

اس حوالے سے سب سے بنیادی چیز آزادیِ اظہار رائے ہے۔ یہ قدر اور اس کے تقاضے ایسے ہیں جن پر اب تک اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس قدر کے مظاہر کی زد میں

مذاہب بھی آجاتے ہیں۔ لہذا اس پر سوال اٹھتا ہے کہ آزادی اظہار اور مذہبی آزادیوں کی حدود اور ان کے اصول کیا ہیں۔ دیکھا جائے تو مغرب نے اگرچہ مذہب کو اجتماعی زندگی کے اظہاریوں سے کافی الگ کر دیا ہے لیکن اس پر کوئی قدغن کا اعلان نہیں کیا، بلکہ مذہبی آزادیوں کے تحفظ کو یقینی بنانے کی بات کی ہے۔

مغرب میں آزادیِ اظہار کا ارتقاء

جب یورپ میں کلیسا کی حکمرانی تھی تو آزادی اظہارِ رائے کے بہت برے نتائج نکلا کرتے تھے، جس سائنس کی بدولت مغرب نے ترقی کی ہے، اس راستے میں گلیلیو جیسے عظیم بڑے بڑے دماغوں کی قربانیاں شامل ہیں اور ان کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ صدیوں کا 'وچ ہنٹ' کلیسا کے مظالم کی ایک چھوٹی سی مثال ہے، جس نے مغربی اقوام کو آزادی اظہار پر پابندی اور ظلم و جبر کو ایک ہی سکے کے دو رخ سمجھنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اسی لیے انہوں نے اپنے دساتیر، قوانین اور آئینوں میں آزادی اظہارِ رائے کو بنیادی حیثیت دی ہے۔ قیام امریکہ کے بنیادی مقاصد میں کہا گیا ہے کہ یہ وطن یورپ سے بھاگ کر آنے والے ان مسافروں 'پلگرمز' کی بدولت وجود میں آیا جو کلیسا کے ظلم و ستم سے تنگ آکر نئی دنیا میں پناہ لینے آئے تھے۔ لہذا یہ قرار پایا کہ یہاں انہیں تحریر و تقریر، مذہب اور عقیدے کی مکمل آزادی ہو گی۔ یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ آزادی اظہارِ رائے کا تعلق مغربی تہذیب کے ارتقا سے ہے، جو اس کو اس معاشرت کا بنیادی عنصر بناتی ہے۔

آزادیِ اظہار مغربی دساتیر کا بنیادی وصف

مغربی دنیا کے دساتیر اور کوڈوں میں آزادی اظہار رائے کا بہت ہی واضح طور پر ذکر موجود ہے۔ اور اس کی ایک خوبی اور ترقی کا راز بھی ہے۔ اس کی وضاحت سے نہ صرف باہمی عزت، محبت کا ماحول بنتا ہے، بلکہ امن و سلامتی بھی میسر آتی ہے۔ اس لیے ان ممالک میں آزادی اظہار رائے کی حدود کے تعین کا بھی تذکرہ موجود ہے۔ مثلاً: افریقی چارٹر برائے انسانی اور عوامی حقوق آرٹیکل 9،

آسیان ڈیکلریشن برائے انسانی حقوق آرٹیکل 23[1] یورپیئن کنونشن برائے انسانی حقوق آرٹیکل10، ساؤتھ افریقن آئین سیکشن 16، کینیڈین کریمینل کوڈ سیکشن 319، کریمینل کوڈ آف نیدرز لینڈ آرٹیکل 137، بلجئیم اینٹی ریس ازم لاء[2] وغیرہ جتنے بھی دساتیر کے آزادی سے متعلق دفعات اور سیکشنز ہیں، سب میں کسی کے ساتھ مذہب، جنس، یا رنگ وثقافت، نسل وغیرہ کی بنیاد پر، نفرت کو ہوا دینا، ہتک آمیز رویہ رکھنا ممنوع ہے اور اسے جرم قرار دی گیا ہے۔

انسانی حقوق کا عالمی منشور اقوامِ متحدہ نے 1948ء میں منظور کیا۔ دیگر باتوں کے علاوہ موضوع زیر بحث سے متعلق اس میں درج ذیل حقوق کا تذکرہ ملتا ہے:

تمام انسان آزاد ہیں اور حقوق وعزّت کے لحاظ سے برابری رکھتے ہیں۔ تمام انسانوں کے لئے قطع نظر مذہب، نسل، جنس، سیاسی سوچ اور قومیّت کے ایک جیسے انسانی حقوق ہیں۔ سب انسان آزادی اور ذاتی تحفظ کا حق رکھتے ہیں۔ ہر قسم کا تشدّد ممنوع ہے۔ تمام انسان تحفظ کا قانونی حق رکھتے ہیں۔

علاوہ ازیں آزادی کی تحدید کا ذکر دفعہ 29-2 میں یوں ملتا ہے:

"اپنی آزادی اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہوگا، جو دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرانے اور ان کا احترام کرانے کی غرض سے یا جمہوری نظام میں اخلاق، امن عامہ اور عام فلاح و بہبود کے مناسب لوازمات کو پورا کرنے کے لئے قانون کی طرف سے عائد کئے گئے ہیں" ۔[3]

آزادی اظہار رائے یا 'فریڈم آف اسپیچ اینڈ ایکسپریشن' اسلامی والہامی اور جدید مغربی دساتیر کی روشنی میں بنیادی انسانی حقوق میں سے ایک ہے۔ اور جن کے لیے قومی و بین الاقوامی تنظیمیں بنی ہوئی

---

[1] European Court of Human Rights," European Convention on Human Rights, Article 10
[2] Belgium: Discrimination on the basis of race and national origin in the provision of goods," http://adapt.it/adapt-indice-a-z/wp
[3] http://www.unhchr.ch/udhr/lang/urd.htm

ہیں اور عرصہ دراز سے اس کے حصول کے لیے دنیا میں کوشاں ہیں۔ تاہم اس بنیادی انسانی حق (آزادی رائے) کی پاسداری کے لیے یہ تنظیمیں عام طور پہ جس نقطہ نظر سے کام کرتی یا آزادی اظہار کے جو معیار قائم کرتی ہیں وہ تقریبا مغربی تصورات پر مبنی ہیں۔ اس میں جداگانہ طور پہ دیگر اقوام کے ثقافتی یا تہذیبی و مذہبی مسائل اور ان کی حساسیتوں کو مد نظر نہیں رکھا جاتا جس سے پیچیدگیاں جنم لیتی ہیں۔

عہدِ حاضر میں مذہبی رواداری کی کوششوں کی تاریخ

اسلام اور مسیحیت کے درمیان گفتگو کا خیال 1923 میں پیدا ہوا۔ حکومت فرانس نے اپنے کچھ نمائندوں کو الازھر یونیورسٹی، مصر بھیجا اور یہ تجویز پیش کی کہ ابراہیمی ادیان کے درمیان وحدت واتحاد قائم کرنے کے لیے ایک عالمی کانفرنس تشکیل دی جائے۔ اس کے بعد 1933 میں پیرس کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا جس میں ترکی، اسپین، پولینڈ، اٹلی، امریکا، سوئٹزرلینڈ برطانیہ اور فرانس کی یونیورسٹیوں سے وابستہ مبلغین اور ماہرینِ علومِ شرقیہ نے شرکت کی تھی۔ دوسری عالمی جنگ سے قبل 1936 میں ایک ادیان کانفرنس منعقد ہوئی اس کے بعد ادیان کے درمیان مذاکرہ کا دوسرا مرحلہ 1964 میں شروع ہوا جس میں پوپ پال ششم کا پیغام بھی پیش کیا گیا جس میں انہوں نے مختلف ادیان ومذاہب کے ماننے والوں کو گفتگو کی دعوت دی تھی۔ اس دعوت کے بعد 1949 میں ویٹیکن شہر سے ایک کتاب بھی شائع ہوئی جس کا عنوان تھا "مسیحیوں اور مسلمانوں کے درمیان گفتگو کے بنیادی اصول"۔ 1980 اور 1990 کی دہائیوں کے درمیان ادیان و مذاہب اور فرہنگ و تمدن کے درمیان گفتگو پر مشتمل تیرہ اجلاس منعقد ہوئے جن میں سب سے زیادہ اہم "دین اور صلح" عنوان کے تحت منعقد ہونے والا دوسرا عالمی اجتماع ہے جو بلجیم میں منعقد ہوا تھا اور جس میں مختلف ادیان و مذاہب کے 400 سے زیادہ مندوبین نے شرکت کی تھی۔ دوسرا اہم اجتماع قرطبہ کانفرنس کے نام سے 1974 میں اسپین میں منعقد ہوا تھا جس میں 23 عیسائی اور اسلامی ملکوں کے مندوبین موجود تھے۔ اس کے بعد 1979 میں تیونس (Tunisia) کے قرطاج نامی علاقے میں اسلامی مسیحی اجلاس منعقد ہوا تھا۔

بیسویں صدی کی آخری دہائی میں ادیان و مذاہب کے درمیان گفتگو کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔

1993 میں جارڈن (اردن) میں عرب اور یورپی ممالک کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔اس کے بعد 1994 میں شہر خرطوم میں ادیان کانفرنس ہوئی۔ پھر 1995ء میں دو ادیان کانفرنس کی تشکیل عمل میں آئی۔ان میں سے ایک سویڈن کے اسٹاک ہوم میں اور دوسری ارڈن کے عمان نامی شہر میں منعقد ہوئی۔اس کے بعد بھی اردن میں آل البیت یونیورسٹی میں 1994 میں اسلامی ویورپی ملکوں کے درمیان ایک کانفرنس کا اہتمام کیا گیا۔

اسلامی و مسیحی مذاکرات کا دسواں دور 30 اکتوبر 2002 میں بحرین میں منعقد ہوا جس میں فقط علماء ہی نہیں بلکہ تحریک مذاکرہ ادیان سے جڑی ہوئی بعض عظیم شخصیتوں نے بھی بھرپور شرکت فرمائی۔ان سبھی کانفرنسوں کے انعقاد کا اہم ترین مقصد اور بنیادی سبب یہ تھا کہ ادیان کے درمیان اس گفتگو کی وجہ سے باہمی تال میل پیدا ہو جائے اور کمیونزم کے ذریعہ تمام مذاہب کو جو خطرہ محسوس ہو رہا تھا وہ زیادہ موثر ثابت نہ ہو۔ سبھی ادیان کی پیروی کرنے والوں نے یہ ضروری سمجھا کہ کفر و بے دینی کے مدمقابل اقدام کرنا لازمی ہے اور اس کام کے لیے ایک مشترکہ محاذ کی تشکیل زیادہ کارآمد ثابت ہوگی۔

ہم لوگ جس دنیا میں زندگی بسر کر رہے ہیں وہ ''عالمی'' خصوصیات اور دیگر مختلف پہلوؤں کی حامل ہے۔ چنانچہ مالی اور صنعتی شعبوں میں ہم ''عالمی تجارت'' اور ''عالمی اقتصاد'' کی بات کرتے ہیں اور سیاست کے میدان میں ''عالمی حکومت'' اور ''عالمی برادری'' کی اصطلاح رواج پا چکی ہے۔ فوجی شعبہ میں بھی ''عالمی محافظین صلح'' جیسی عبارت اور علاقائی و عالمی سطح پر باہمی اتحاد عصری ضرورت کا رنگ وروپ اختیار کر چکی ہے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ معاشرہ کے دیگر شعبوں کی طرح مذہب نے بھی عالمی حیثیت اختیار کر لی ہے۔اگرچہ عالمی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں سے مختصر سے حصے نے ادیان و مذاہب کو ایسے بے مثال مواقع فراہم کر دیے ہیں جس کو استعمال کرتے ہوئے ادیان و مذاہب کی سعادت آمیزی کو بڑی آسانی سے ساری دنیا تک پہنچایا جا سکتا ہے لیکن اس کے بعض حصے مذہبی معاشرہ کی پریشانی کا باعث بن گئے ہیں۔

11 ستمبر کو رونما ہونے والے واقعات کے گہرے سایہ اور دنیا پر چھائی ہوئی جنگی فضا میں 4

اور 5 اکتوبر 2001ء کو اسلام اور عیسائیت سے وابستہ ایک اجلاس روم میں منعقد ہوا جس میں عالمِ اسلام کی عظیم مذہبی اور علمی شخصیتوں کے علاوہ نامور مسلم دانشوروں نے بھی شرکت کی، جیسے مفتی مصر نصر فرید واصل، شیخ یوسف قرضاوی، ڈاکٹر احمد کمال ابوالمجد، مصری ماہرِ قانون ڈاکٹر محمد سلیم العواء، ڈپٹی چیف ایڈیٹر الاحرام اور یونیورسٹی پروفیسر فہمی ہویدی، شیخ زائد بن سلطان کے ثقافتی مشیر عزالدین ابراہیم، تنظیم اسلامی کانفرنس کے سیکرٹری ڈاکٹر عبداللہ نصیف، موریتانا کے سابق ثقافتی وزیر ڈاکٹر محمد ولد، الجزائر کے سابقہ وزیر خارجہ احمد طاہر ابراہیمی اور دیگر علماء کرام وغیرہ۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر عبدالمجید نے اعلان کیا کہ دنیا کے مختلف علاقوں میں اب تک سینکڑوں اجلاس منعقد ہو چکے ہیں جس میں ہزاروں افراد نے شرکت کی اور ان اجلاس میں مختلف تمدنوں کے درمیان فوری اور لگاتار گفتگو پر کافی زور بھی دیا گیا۔ ان اجلاس کے دوران مذاہب اور تمدنوں کے درمیان مشترکہ پہلوؤں کی نشاندہی بھی ہوئی تھی لیکن اس بات کا قوی امکان ہے کہ ۱۱ ستمبر کو رونما ہونے والے حوادث کی وجہ سے ان کامیابیوں کا بالکل خاتمہ ہو جائے اور دنیا پھر مقامِ صفر پر واپس آ جائے۔ حالانکہ ان دھماکوں سے قبل تنظیم اقوامِ متحدہ کی جانب سے ایک دستاویز تیار کیا جا چکا تھا جس کی روشنی میں ایک ایسی خصوصی تنظیم کی تشکیل ہونی تھی جو تمدنوں کے درمیان گفتگو کی تقویت و حمایت کا کام انجام دیتی۔

تجاویز

ان مختلف اجتماعات کے دوران بہت سی تجاویز منظور ہوئیں۔ ذیل میں بعض سفارشات کا خلاصہ حاضرِ خدمت ہے:

1- توحیدی اور ابراہیمی ادیان کے درمیان مشترک پہلوئں بالخصوص عقیدہ واخلاق و ثقافت کی شناخت اور ادیان و ثقافتوں کے درمیان لازمی پہلوئں پر تاکید۔

2- حکومتوں کی سیاست اور قوموں کی ثقافت سے دشمن کے مفہوم کو پوری طرح نابود کرتے ہوئے ادیان و مذاہب کے درمیان باہمی صلح آمیز زندگی کی تشکیل کے لیے انسانی حقوق کے معیار پر مشترک میثاق کی تدوین۔

3- بغض و کینہ اور عداوت و دشمنی کو حذف کرنے کے لیے تاریخ اور تعلیمی نظام پر نظرثانی اور دینی تعلیمات کے لحاظ سے ایسے انسانی اور اساسی علوم کی تقویت جس کے ذریعہ صبر و تحمل اور مشترکہ تفاہم کو فروغ حاصل ہو سکے۔

4- بعض موضوعات کا اہتمام اور درج ذیل عناوین کے سلسلے میں مشترک نتائج اور مفاہیم تک رسائی حاصل کرنا: عدالت، صلح، عورت، انسانی حقوق، جمہوریت، اخلاق کار، کثرت گرائی، آزادی، عالمی صلح، باہمی صلح آمیز زندگی وغیرہ۔ جیسا کہ اس سے قبل کیا جاچکا ہے کہ سرد جنگ کے دوران ادیان و مذاہب کے درمیان گفتگو کمیونزم سے مقابلہ کے لیے نہایت ضروری تھی لیکن سوویت یونین کے بکھراؤ اور سرد جنگ کے اختتام کے بعد دین و مذہب نے عالمی سطح پر اہم کردار ادا کیا ہے اور ثقافتی' سیاسی اور سماجی شعبوں میں یہ کردار زیادہ موثر رہا ہے۔ آخر کار ایک اہم عالمی سیاسی ادارہ کی حیثیت سے تنظیم اقوامِ متحدہ یہ فیصلہ کرتی ہے کہ عالمی اقتصادی اجتماع کے ساتھ ہی ساتھ مذہبی رہنماؤں کا بھی ایک بین الاقوامی اجتماع منعقد کیا جائے تاکہ عالمی سطح پر ادیان و مذاہب کے درمیان گفتگو ہو سکے۔ اس بین الاقوامی کائونسل کے ۱۳ رکن تھے جس میں دنیا کے مختلف ادیان اور مکاتبِ فکر کے لوگوں کو نمائندگی حاصل تھی اور مذہب اسلام کی نمائندگی اسلامی جمہوریہ ایران اور انڈونیشیا کے سپرد تھی۔

مذہبی علما کا بین الاقوامی کردار

اگست 2000ء میں اقوامِ متحدہ میں یہ طے پایا کہ عالمی مسائل و مشکلات کا حل تلاش کرنے کے لیے یہ لازمی ہے کہ بلند مرتبہ سیاسی لیڈروں کے ساتھ ہی ساتھ عظیم المرتبت مذہبی علماء کا بھی ایک بین الاقوامی اجتماع منعقد ہو تاکہ مذہبی اور سیاسی علماء و ماہرین باہمی گفتگو کے ذریعہ مسائل و مشکلات کا حل تلاش کر سکیں اور عالمی انسانی برادری امن و سلامتی اور مسرت و خوشحالی کی زندگی بسر کر سکے۔ موجودہ دنیا میں دین و مذہب' سیاست کے میدان میں اہم اور قابل ذکر کردار ادا کر رہا ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب کا مشترکہ خیال ہے کہ سبھی لوگ ایک طوفان زدہ کشتی میں بیٹھے ہوئے ہیں لہٰذا

سب لوگوں کو مشترکہ کوشش اور مذاہب کے درمیان موجود مشترکات پر بھروسہ کرتے ہوئے جنگ اور لڑائی جھگڑے سے دور رہتے ہوئے اس کشتی کو ساحل نجات تک پہنچانے کی کوشش کرنا چاہیے۔

1964ء میں ویٹیکن شہر میں منعقد ہونے والے دوسرے اجتماع کے دوران کیتھولک چرچ نے مذہب اسلام کے بارے میں جو خیال ظاہر کیا تھا، وہ اسلام اور کیتھولک مسیحیت کے درمیان گفتگو کی پہلی کرن تھی۔ اسلام اور مسیحیت کے درمیان موجود زیادہ مشترکات نے گفتگو کی زمین کو مزید ہموار کر دیا تاکہ وہ مغربی سامراج اور مسیحی مشنریوں کی حمایت سے رونما ہونے والی تلخ یادوں اور مخاصمانہ احساس پر غلبہ حاصل کر سکیں۔

واضح رہے کہ اسلام اور مسیحیت کے درمیان بہت سی مشترک باتیں پائی جاتی ہیں جیسے خدائے خالق پر عقیدہ و ایمان، انبیاء علیہم السلام کا خدا کی طرف سے ارسال کیا جانا، وحی پر اعتقاد اور روزِ قیامت و روزِ عدل پر اعتقاد و ایمان وغیرہ۔ اسی طرح اسلام اور مسیحیت کے درمیان جن چیزوں میں اختلاف ہے وہ یہ ہیں۔ تثلیث کا مفہوم، جو مسیحی الٰہیات میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، اسلام کی نظر میں قابلِ قبول نہیں ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہنا مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔ دوسری طرف مسیحیت یہ تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہے کہ قرآن آخری کلامِ الٰہی ہے اور اس کو دیگر آسمانی کتابوں پر فضیلت حاصل ہے۔

مذاہب کے مابین مکالمہ اور عالم اسلام

اگرچہ گزشتہ دہائیوں کے دوران اس قسم کے اجتماعات میں ہونے والے روزافزوں اضافہ کا منظر ہماری نگاہوں کے سامنے ہے لیکن عالمِ اسلام میں اس موضوع کے سلسلے میں ایک رائے اور ہم خیالی نہیں پائی جاتی ہے بلکہ اس کے بارے میں مسلمان مفکرین کے درمیان استقطاب یعنی قطب خواہی (Polarisation) اور محاذ سازی و گروہ بندی کا مشاہدہ کیا جا چکا ہے اور اس میدان کے ایک قطب میں مخالفین کے ساتھ گفتگو نہ کرنے کا محاذ آمادہ ہو چکا ہے۔ مخالفین کی ایک جماعت کا عقیدہ و

ایمان ہے کہ ادیان و مذاہب کے درمیان گفتگو کی تحریک نسبیت کی فکر کی بنیاد پر سربلند ہوئی ہے اور دین مبین اسلام کی حقانیت مطلقہ اور ایمان و عقیدہ کے ساتھ ہر گز میل نہیں کھاتی ہے۔ دوسرے گروپ سے وابستہ مفکرین و دانشور اس تحریک کے بنیادی اصول سے چشم پوشی کرتے ہوئے اس خیال کے حامل ہیں کہ ادیان و مذاہب کے درمیان گفتگو کی حمایت و طرفداری کرنے والے لوگ اپنی دعوت میں صداقت نہیں رکھتے ہیں بلکہ اس تحریک کے ذریعہ اپنے سیاسی اور سامراجی مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے میں ہمہ تن سرگرمِ عمل ہیں۔ دوسری طرف ادیان کے درمیان گفتگو کی حمایت کرنے والوں نے علیحدہ موقف اختیار کر رکھا ہے۔ مفکرین اور دانشوروں کی یہ جماعت اس عقیدہ کی حامل ہے کہ حقیقت کی تلاش کے سلسلے میں پنے موقف پر اڑے رہنے کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ آخر کار مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ شک و تردید کی ترویج کے اس دور میں علماء دین ادیان کا تاریخی مطالعہ و تجزیہ کرتے وقت تواضع اور انکساری کی بنیاد پر اپنی دینی معلومات کی تردید کریں اور اسے ہر گز آخری اور قطعی معلومات قرار نہ دیں۔

مسلمان اور مغرب: مذہبی تناؤ یا سیاسی کشمکش

برنارڈ لیوئس

مشرق اور بالخصوص مشرق وسطیٰ کے علوم میں غیر معمولی مہارت کے حامل معروف برطانوی نژاد امریکی اسکالر برنارڈ لیوئس نے اپنے ایک مضمون میں 'تہذیبوں کا تصادم' کی اصطلاح استعمال کی اور پھر یہ اصطلاح دنیا بھر میں اس حوالے سے سوچنے، لکھنے اور بولنے والوں کے حواس پر چھاگئی۔ برنارڈ لیوئس نے زندگی بھر مغرب اور اسلام کی مخاصمت کے حوالے سے لکھا۔ 1933ء میں انہوں نے 'اسلام اور مغرب' کے زیر عنوان کتاب لکھی۔ یہ مضمون اس کتاب کے متعدد اقتباسات اور برنارڈ لیوئس کے انٹرویوز سے لیے گئے نکات پر مشتمل ہے۔ برنارڈ لیوئس 1916ء میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال 2018ء میں ہوا۔انہیں اسلامی تاریخ اور مغرب و مشرق کے تعلقات پر ایک اہم اتھارٹی سمجھا جاتا ہے۔جنگ عظیم دوم کے دوران انہوں نے برطانوی فوج میں خدمات بھی پیش کی تھیں۔اس کے بعد وہ مشرق وسطیٰ اور اسلامی تاریخ کے موضوعات کی طرف متوجہ ہوئے اور اسی حوالے سے غیرمعمولی شہرت پائی۔زیرنظر مضمون مجلہ 'معارف،کراچی' سے لیا گیا ہے۔

مذہب اور ریاست: تعلق کی حدود

امریکی صدر تھامس جیفرسن نے اپنے ایک خط میں مذہب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا''ہم حکومتوں کے حوالے سے کہتے ہیں کہ اتحاد میں برکت ہے اور اگر آپس میں تفرقہ پھیلاؤ گے تو تباہ ہو جاؤ گے مگر جب مذہب کی بات آجائے تو اس کے برعکس کہنا پڑتا ہے یعنی جتنے منقسم رہو گے اتنی ہی ترقی کرو گے''!

اپنے اس جملے میں جیفرسن نے کلاسیکی اختصار کے ساتھ جو بیان کیا ہے اسے عام طور پر امریکی خیال تصور کیا جاتا ہے یعنی کلیسا اور ریاست کی علیحدگی۔ جیفرسن کا پیش کردہ خیال ظاہر ہے بالکل نیا تو نہیں تھا۔اس سے قبل یہ خیال ہمیں جان لاک، اسپنوزا اور دیگر بہت سے یورپی اہل دانش کی تحریروں

میں ملتا ہے۔ یہ البتہ سچ ہے کہ اس مقولے یا نظریے کو سب سے پہلے قانون کے ذریعے طاقت امریکا میں فراہم کی گئی۔ دو صدیاں گزرنے کے بعد اب یہ ایک نا قابل تردید حقیقت بن چکا ہے۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ریاست اور مذہب کی علیحدگی کا تصور محض تین سو سال پرانا ہے لیکن اگر بغور جائزہ لیا جائے تو یہ اتنا ہی قدیم ہے جتنی خود مسیحیت۔ مسیحیوں کے صحائف میں واضح طور پر آپ کو یہ ملے گا کہ ''سیزر کے ذمے جو کام ہیں وہ اسے کرنے دو، اور خدا کو اس کے حصے کے کام''۔

اس کی تشریح میں تو اختلافات ہو سکتے ہیں لیکن یہ بات واضح ہے کہ یہ دونوں ادارے ایک دوسرے سے جدا اور متوازی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا اپنا دائرۂ فکر و عمل ہے، اپنی راہیں اور قوانین ہیں اور ان پر عمل پیرا ہونے کے مخصوص انداز بھی۔ ایک کا تعلق اعتقادات و عبادات کی دنیا سے ہے جسے مذہب کہتے ہیں جبکہ دوسرے کا تعلق معاشرے اور اس سے انسان کے ربط سے ہے جسے سیاست کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ دونوں ادارے اپنا علیحدہ وجود رکھتے ہیں لہٰذا انہیں کسی وقت ضرورت پڑنے پر ایک دوسرے میں ضم بھی کیا جا سکتا ہے یا پھر ان کی علیحدہ شناخت برقرار رکھی جا سکتی ہے۔ یہ ایک دوسرے کے ماتحت بھی ہو سکتے ہیں تاکہ باہمی قربت ممکن ہوتی تاہم اس طرح بعض اوقات دونوں کے درمیان حدود اور اختیارات کا تنازع پیدا ہوتا ہے۔

مذہب اور سیاست کے درمیان پیدا ہونے والے اس تنازع کا جو حل مسیحیت نے پیش کیا ہے، یعنی یہ کہ دونوں کو علیحدہ رکھا جائے اور ان کی حدود متعین کر دی جائیں، بظاہر مؤثر نظر آتا ہے تاہم یہ حل عالمگیر، اصولی اور حتمی ہرگز نہیں۔ دنیا میں ہمیں مذہبی روایت کی حامل ایسی دیگر تہذیبیں بھی ملتی ہیں جن میں ان دونوں اداروں کے تعلق کو ایک مختلف زاویۂ نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ان کی جانب سے پیش کردہ حل یقیناً مغرب سے بالکل جدا ہے۔ اعلیٰ و ارفع ہونے کے باوجود ان مذاہب کی جانب سے پیش کردہ حل ان کی مخصوص جغرافیائی حدود، ماحول، ثقافت یا پھر مخصوص گروہ تک ہی محدود رہا اور کبھی عالمگیر نہ بن سکا۔ ہمیں صرف ایک ایسی تاریخی و مذہبی روایت نظر آتی ہے جسے اپنے عالمگیر پھیلاؤ، سکت اور آفاقی امنگ کی بدولت مسیحیت کا ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے اور وہ ہے اسلام۔

اسلام مغربی تہذیب واقدار کا دشمن نہیں

اسلام دنیا کے عظیم مذاہب میں سے ایک ہے۔ اسلام کے مؤرخ کی حیثیت سے میں اس کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ اسلام نے دنیا میں کروڑوں خواتین و حضرات کو ذہنی اور روحانی سکون فراہم کیا ہے۔ اس کی بدولت بے جان جسم زندگی کی حرارت سے آشنا ہوئے اور خستہ حالوں کو عزت ملی۔ اسلام نے مختلف نسلوں سے تعلق رکھنے والوں کو بھائی چارے کے ساتھ رہنا سکھایا اور دیگر عقائد رکھنے والے افراد کو برداشت کرنے کی تعلیم بھی دی۔ اس کی بدولت ایک ایسا معاشرہ استوار ہوا جہاں مختلف عقائد و نظریات رکھنے والے ایک ساتھ رہتے تھے۔ اس ماحول نے تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھا کر ایک ایسی تہذیب کی بنیاد رکھی جس نے اپنی مساعی اور نتائج سے دنیا کو مالا مال کر دیا۔ دیگر مذاہب کی طرح، ایک فطری امر کے طور پر، اسلام کے ماننے والوں پر بھی ایک ایسا وقت آیا جب چند گروہوں میں نفرت اور تشدد کے جذبات نے جڑ پکڑ لی۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ اس نفرت اور تشدد کا بلاواسطہ ہدف ہم ہیں۔

یہ معاملہ مبالغہ آرائی سے گریز کا متقاضی ہے۔ تمام مسلم خطوں میں مغرب کو رد کرنے کا فیصلہ اجماعی نہیں اور نہ ہی تیسری دنیا سے تعلق رکھنے والے مسلم ممالک میں مغرب کے خلاف سب سے زیادہ عداوت پائی جاتی ہے۔ ایسے مسلمان بڑی تعداد میں ہیں جن سے ہم ثقافتی، اخلاقی، سماجی و سیاسی عقائد اور خواہشات کا اشتراک رکھتے ہیں اور کئی مسلم ممالک میں مغربی تہذیب واضح طور پر موجود ہے۔ امریکی پالیسیوں کو پوری مسلم دنیا بالخصوص مشرق وسطیٰ میں کہیں بھی اس طرح کی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہے، جیسی مزاحمت کا سامنا اسے جنوب مشرقی ایشیا یا پھر وسطی امریکا میں کرنا پڑا ہے۔

بعض اوقات جارحیت کا یہ اظہار مخصوص مفادات، افعال اور پالیسیوں کے علاوہ کلی طور پر مغربی تہذیب کی تردید کا ذریعہ بن جاتا ہے یعنی یہ نفرت مغربی تہذیب کے تمام پہلوؤں سے ہوتی ہے۔ مغرب کو بدی کی علامت سمجھا جاتا ہے اور جو لوگ اس کی حمایت کرتے ہیں یا اسے قبول کرتے

ہیں لوگ انہیں ''خدا کا دشمن'' قرار دیتے ہیں۔

یہ خیال کہ خدا بھی دشمن رکھتا ہے اور ان دشمنوں کی نشاندہی اور خاتمے کے لیے اسے انسانی مدد کی ضرورت پڑتی ہے، مشکل سے ہضم ہوتا ہے۔ ''خدا کے دشمنوں'' کا تصور مسیحیوں کے عہدِ قدیم میں ملتا ہے یعنی عہد نامہ قدیم اور جدید دونوں میں یہ اصطلاحیں ملتی ہیں۔ قرآن میں بھی خدا کے دشمنوں کا ذکر شاید کسی اور تناظر میں ہے۔

اسی خیال سے مماثل نظریات ان مذاہب میں بھی ملتے ہیں جو ثنویت (dualism) کے قائل ہیں جیسا کہ قدیم ایران میں رائج زرتشت ازم یعنی آتش پرستی۔ ایرانی ''تکوینِ کائنات (Cosmogony)'' کے مطابق کائناتی قوتوں کا سرچشمہ دو ہستیاں ہیں ... یزداں اور اہرمن۔ یہ دونوں قوتیں اپنا جداگانہ وجود رکھتی ہیں۔ کائنات پر متصرف ہونے اور اِسے چلانے کے معاملے میں یزداں کے مقابل اہرمن ہے۔ یزداں خیر کا خدا ہے اور اہرمن شر کا۔ خیر اور شر کی یہ جنگ ازل سے جاری ہے۔ دوسری طرف یہودیت، مسیحیت اور اسلام کے تصورِ ابلیس یا بدی کے مطابق وہ خود خدا کی تخلیق ہے اور اسے انسانوں کو بہکانے کے لیے مہلت دی گئی ہے اور اس کے فریب سے بچنا انسانی کردار کی بلندی کی ضامن ہے۔

اگر ہم اسلام کا جائزہ لیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ قرآن انتہائی سختی سے وحدانیت کی تعلیم دیتا ہے۔ وہ کسی ایسی ہستی یا قوت کا تصور بھی پیش نہیں کرتا جو پوری کائنات میں خدا کے مقابل ہو۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق نیکی اور بدی کا میدان جنگ انسان کا دل ہے۔ انسانی دل میں ہمہ وقت جذبات، ترغیبات اور خدا کے احکامات کے درمیان کشمکش جاری رہتی ہے۔ اسلامی تفہیمات میں اس جدوجہد کو بھی خدا کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ دراصل یہ سب کچھ انسان کے امتحان کے لیے ہے۔ خدا دیکھنا چاہتا ہے کہ نیکی اور بدی کی اس کشاکش و کشمکش میں انسان کس سمت بڑھتا ہے۔ بہر حال اتنی واضح تعلیمات کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے یہودیت اور مسیحیت اور اب اسلام کی تعلیمات میں بھی، عملی سطح پر، قدیم ایرانی تصورات شامل ہو چکے ہیں۔

اسلام میں نظریہ جہاد کی بنیاد

جب اسلام نے غلبہ اختیار کیا تو نیکی اور بدی کے اس تصور کی سیاسی اور عسکری جہت کو تقویت بھی مل گئی۔ محمد (ﷺ) دیگر بانیان مذاہب کی مانند صرف ایک نبی یا معلم نہیں تھے بلکہ وہ ایک ریاست اور ایک مسلم معاشرے کے سربراہ اور سپہ سالار بھی تھے۔ اسلامی ریاست کے وجود میں آنے کے بعد اب جنگیں ریاستی سرپرستی میں لڑی جانے لگی تھیں اور مسلمانوں نے جتنی بھی جنگوں میں حصہ لیا وہ سب کی سب "فی سبیل اللہ" یعنی اللہ کی راہ میں اور اللہ کے دشمنوں کے خلاف تھیں۔ مسلمانوں کا تصور حاکمیت یہ ہے کہ حکومت کا حق صرف اللہ کو حاصل ہے اور سربراہ حکومت دراصل وہ ذمہ داری نبھا رہا ہوتا ہے جو اس پر ان قوانین کی رو سے عائد کی گئی ہے۔ اسی لیے تمام جنگیں اسی نظریے کی بنیاد پر اور اسی کی سربلندی کے لیے لڑی گئیں۔

دنیا کے تمام معاشرے انسانی گروہوں کو تقسیم کرتے ہیں۔ کہیں رنگ و نسل کی بنیاد پر تقسیم پائی جاتی ہے اور کہیں زبان کی بنیاد پر۔ کہیں مقامی و غیر مقامی کا سوال اٹھتا ہے۔ اسلام کے کلاسیکی نظریے کے مطابق تمام دنیا کو دو واضح گروہوں میں منقسم کیا گیا۔ ایک ہے دارالاسلام یعنی وہ پورا خطہ جہاں اسلامی حکومت قائم ہو اور دوم دارالکفر یعنی خارج از اسلام خطہ۔ اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہے کہ وہ دارالکفر کو بھی دارالاسلام میں تبدیل کرنے کے لیے بھرپور جدوجہد کرے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ دنیا کا ایک بڑا حصہ دارالاسلام کی تعریف یا حدود سے باہر ہے اور جہاں اسلام موجود ہے وہاں بھی یہ اپنے اصل خدوخال کھو چکا ہے۔ اس کے قوانین بُری طرح مسخ کر دیے گئے ہیں۔ اسلام کی تبلیغ اور اس کا پھیلانا چونکہ ہر مسلمان پر فرض ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس کا آغاز گھر ہی سے کیا جائے یعنی دارالاسلام کو درست کیا جائے۔

دیگر تمام تہذیبوں کی طرح اسلام بھی اپنے دور عروج میں علوم و فنون، روشن خیالی، صداقت و امانت اور صنعت و حرفت کا مرکز تھا۔ اس کے اطراف غیر مسلم وحشی اقوام آباد تھیں۔ اسلامی تہذیب کے جنوب اور مشرق میں جو اقوام آباد تھیں وہ یا تو مشرک تھے یا پھر بت پرست۔ ان

تہذیبوں کا اسلام سے کوئی مقابلہ نہ تھا اور نہ ہی اسلام کو ان سے کوئی خطرہ لاحق تھا۔ شمال اور مغرب میں ایک ایسی تہذیب اس وقت موجود تھی جسے مسلمان اپنے لیے ایک خطرہ تصور کرتے تھے حالانکہ اس وقت بھی وہ اسلام کے مقابلے میں جغرافیائی طور پر کافی محدود ہو چکی تھی تاہم اسلام کی طرح وہ بھی الہامی پیغام رکھنے کے دعوے دار تھے۔ یہ تہذیب یورپ میں مسیحی بادشاہت کے روپ میں موجود تھی۔

اسلام اور یورپ کے درمیان رقابت

اسلام اور یورپ کے درمیان اس رقابت کو ۱۴ صدیاں بیت چکی ہیں۔ اس عداوت و کشمکش کی ابتدا ساتویں صدی عیسوی میں اسلام کے آغاز سے ہوئی اور آج تک جاری ہے۔ ان چودہ سو برسوں میں حملوں، جوابی حملوں، جہاد، صلیبی جنگوں اور فتوحات کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ دکھائی دیتا ہے۔ پہلے ہزار برس اسلام کی پیش قدمی کے ہیں جس کے دوران مسیحیت پسپا اور مغلوب نظر آتی ہے۔ اسلام نے مسیحیوں کے زیر تسلط بہت سا علاقہ (شام، لبنان اور جنوبی افریقا) فتح کر لیا تھا۔ پھر یورپ پر بھی یلغار کی گئی اور کچھ عرصہ سسلی، اسپین، پرتگال اور فرانس کے کچھ علاقوں پر بھی حکمرانی کی۔ صلیبیوں کی جانب سے مسلمانوں سے زیر تسلط عیسائی علاقوں کو بازیاب کرانے کی تمام کوششیں ناکام بنادی گئیں۔

گزشتہ تین صدیوں کے دوران ایشیا اور افریقا میں یورپی نوآبادیوں کے قیام اور یورپی تسلط کے بڑھنے پر مسلمان دفاعی پوزیشن میں ہیں۔ بالخصوص ۱۶۸۳ء میں ترک مسلمانوں کی طرف سے ویانا کو دوبارہ فتح کرنے کی کوشش میں ناکامی کے بعد سے تو مسلمانوں نے گویا ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ اس عرصے میں یورپ سے نکلنے والی مسیحی تہذیب یا اس سے متاثر دیگر تہذیبوں نے گویا دنیا کو زیر نگیں کر لیا ہے اور اسلامی خطے بھی اس میں شامل ہیں۔

مسلم خطوں میں تہذیبِ جدید کے نفسیاتی اثرات

ہاں، البتہ اب پھر کچھ عرصے سے اسلامی اقدار اور عظمت کے احیا اور یورپی حاکمیت کے خلاف پوری دنیا میں اور بالخصوص جہاں جہاں مسلم اکثریت میں ہیں، بغاوت کی سی کیفیت دکھائی دے رہی ہے۔ مسلمانوں کو پے درپے کئی شکستوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ ایک وقت تھا جب دنیا پر ان کی حکمرانی تھی جو رفتہ رفتہ روس اور مغربی طاقتوں کے ہاتھوں ختم ہوئی۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے ممالک میں بھی مغربی تہذیب کی یلغار کا سامنا ہے۔ نئی تہذیب نئے قوانین اور نئی طرزِ حکومت ساتھ لائی۔ جن مسلم ممالک پر غیر ملکی قابض رہے اُن کی غیر مسلم آبادیوں میں بھی آزادی کا احساس ابھرا۔ نئی تہذیب کے اثرات کے باعث عمومی سطح پر مسلمانوں کو درپیش ایک اور بہت بڑی مشکل یہ تھی کہ خواتین اور نوجوان آزاد خیال ہوگئے۔ یہ سب کچھ عام مسلمانوں کے لیے یکسر ناقابل برداشت تھا جس کے باعث وہ اس اجنبی اور ناقابل فہم طاقت سے، جس نے ان کی حاکمیت کا خاتمہ کیا اور ان کے معاشرتی نظام کو پلٹ کر رکھ دیا اور گھر کا تقدس پامال کیا، نفرت کرنے لگے۔

امریکی اُٹھان

امریکا کی دریافت اور تخلیق میں دیگر اقوام نے بھی حصہ لیا۔ امریکا اپنے سماجی، سیاسی اور معاشرتی ارتقا کے عمل میں یورپ سے بے پناہ مختلف نظر آتا تھا تاہم عمومی سطح پر اُسے یورپی شناخت ہی ملی۔ باقی دنیا امریکا اور یورپ کو ایک یا پھر ایک دوسرے کا عکس سمجھتی ہے۔ یورپ نے امریکا کو صرف زبان ہی نہیں دی بلکہ اسے رہن سہن کے آداب بھی سکھائے اور مذہبی تعلیمات سے بھی بہرہ مند کیا۔ جب امریکا میں آباد کاری شروع ہوئی تو وہاں سکونت اختیار کرنے والوں کی اکثریت کا تعلق یورپ ہی سے تھا۔ مشرق وسطیٰ اور شمالی افریقا کے مسلم علاقوں سے بھی لوگوں کی بڑی تعداد نے نئی دنیا کی جانب ہجرت کی لیکن ان میں زیادہ تعداد مسیحیوں یا پھر ان علاقوں میں بسنے والے یہودیوں کی تھی۔ مسلمانوں کی قلیل تعداد ہی امریکا منتقل ہوئی۔ یورپ سے بڑے پیمانے پر کی جانے والی نقل

مکانی نے امریکا کے یورپی تشخص کو باضابطہ شکل دے دی۔

اگر ہم تاریخ کا جائزہ لیں تو ہمیں اسلامی لٹریچر میں امریکا کا ذکر شاذ ہی ملتا ہے۔ جب امریکا نیا نیا دریافت ہوا تھا تب تو شاید مسلمانوں میں تجسس موجود تھا۔ اس کا اندازہ ہمیں کولمبس کے امریکی نقشے سے ملتا ہے، جو ترکی میں ترجمہ کیا گیا تھا اور آج بھی استنبول کے ایک عجائب گھر میں موجود ہے۔ اس کے بعد سولھویں صدی میں ترک زبان ہی میں کتاب ''مغربی ہندوستان کی دریافت'' لکھی گئی جو ایک ترکی جغرافیہ دان نے تحریر کی تھی۔ یہ ترکی میں شائع ہونے والی اولین کتب میں سے تھی۔ اس کے بعد دلچسپی ختم ہوتی چلی گئی اور ہمیں ترکی، عربی اور کسی بھی دوسری مسلم زبان میں امریکا کا کچھ خاص تذکرہ نہیں ملتا۔ اس کے بعد اٹھارویں صدی میں ہمیں ''امریکی خانہ جنگی'' کا احوال ملتا ہے جو یقیناً عربی زبان میں تحریر کیا گیا پہلا براہ راست مشاہدہ تھا کیونکہ مراکش کا سفیر امریکا میں موجود تھا۔ بعدازاں مراکش کے سلطان نے امریکا سے امن اور دوستی کا ایک معاہدہ بھی کیا تھا۔ اس کے بعد سے ہمیں امریکا اور دیگر مسلم ممالک کے روابط کا ذکر تواتر سے ملتا ہے۔ ان میں کچھ دوستانہ، کچھ جارحانہ اور کچھ تجارتی معاملات شامل ہیں۔

امریکی خانہ جنگی کے نتیجے میں ابھرنے والی نئی ریاست کا مکمل ادراک اس دور میں کسی مسلم حکومت نے نہیں کیا یا پھر ان انقلابات کے نتیجے میں رونما ہونے والی تبدیلیاں، یعنی خود مسلم ریاستوں میں کبھی تاجر، کبھی سفیر اور کبھی استاد یا مبلغ کی حیثیت سے امریکیوں کی آمد عدم توجہ کے باعث مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل رہی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ اور جاپان بری طرح تباہ ہو چکے تھے اور عالمی منڈی میں امریکا کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی نہیں تھا۔ اس دور میں امریکی مصنوعات دور افتادہ علاقوں تک پہنچ رہی تھیں۔ ساری دنیا کی طرح مسلم دنیا میں بھی امریکی مصنوعات کا استعمال بڑھنے لگا جس سے نہ صرف ان کی طرز زندگی میں غیر محسوس تبدیلی آنے لگی بلکہ عمومی مذاق بھی تبدیل ہونے لگا۔ اس کے نتیجے میں امریکی مصنوعات کی طلب میں اضافہ ہوا۔ اس پر مستزاد یہ کہ ٹیلی وژن ٹیکنالوجی اور سینما نے تو گویا امریکی تہذیب کو پَر لگا دیے۔ اب نت نئے فیشن کے ملبوسات، بڑی اور چمکدار گاڑیاں

اور اس سے بڑھ کر خود امریکی طرزِ زندگی دنیا بھر میں پھیلتی جا رہی تھی۔ کچھ لوگوں نے امریکا کو آزادی و انصاف کے مترادف قرار دیا جبکہ کچھ لوگوں کے لیے امریکا دولت، طاقت اور کامیابی کا مترادف تھا۔

اسی دوران مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بھی امریکا کا رخ کرنے لگی۔ پہلے پہل تعلیم کے حصول کی خاطر، پھر معلم کی حیثیت سے اور آخر کار وہاں سکونت اختیار کرنے کی غرض سے۔

جنگِ عظیم دوم کے بعد کا چیلنج

دوسری جنگ عظیم نے تو گویا پرانی دنیا کا نقشہ ہی تبدیل کر دیا۔ گو امریکا اس جنگ میں آخر میں شریک ہوا تاہم سب سے زیادہ فائدے میں وہی رہا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد سے تیل کی دولت دریافت ہو چکی تھی اور اس پر تغلب و تسلط کے لیے امریکا اور برطانیہ مشرقِ وسطیٰ کی سیاسی بساط پر مہرے لڑا رہے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ بری طرح تباہ ہوا۔ لندن جیسا شہر بھی اچھا خاصا تاراج ہو چکا تھا۔ صنعتی نظام متاثر ہوا۔ بعد از جنگ از سر نو تعمیر و ترقی اس کی ترجیحات میں سرِ فہرست تھی۔ اس کے مقابلے میں امریکی صنعتوں نے دن دگنی رات چوگنی کے مصداق ترقی کی۔ یہی سبب تھا کہ اسے مشرقِ وسطیٰ میں قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ نئی بدلتی دنیا میں امریکی تہذیب، جسے عام طور پر غلط فہمی کی بنیاد پر یورپی یا مغربی تہذیب کہہ دیا جاتا ہے، پوری طرح دنیا پر چھا رہی تھی ... بالخصوص تیسری دنیا پر۔

مسلم ممالک بھی اس تہذیبی یلغار سے بچ نہیں پائے تھے۔ ان کی قدیم روایات اور خاندانی و سماجی ڈھانچا بھی تبدیل ہو رہا تھا۔ سیاسی میدان میں بھی نئے خیالات جنم لے رہے تھے۔ دنیا سے خلافت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور جمہوری طرزِ حکومت پروان چڑھ رہی تھی۔ امریکا لبرل جمہوریت کا سب سے بڑا علم بردار بن کر ابھر رہا تھا۔

مغرب سے بیزاری کے اسباب

مسلمانوں میں امریکا کے خلاف اس قدر اشتعال پنپنے کی وجوہ سمجھ میں آتی ہیں تاہم ہم عمومی تجزیوں سے ہٹ کر ذرا گہرائی سے جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ مغربی حکومتوں نے تیسری دنیا کے مسلم ممالک اور خاص طور پر مشرق وسطیٰ کے مسلم نوجوانوں میں اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کی خاطر کسی بھی حوالے سے غصہ بھڑکانے اور اُسے بروئے کار لانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اپنے سیاسی مفادات کی تکمیل کے بعد مغرب نے اُس حکمت عملی کو یکسر ترک کر دیا جس نے ان نوجوانوں کو آتش خُو بنا رکھا تھا۔ مغرب یہ بھول گیا کہ پالیسیوں کو اس طرح یکسر ترک کر دینے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا کیونکہ اس کے مابعد اثرات تادیر قائم رہتے ہیں۔ حالیہ تاریخ سے اس کی مثال یوں لیں کہ فرانسیسیوں نے الجزائر، برطانویوں نے مصر سے انخلا کے وقت مستقبل کے حوالے سے کوئی باضابطہ منصوبہ (روڈ میپ) تیار نہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ انخلا کے بعد ان علاقوں میں مغرب اور اُس کے اتحادیوں کے لیے نفرت میں اضافہ ہوا ہے۔

یورپ سے بالعموم اور امریکا سے بالخصوص نفرت کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ یہ دونوں اسرائیل کی بھرپور حمایت کرتے ہیں۔ اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ محض اسرائیل کی حمایت اتنی شدید نفرت کی بنیاد نہیں بن سکتی، یہ بالائے فہم ہے۔ اپنے قیام کے ابتدائی دنوں میں اسرائیل اور امریکا میں ایک فاصلہ موجود تھا کیونکہ اسرائیل تو خالصتاً برطانوی حمایت کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔ امریکا کے مقابلے میں روس نے جس گرم جوشی کا مظاہرہ کیا تھا وہ بھی تاریخ کا حصہ ہے۔ یہودیوں کی ایک بہت بڑی تعداد روس میں آباد تھی جو اسرائیل کے قیام کے فوراً بعد نقل مکانی کر گئی۔ روس نے نہ صرف اسے تسلیم کیا بلکہ اپنے زیر اثر چیکوسلواکیہ کے ذریعے اس کی بھرپور مدد بھی کی۔ اسرائیل کو اس کے قیام کے ابتدائی دنوں میں بھرپور مدد فراہم کر کے روس نے عہدِ طفولیت ہی میں مرنے سے بچالیا تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلم دنیا میں روس کے خلاف بھی اتنی شدید نفرت کا اظہار نہیں ملتا۔ امریکا نے ۱۹۵۶ء میں عسکری اور سیاسی مداخلت کرتے ہوئے مصر سے اسرائیلی، برطانوی اور فرانسیسی افواج کا تسلط ختم کرایا تھا مگر پھر بھی اس کے لیے پسندیدگی، تشکر اور محبت کے

جذبات پیدا نہ ہو سکے۔ ۱۹۵۰ء کے عشرے کے اواخر سے ۱۹۶۰ء کے عشرے کے اختتام تک بیشتر مسلم ممالک (بشمول عراق، شام اور مصر) روس سے اسلحہ خریدتے تھے۔ یہ مسلم ممالک اقوام متحدہ میں روسی بلاک کا حصہ بھی تھے۔

امریکا سے نفرت کا دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ امریکی ایوانِ صدر نے استبدادی قوتوں کی حمایت کی ہے۔ امریکا نے اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر ہمیشہ ان حکمرانوں کی حمایت کی جو عوام میں بے حد غیر مقبول تھے یا پھر غیر جمہوری راستوں سے مسندِ اقتدار تک پہنچے تھے۔ عوام سمجھتے تھے کہ اگر امریکی حمایت نہ ہو تو شاید یہ آمر ایک دن بھی اقتدار کی کرسی پر نہ بیٹھ سکیں کیونکہ ان خطوں میں اصلاح پسند ایسے حکمرانوں کو رجعت پسند، بداطوار، بدعنوان اور جابر سمجھتے ہیں جو تبدیلی سے خائف ہیں اور مغربی مفادات کا تحفظ چاہتے ہیں۔

مغرب پر بالعموم عائد کیے جانے والے الزامات میں جنسی تفریق، نسل پرستی، سامراجیت، مردانہ حاکمیت، غلامی بحیثیت کاروبار، آمریت اور استحصال نمایاں ہیں۔ یقیناً یہ تمام الزامات ایسے ہیں جن کی بنیاد پر مغرب کو مجرم قرار دیا جا سکتا ہے۔ خیر، یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ان تمام بُرائیوں اور خرابیوں کا مجموعہ محض یورپ نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے بعض جرائم تو ایسے ہیں جن کے حوالے سے یورپ بہت پیچھے نظر آتا ہے۔

یہ درست ہے کہ مغرب میں عمومی طور پر اور مسیحیت کے زیرِ اثر بادشاہت کے دور میں خواتین سے کبھی اچھا سلوک روا نہیں رکھا گیا، تاہم یہ صورتِ حال ان معاشروں سے بہتر نظر آتی ہے جہاں ایک سے زائد بیویاں اور لونڈیاں (باندیاں) رکھنے کا رواج تھا۔ یہ رواج مغرب کے سوا دیگر تمام خطوں اور معاشروں میں عام تھا۔

آج غلامی کو ممنوع قرار دیا جا چکا ہے اور اس حوالے سے سخت قوانین بھی بنا دیے گئے ہیں مگر خیر، غلامی کا دور ہمارے حافظے میں محفوظ ہے۔ اُس دور میں غلامی معاشرتی عمل کے طور پر رائج تھی اور اِسے سماجی ضرورت قرار دیتے ہوئے اس کے وجوب اور تحفظ کے لیے قوانین بھی وضع کیے گئے

تھے۔ یہ درست ہے کہ مغرب نے افریقا اور دیگر خطوں سے لاتعداد افراد کو لاکر اپنی منڈیوں میں غلام کی حیثیت سے فروخت کیا۔ اِسے ایک باضابطہ کاروبار کی شکل دی گئی۔ مگر یہ بھی ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ سب سے پہلے مغرب ہی نے غلامی کا خاتمہ بھی کیا۔ فطری علوم وفنون کے نتیجے میں شعور و آگہی کے فروغ نے اہلِ یورپ کو تحریک دی کہ غلامی کی صرف مذمت نہ کریں بلکہ اِسے سرے سے ختم کر دیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ استعماریت کے پھیلاؤ کا سرخیل یورپ رہا ہے۔ لیکن کیا ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ جب کوئی تہذیب یا قوت اپنی حدوں سے تجاوز کرتی ہوئی دور دراز کے خطوں تک پہنچی اور وہاں قدم جمائے؟ کیا کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ اپنے استعماری پھیلاؤ کے عرصے میں یورپ سے ایسی اخلاقی لغزشیں سرزد ہوئیں جو اس سے قبل عربوں کی فتوحات، ترکوں کی خلافت یا پھر منگولوں کی یلغار کے دوران سرزد نہیں ہوئی تھیں اور وہ سب کے سب ان تمام خطاؤں اور اغلاط سے مبرّا و ماورا تھے؟ ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ فتوحات کے دور میں ہر استعماری طاقت اس طرح کی تاریخی کوتاہیوں اور لغزشوں کی مرتکب ہوتی ہے۔

نسل پرستی، استعماریت اور اسی قبیل کی دیگر خامیاں دراصل انسانی نسل کی خامیاں ہیں اور مغرب بھی چونکہ انسانی نسل کا نمائندہ ہے لہٰذا وہ بھی ان خامیوں کو دہراتا رہا ہے۔ ایک بات کا سہرا البتہ مغرب کو جاتا ہے جو اُسے دیگر تہذیبوں سے ممتاز کرتا ہے... یہ کہ مغرب نے ان تاریخی امراض کی محض تشخیص نہیں کی بلکہ انسانیت کو ان سے نجات دلانے کے اقدامات بھی کیے۔

استعمار کا مسیحیت سے ربط

جب یورپی استعمار دنیا بھر میں پھیل رہا تھا تب چونکہ اس کا مذہب مسیحیت تھا اس لیے استعماریت کی مذمت کے دوران تاریخ کے کسی موڑ پر اُسے مذہب سے بھی جوڑ دیا گیا۔ استعماری قوتیں طاقت کے ذریعے محکوم اقوام کے معاشرتی مقام کا تعین کرتی ہیں۔ اُسے چونکہ مذہبی رنگ دے دیا گیا تھا اس لیے یہ ناقابلِ برداشت تھا کہ کوئی "کافر" استعماری قوت سچے عقائد رکھنے والی قوم پر

حکمرانی کرے۔ سچے عقائد کے حامل افراد کی کفار پر حکومت تو جائز اور فطری ہے کیونکہ اس طرح خدا کے قوانین کی بالادستی اور حرمت برقرار رہتی ہے اور کفار کے راہِ راست پر آنے کے امکانات بھی توانا رہتے ہیں مگر کفار کی حاکمیت مذہب کی صریح توہین سمجھی جاتی ہے۔ ان وجوہ کی بنیاد پر بھارت کے زیر تصرف کشمیر، افریقا اور سنکیانگ میں پھیلی ہوئی بدامنی ہماری سمجھ میں آتی ہے۔

آیئے، آخر میں لادینیت یعنی سیکولرازم کا جائزہ لیں۔ لادینیت کا آغاز ہمیں مسیحیت کے ابتدائی ادوار میں بھی مل سکتا ہے، جب مذہب اور ریاست کو الگ الگ حیثیت دی گئی۔ بعد میں مسیحیت کے اندرونی خلفشار اور تفرقہ بندی کے باعث دونوں ادارے ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے گئے۔ مسلمانوں میں مذہبی فرقے ہیں مگر مسیحیوں اور کیتھولک اور پروٹیسٹنٹ کے درمیان عقائد و نظریات کی جنگ میں بہنے والی خون کی ندی سے مسلمانوں میں مسلکی اختلافات پر ہونے والا سر پھٹول کوئی مماثلت نہیں رکھتا۔ یورپی تاریخ میں سولہویں اور سترہویں صدی کیتھولکس اور پروٹیسٹنٹس کے درمیان جنگ وجدل سے بھری ہوئی ہے۔ حالات اتنے بگڑے کہ تنگ آکر مسیحیت کو عیسائیت کو مذہب اور ریاست کی علیحدگی کا اعلان کرنا پڑا۔ مسلمانوں کو اس طرح کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی کہ جب وہ مذہب اور ریاست کو الگ کرنے کا اعلان کرتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اسلام میں "ریاستی لادینیت" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام میں تکثیریت (pluralism) کا تصور بھی دیگر مذاہب سے مختلف ہے۔ اسلام میں کبھی دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو ان کے اپنے عقائد کی تبلیغ کی مکمل آزادی نہیں دی گئی، سوائے ان مذاہب کے ماننے والوں کے جو الہامی ہونے کے دعوے دار تھے۔ رواداری اور برداشت کا یہ عملی مظاہرہ مسیحیت کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتا تاوقتِ کہ اٹھارہویں صدی کے اختتام تک سیکیولرازم نے جڑیں مضبوط کرنا شروع نہیں کیں۔

مغرب کی پیروی

شروع میں تو مسلم دنیا کی جانب سے مغرب کی کاوشوں کو سراہا گیا اور اس کی پیروی کی کوشش بھی کی گئی۔ اسلامی دنیا میں پھیلی غربت، جہالت اور کمزوری شاید ایسی وجوہ تھیں جن کو مدنظر

رکھتے ہوئے اس نے ترقی کرتے مغرب کی پیروی کرنے کی کوشش کی۔ مغرب اور اسلامی دنیا کے درمیان بڑھتے فاصلے کا احساس سب سے پہلے میدان جنگ میں ہوا، اور پھر فطری علوم و فنون میں بھی عیاں ہو گیا۔ مسلم مصنفین نے مغربی سائنس اور ٹیکنالوجی، اس سے حاصل ہونے والی دولت اور طاقت، مصنوعات اور طرزِ حکمرانی کا ذکر کیا اور مصلحین نے مغرب کی ان کاوشوں کو اپنانے اور انہیں اپنے اپنے خطے میں رائج کرنے کے لیے بھرپور جدوجہد کی تاکہ وہ مغرب کی ہمسری کرتے ہوئے اپنا اجتماعی وقار بحال کر سکیں۔ تبدیلی کا یہ عمل بہت سُست رفتار ہوتا ہے۔ مغرب کو بھی بدلنے میں صدیاں لگی تھیں۔ بہت کچھ قربان کرنا پڑا تھا۔ مسلمان شاید اب تک یہ بات قبول یا ہضم نہیں کر پائے ہیں کہ کل تک وہ جن لوگوں پر حکمرانی کیا کرتے تھے یا جن علاقوں پر ان کے گھوڑے دوڑتے تھے آج وہ لوگ دنیا پر حکمرانی کر رہے ہیں۔

مسلم دانشوروں سے ایک بنیادی غلطی یہ سرزد ہوئی کہ انہوں نے داخلی طور پر تبدیلی لانے کے لیے کوئی عملی اور ٹھوس کام نہیں کیا۔ انہیں ایسا بہت کچھ کرنا چاہیے تھا، جس کی جڑیں ان کی اپنی تہذیب اور تعلیمات میں ہوں۔ مغربی ترقی کی ہمسری کرنے کی دوڑ میں یا کم از کم اپنے آپ کو ترقی کی شاہراہ پر گامزن کرنے کے لیے جو طریقے اور نظریات اپنائے گئے مسلم دنیا کے عوام کے لیے اجنبی تھے۔ ان نئے خیالات اور نظریات کی جڑیں خالصاً مغربی تھیں۔ یہی سبب ہے کہ مغربی معاشی نظام کو اپنانے کی صورت میں بھی مسلم ممالک بڑی معاشی قوت نہ بن سکے۔ مسلم ممالک میں مغربی سیاسی اداروں کا قیام بھی زیادہ مفید نہ رہا۔ ان ممالک میں ہمیں جابجا جابر اور آمرانہ حکومتیں اور بادشاہتیں نظر آتی ہیں۔ میدان جنگ میں مسلمانوں کی شکست کی وجہ یہ ہے کہ مغربی ہتھیار تو بے شک انہوں نے یورپ اور امریکا سے خرید لیے لیکن وہ ٹیکنالوجی اور جدید جنگی حکمتِ عملی نہ اپنا سکے۔ پھر ہوا یوں کہ معاملات کی تہہ تک پہنچ کر انہیں سمجھنے کے بجائے مسلم دنیا سے آواز ابھرنے لگی کہ ''رجعت الاولیٰ''، یعنی ابتدا کی طرف لوٹ جانا چاہیے۔ مغرب نے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور عسکری اداروں کی بنیاد جن اصولوں پر رکھی ہے انہیں بنانے، سنوارنے، تراشنے میں انہیں کئی صدیاں لگی ہیں۔ بیشتر مسائل اس حقیقت کو نہ سمجھنے سے پیدا ہوتے ہیں۔

مذہب، عقیدے کی آزادی اور اقوام متحدہ کے منشور

رشاد بخاری

مذہبی آزادی کا مروج تصور جدید قومی ریاست کی دین ہے اور اس کے خدوخال اٹھارویں صدی میں نمایاں ہونے شروع ہوئے اور بیسویں صدی میں آکر اس کو عملی جامہ پہنانے اور ساری دنیا میں اس تصور کو فروغ دینے کے لیے خاطرخواہ اقدامات کیے گئے تاکہ ممالک کو جنگوں، اور معاشروں کو تنازعات سے بچایا جاسکے۔ اس ضمن میں اقوام متحدہ کے منشور کو سب سے زیادہ شہرت و اہمیت حاصل ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہے کہ مختلف علاقوں میں مذہبی آزادی کے عالمی تصور کی قبولیت یا اس کو عملی شکل دینے میں رکاوٹیں بھی درپیش ہیں۔ رشاد بخاری نے اس مضمون میں اقوام متحدہ کے منشور کی متعلقہ دفعات کی روشنی میں مذہبی آزادی کی جزئیات کو موضوع بنایا ہے، اور ساتھ ہی مختلف معاشروں میں درپیش مشکلات کا بھی تجزیہ کیا ہے۔ مضمون نگار ایک سماجی کارکن، ادیب اور لکھاری ہیں۔ افسانہ و ناول نگاری کے ساتھ ساتھ کئی سماجی تنظیموں سے وابستہ رہ کر فلاحی و شہری مسائل پر کام کرتے رہے ہیں۔

یہ جاننے سے پہلے کہ مذہبی آزادی کیوں ضروری ہے، یہ جاننا اہم ہے کہ مذہبی آزادی کا کیا مطلب ہے۔ کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ شائد مذہب اور عقیدے کی آزادی سے مذہب اور عقیدوں کا تحفظ ہوتا ہے۔ درحقیقت ایسا نہیں ہے۔ مذہبی آزادی بنیادی انسانی حقوق کا ایک اہم حصہ ہے باقی تمام انسانی حقوق کی طرح مذہب یا عقیدے کی آزادی سے مذاہب یا عقیدوں کا نہیں بلکہ لوگوں کا تحفظ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ لوگوں کو یہ آزادی حاصل ہونی چاہیے کہ وہ اپنی سمجھ بوجھ اور ضمیر کے مطابق کوئی سا بھی مذہب یا عقیدہ اختیار کرلیں اور اس کے مطابق عمل کریں جب تک ان کے اس عمل سے دوسروں کے ایسے ہی حق کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔

مذہبی آزادی کے تصور میں ان لوگوں کا بھی تحفظ بھی شامل ہے جو بنیادی سوالوں کے بارے میں غیر مذہبی عقیدہ رکھتے ہوں جیسے ملحد، انسان پرست یا جنگ کے مخالف۔ دوسرے لفظوں میں

مذہب یا عقیدے کی آزادی حتیٰ کہ ان لوگوں کا بھی تحفظ کرتی ہے جو کسی بھی مذہب یا عقیدے کو نہیں مانتے۔

یہی وجہ ہے کہ مذہبی آزادی کے سوال پر مذہبی حلقوں میں کافی تحفظات پائے جاتے ہیں۔ ایک پکے مذہبی شخص کے لیے جو اپنے عقائد کو اٹل سچائی مانتا ہے یہ تسلیم کرنا بہت مشکل ہے کہ دوسروں کو یہ اجازت دی جائے کہ وہ اپنی الگ سچائی پر یقین رکھ لیں۔ ان کے نزدیک ایسی آزادی تو صریح گمراہی کا راستہ کھولنے والی بات ہوگی۔ کسی مذہبی بحث میں پڑے بغیر، کہ علما کرام اور دیگر مذہبی اسکالراس پر ہماری بہتر رہنمائی کر سکتے ہیں، یہاں ہم انسانی حقوق کے حوالے سے مذہبی آزادی کے تصور پر اقوام متحدہ کا نقطہ نظر ان کے منشور اور معاہدوں کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

اقوام متحدہ کے مطابق ہمیں بطور انسان کون سا تحفظ اور حقوق حاصل ہیں؟ اس حوالے سے انسانی حقوق کے عالمی منشور اور معاہدوں میں سے دو سب سے اہم یہ ہیں:

- انسانی حقوق کے بارے میں اقوام متحدہ کے عالمی منشور کی دفعہ ۱۸
- شہری اور سیاسی حقوق کے بارے میں اقوام متحدہ کے عالمی معاہدے کی دفعہ ۱۸

یاد رہے کہ اقوام متحدہ کا عالمی منشور محض سیاسی ارادے کا اظہار کرتا ہے۔ تاہم جب اقوام متحدہ اس منشور کے مطابق معاہدے کرتا اور کنونشن بناتا ہے تو ان کی توثیق کرنے والی ریاستیں قانونی طور پر ان معاہدوں اور کنونیشنز کی پابند ہوتی ہیں۔ آیئے شہری اور سیاسی حقوق کے معاہدے کے متن پر ایک نظر ڈالتے ہیں:

انسانی حقوق کے بارے میں اقوام متحدہ کے عالمی منشور کی دفعہ 18

1۔ ہر شخص کو فکر، ضمیر اور مذہب کی آزادی کا حق حاصل ہوگا۔ اس حق میں اپنی پسند کا مذہب یا عقیدہ رکھنے یا اختیار کرنے اور انفرادی طور پر دوسروں کے ساتھ مل کر کھلے عام یا نجی طور پر

عبادت کے ذریعے اپنے عقیدے کا اظہار کرنے، اس پر عمل کرنے اور تبلیغ کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

2۔ کسی شخص پر کوئی ایسا دباؤ نہیں ڈالا جائے گا جس سے اپنی پسند کا مذہب یا عقیدہ رکھنے یا اختیار کرنے کی آزادی کو گزند پہنچے۔

3۔ کسی شخص کے مذہب یا عقیدے کا اظہار صرف ان حدود کے ساتھ مشروط ہوگا جو حدود قانون نے مقرر کی ہیں اور جو تحفظ عامہ، امن وامان، دوسرے لوگوں کی صحت، اخلاق یا ان کے بنیادی حقوق اور آزادی کے تحفظ کے لیے ضروری ہیں۔

4۔ اس میثاق میں شریک ممالک، والدین اور جہاں وہ موجود نہ ہوں قانونی سرپرستوں کی آزادی کا احترام کرنے کا عہد کرتے ہیں کہ وہ اپنے عقیدے کے مطابق اپنے بچوں کو مذہبی اور اخلاقی تعلیم دلوائیں۔

ہم یہاں ان سات موضوعات کا تعارف کرائیں گے جن سے ان حقوق پر روشنی پڑتی ہے جنہیں مذہب اور عقیدے کے حوالے سے بین الاقوامی قانون یقینی بناتا ہے:

1. کوئی مذہب یا عقیدہ رکھنے، اختیار کرنے یا چھوڑنے کی آزادی۔
2. کسی مذہب یا عقیدے پر عمل کرنے اور اس کا اظہار کرنے کی آزادی۔
3. مذہب اور عقیدے کے معاملے میں جبر سے تحفظ۔
4. امتیاز سے تحفظ حاصل کرنے کا حق۔
5. مذہب اور عقیدے سے متعلق والدین اور بچوں کے حقوق۔
6. اپنے ضمیر کے مطابق انکار کا حق۔
7. کب اور کس صورت میں یہ حقوق محدود ہو سکتے ہیں۔

ا۔ مذہب یا عقیدے کو رکھنے یا بدلنے کا حق

اقوام متحدہ کے مطابق مذہب یا عقیدے کی آزادی کا سب سے بنیادی پہلو یہ ہے کہ اس سے

آپ کو اپنا مذہب یا عقیدہ رکھنے، اختیار کرنے، تبدیل کرنے یا چھوڑنے کا حق ملتا ہے۔ یہ حق آپ کے ذاتی ایمان سے متعلق ہے اور مذہب یا عقیدے کا داخلی پہلو ہے۔ بین الاقوامی قانون کے مطابق اپنا مذہب یا عقیدہ رکھنے یا بدلنے کا حق ایک حتمی حق ہے جس کو کبھی محدود نہیں کیا جا سکتا۔ چاہے آپ ایک مسیحی ہوں یا مسلمان، بہائی، یزیدی یا ملحد، چاہے آپ سنگاپور میں رہتے ہوں، سویڈن میں یا سوڈان میں، چاہے امن ہو یا جنگ، مذہبی یا سیاسی رہنما کچھ بھی کہتے رہیں، آپ اور ہر شخص کا یہ حق ہے کہ اپنے عقائد پر قائم رہیں، ان کی تحسین کریں، یا انہیں تبدیل کریں یا کوئی بھی عقیدہ نہ رکھیں۔

مذہبی بنیاد پر پابندیوں کی مثالیں:

خاص طور پر مذہبی شناخت کو اولیت دینے والے ممالک اور کمیونٹیوں میں بہت سے لوگوں کے اس بنیادی حق کو تسلیم نہیں کیا جاتا اور ان کو ان کے مذہب یا عقیدے کی وجہ سے سزا دی جاتی ہے، ان پر حملے کیے جاتے ہیں، کبھی حکومت کی طرف سے، کبھی خاندان کی طرف سے اور کبھی اپنی کمیونٹی کے گروہوں کی طرف سے۔

چین

کچھ حکومتیں کچھ خاص مذاہب یا عقیدوں پر پابندی لگا دیتی ہیں۔ فالن گانگ بدھ مت کی ایک شکل ہے جس پر چین میں پابندی ہے۔ فالن گانگ کے پیروکاروں کو قید و بند، تشدد، جبری مزدوری اور دوبارہ تعلیم جیسی سزاؤں کا سامنا کرنا پڑا ہے تاکہ انہیں ان کے عقائد چھوڑنے پر مجبور کیا جا سکے۔

اریٹیریا

اریٹیریا میں صرف چار مذاہب ہیں جنہیں ریاست تسلیم کرتی ہے اور دوسرے غیر تسلیم شدہ مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں، جیسے پینٹی کاسٹل مسیحی یا یہوواہ کے گواہوں کو ماننے والوں کو مختلف طرح کی سخت سزائیں دی جاتی رہی ہیں۔

مذہب یا عقیدے کی آزادی کے حق کی خلاف ورزی کی ایک مثال نفرت پر مبنی جرائم ہیں جہاں تشدد کا شکار لوگوں کو ان کی مذہبی شناخت یا عقائد کی وجہ سے نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ان پر اس لیے حملہ کیا جاتا ہے کیوں کہ وہ کوئی خاص مذہب یا عقیدہ رکھتے ہیں۔

فرانس

فرانس میں مسلمانوں کے خلاف نفرت پر مبنی جرائم جن میں حملہ کرنا، ہراس کرنا، اور مجرمانہ نقصان پہنچانا شامل ہے، 2015 میں 336 حملوں کے ساتھ 250 گنا اضافہ ہوا۔ جبکہ یہودی کمیونٹی کے خلاف نفرت پر مبنی جرائم کی شرح بھی 715 ریکارڈ شدہ حملوں کے ساتھ بلند رہی۔

میکسیکو

دیہی میکسیکو کے کچھ علاقوں میں پروٹسٹنٹ مسیحیوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور علاقے کے بڑوں کی طرف سے انہیں ان کی زمینوں سے بے دخل کیا گیا تاکہ روایتی اور کیتھولک مسیحیت کو محفوظ کیا جا سکے۔

بہت سے ملکوں میں مذہبی شناخت، قومی شناخت اور ریاستی شناخت ایک دوسرے کے ساتھ مدغم ہیں۔ اس صورت حال میں وہ مذہبی اقلیتیں اور لوگ جو اکثریتی مذہب چھوڑ دیں ان کو غیر محب وطن سمجھا جاتا ہے، بلکہ بعض اوقات انہیں قومی سلامتی کے لیے خطرہ سمجھ لیا جاتا ہے۔

درحقیقت کسی مذہب یا عقیدے کو چھوڑنے کے 'مطلق انسانی حق' کو اکثر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جاتا ہے۔

انڈونیشیا

انڈونیشیا میں مذہبی آزادی کے قوانین موجود ہیں۔ اگرچہ یہ قوانین صرف مخصوص مذاہب کے لوگوں کا تحفظ کرتے ہیں مثلاً اسلام، کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مسیحیت، بدھ مت، کنفیوشس ازم اور ہندو مت۔ لیکن لامذہبیت کا تحفظ نہیں ہے۔ تیس سال کی عمر میں مسلم پس منظر رکھنے والے

ایلکس آن کو اس لیے ڈھائی سال قید اور گیارہ ہزار ڈالر جرمانہ کی سزا برداشت کرنا پڑی کیونکہ اس نے فیس بک پر الحاد کا ایک صفحہ شروع کیا تھا اور لکھا تھا کہ 'خدا موجود نہیں ہے'۔

ایلکس آن پر الزام لگایا گیا تھا کہ اس نے مذہبی نفرت پر مبنی مواد کو پھیلایا اور انٹرنیٹ پر توہین مذہب کا مرتکب ہوا۔ اور یہ کہ اس نے دوسروں کو بھی الحاد کی دعوت دی۔ اس کے باوجود کہ آن نے اپنے فیس بک کے صفحے پر عوام سے معافی مانگی لیکن لوگوں کے بپھرے ہجوم نے اس کو تشدد کا نشانہ بنایا اور خود اس کی کمیونٹی نے اسے مسترد کر دیا۔

ایران

ایران میں اسلام چھوڑ کر مسیحیت قبول کرنے والوں کو سخت سزا کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ خاص طور پر اگر ان کا تعلق گھروں میں قائم غیر رجسٹرڈ چرچز کے ساتھ ہو۔ جولائی 2017 میں اپنا مذہب تبدیل کرنے والے ایسے چار لوگوں کو دس دس سال قید کی سزا سنائی گئی اور ان پر 'قومی سلامتی کے خلاف' کام کرنے کا الزام لگایا گیا۔ ان میں سے تین کو اس سے قبل کیتھولک رسم کے مطابق کمیونین وائن پینے پر 80 کوڑوں کی سزا بھی دی گئی تھی کیونکہ حکومت کے نزدیک وہ ابھی بھی مسلمان تھے اور ایران میں کسی مسلمان کو کسی بھی طرح کی شراب پینے کی اجازت نہیں ہے۔

اکثر سیاسی اور مذہبی رہنما مقدس متنوں اور مذہبی روایتی قوانین کی ایسی تشریح کرتے ہیں جس سے اکثریتی مذہب چھوڑنے یا کسی خاص فرقے یا گروہ کے خلاف پابندیوں اور سزاؤں کو درست ثابت کیا جا سکے۔ ایسے لوگوں کو دی جانے والی سزاؤں میں موت کی سزا، قید، ملازمت سے برخاستگی، شادی کی منسوخی اور بچوں کی سرپرستی سے محرومی جیسی سزائیں شامل ہیں۔ کئی مسلم اکثریتی ممالک میں جن میں سعودی عرب اور پاکستان بھی شامل ہیں، مذہب اسلام کو چھوڑنے پر ایسی قانونی پابندیاں عائد ہیں۔ تاہم یہ پابندی ہر جگہ کوئی ایسی ناگزیر نہیں ہے۔ مثال کے طور پر سرالیون میں مسلمانوں کی آبادی ستر (70) فیصد اور مسیحیوں کی آبادی بیس (20) فیصد ہے اور مذہب عوام میں مقبول بھی ہے۔ لیکن یہاں مذہب کو سیاسی رنگ نہیں دیا گیا اور دونوں مذاہب میں لوگوں کا ایک سے دوسرا مذہب

تبدیل کرنا ایک عام سی بات ہے۔

تبدیلیِ مذہب کی قانونی رکاوٹیں

اس طرح کے مسائل صرف مسلم اکثریتی ممالک تک محدود نہیں ہیں۔ وسطی افریقی جمہوریہ کے کچھ علاقوں میں نام نہاد بلاکا مخالف عسکریت پسندوں نے مسلمان اقلیت کے ارکان کو مسیحی بننے پر مجبور کرنے کے لیے جان سے مارنے کی دھمکیاں دی ہیں اور بھارت کی کئی ریاستوں میں تبدیلی مذہب کے لیے قانونی رکاوٹیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر، جو لوگ مذہب تبدیل کرنا چاہیں انہیں حکومتی اداروں سے اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا ہے۔

اور صرف حکومتیں ہی نہیں ہیں جو ان حقوق کو پامال کرتی ہیں۔ بھارت میں تشدد کے ایسے سخت واقعات پیش آئے ہیں جن میں ہندو قوم پرستوں نے مسیحی اور مسلمان آبادیوں پر حملہ کیا ہے اور کئی بار تشدد کے ذریعے مذہب تبدیل کروائے گئے ہیں۔ چند مثالوں میں بے گھر کر دیے جانے والے لوگوں کو صرف اسی صورت میں اپنے گھر واپس جانے کی اجازت دی گئی ہے کہ وہ اپنا مذہب تبدیل کر لیں۔

اسی طرح صرف مذہبی لوگوں کو ہی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ جو لوگ مذہبی تصورات پر یا مذہب اور ریاست کے تعلق پر تنقید کرتے ہیں، ان کے لیے بھی بڑے خطرات ہیں۔ حالیہ سالوں میں بنگلہ دیش میں کئی بلاگرز کو انتہا پسند گروہوں نے اس لیے قتل کر دیا کہ وہ مذہبی تصورات اور رسوم پر اور ریاست پر تنقید کرتے تھے۔ افسوس کہ بنگلہ دیشی حکومت کی کوششیں ان انتہا پسند گروہوں کو روکنے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکیں۔ کچھ حکومتیں مذہبی تصورات پر تنقید کرنے والے لوگوں پر حملوں کی مذمت کرنے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکیں۔ ان کی اس خاموشی سے یہی پیغام ملتا ہے کہ تشدد قابل قبول ہے اور اس کا جواز ہے۔

اپنے مذہب یا عقیدے کو تبدیل کرنے کی آزادی بین الاقوامی سطح پر کافی متنازع ہے۔ درحقیقت ہر بار جب اقوام متحدہ کی رکن ریاستیں کسی نئے معاہدے یا اعلامیے پر اتفاق کرتی ہیں تو اس

میں تبدیلی مذہب کے حق کا اظہار کمزور رہا ہے۔

لیکن کمزور زبان استعمال کرنے کے باوجود، اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی کمیٹی، جس کا کام ہی مختلف ممالک کو یہ رہنمائی فراہم کرنا ہے کہ وہ شہری اور سیاسی حقوق کے معاہدوں کی کیا تشریح کریں، کا یہ کہنا ہے 'ایک مذہب یا عقیدے کو رکھنے یا اختیار کرنے کی آزادی کا لازمی طور پر یہ مطلب ہے کہ کسی مذہب یا عقیدے کو منتخب کرنے کی بھی آزادی ہے جس میں اپنے موجودہ مذہب یا عقیدے کو تبدیل کر کے کوئی دوسرا مذہب اختیار کرنے سے لے کر لا مذہبیت اختیار کرنا اور یا اپنے مذہب یا عقیدے پر قائم رہنے کا حق بھی شامل ہے'۔

مختصر یہ کہ اقوام متحدہ کے مطابق اپنے مذہب یا عقیدے کو رکھنے یا بدلنے کا حق حتمی ہے۔ اس کو کسی بھی صورت میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود بعض حکومتیں اس حق کو محدود کرتی ہیں اور بہت سی مثالوں میں خاندان یا گروہ اپنا مذہب تبدیل کرنے والوں کو مختلف طرح سے نشانہ بناتے ہیں۔

۲۔ مذہب یا عقیدے کے اظہار کا حق

مذہب یا عقیدے کی آزادی کا دوسرا مرکزی عنصر تعلیم، عمل، عبادت اور مذہبی رسم میں اپنے عقیدے کے اظہار کی آزادی ہے۔ اسے مذہب یا عقیدے کی آزادی کے خارجی پہلو کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اپنے مذہب کو برقرار رکھنے یا بدلنے کے حتمی حق کے برخلاف مذہب کے اظہار کا یہ حق حتمی نہیں۔ بعض حالات میں اس حق کو محدود کیا جا سکتا ہے۔

اظہار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے ایمان یا عقیدے کا اظہار لفظوں یا عمل کے ذریعے کیا جائے۔ انسانی حقوق کا بین الاقوامی قانون لوگوں کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ عوامی یا نجی طور پر، اکیلے یا دوسروں کے ساتھ مل کر یہ اظہار کر سکیں۔ آپ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ نجی طور پر یا اجتماعی عبادات اور روایات کے ساتھ، اپنی کمیونٹی کے ساتھ مل کر عبادت کر سکیں اور اپنے مذہب کا اظہار کر سکیں۔

اسی طرح کمیونٹی کے بھی حقوق ہیں، اپنے ارکان پر نہیں بلکہ ریاست کے ساتھ تعلق کے حوالے سے۔ ان میں سے ایک بہت اہم حق یہ ہے کہ ریاست یہ یقینی بنائے کہ مذہبی یا عقائد کی حامل کمیونیٹیز اگر قانونی شناخت حاصل کرنا چاہیں تو کر سکیں۔ مطلب یہ کہ وہ اپنے بنک کے اکاؤنٹ کھول سکتی ہیں، لوگوں کو ملازمت دے سکتی ہیں، عمارتوں کی ملکیت حاصل کر سکتی ہیں اور ادارے چلا سکتی ہیں۔

مذہبی آزادی کی سرگرمیاں

افراد اور گروہوں کے لیے اپنے مذہب یا عقیدے پر عمل کرنے اور اس کا اظہار کرنے کے بہت سے مختلف راستے ہیں۔ اور اقوام متحدہ کے ماہرین نے بہت سی ایسی سرگرمیوں کی مثالیں پیش کی ہیں جن کا تحفظ کیا گیا ہے، جیسے:

- عبادت، تہوار اور دیگر مذہبی رسوم کے لیے جمع ہونا۔
- مذہبی لباس پہننا اور اپنے مذہب کے مطابق خصوصی خوراک استعمال کرنا۔
- عبادت خانوں، قبرستانوں وغیرہ کے لیے جگہ ہونا اور اپنی مذہبی علامات کی نمائش کرنا۔
- معاشرے میں اپنا کردار ادا کرنا، مثال کے طور پر رفاعی ادارے بنانا۔
- اپنے مذہب یا عقیدے کے بارے میں بات کرنا، اس کی تعلیم دینا، اور اپنے مذہبی قائدین کی تربیت اور تعیناتی کرنا۔
- اپنے مذہب یا اعتقاد کے بارے میں لٹریچر لکھنا، چھاپنا اور اسے پھیلانا۔
- قومی اور بین الاقوامی سطح پر اپنے مذہب سے متعلق مسائل پر بات کرنا۔
- رضاکارانہ ڈونیشن یا چندہ جمع کرنا۔

یہی وہ حقوق ہیں جو قریب سب لوگ اپنی کمیونٹی کے لیے چاہتے ہیں۔ تاہم سوال یہ ہے کہ کیا جو گروہ اپنے ارکان کو دباتے اور کنٹرول کرتے ہیں یا جو دوسروں کے خلاف نفرت اور تشدد کو ہوا دیتے ہیں، کیا وہ بھی اپنے اعتقادات کو پھیلانے اور عمل کرنے میں آزاد ہیں؟

اس کے دو جواب ہیں:

شہری اور سیاسی حقوق پر بین الاقوامی معاہدہ کی دفعہ ۵ کے مطابق کسی ایک حق کو دوسروں کے حقوق دبانے کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ چنانچہ مذہب یا عقیدے کی آزادی کسی ریاست، کسی شخص یا گروہ کو دوسرے لوگوں کو دبانے، تشدد پر ابھارنے یا پر تشدد کارروائیاں کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔

یقینا بہت سی حکومتیں اور گروہ طاقت اور دباؤ کے حربے استعمال کرتے ہیں۔ لیکن مذہب یا عقیدے کی آزادی سے انہیں یہ حق نہیں ملتا۔ اس کے برعکس اس آزادی کا وجود دباؤ اور تشدد کے ذریعے دبائے گئے لوگوں کا تحفظ کرتا ہے۔

دوسرا یہ کہ اگرچہ اپنے عقائد کو رکھنے یا بدلنے کا حق محدود نہیں کیا جاسکتا لیکن اپنے مذہب یا عقیدے کے اظہار اور اس پر عمل کو محدود کیا جاسکتا ہے۔ دفعہ 18 سے یہ وضاحت ہوتی ہے کہ ایسا صرف اسی وقت کیا جاسکتا ہے جب درج ذیل چار اصولوں کی پاسداری کی جائے:

۱۔ یہ تحدید قانون کے مطابق ہونی چاہیے، ۲۔ دوسرے لوگوں کے تحفظ کے لیے ضروری ہو، ۳۔ غیر امتیازی ہو، اور ۴۔ اس مسئلے کی مناسبت سے ہو جس کو حل کیا جانا ہے۔

یہ اصول نہایت اہم ہیں۔ ان کے بغیر حکومتیں کسی بھی ایسے گروہ یا مذہبی رسوم پر پابندی لگا سکتی ہیں جسے وہ پسند نہ کرتی ہوں۔

یہ پابندیاں یا تحدید ریاستی کنٹرول کے ایک ہتھیار کے طور پر نہیں بلکہ آخری چارہ کار کے طور پر لگائی جاتی ہیں۔ بد قسمتی سے بہت سی حکومتیں ان اصولوں کو پامال کرتی ہیں اور مذہب کے اظہار کے حق کی ریاستی پامالی کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔

رکاوٹیں پیدا کرنے والے رجسٹریشن کے قوانین ایک بڑا مسئلہ ہیں۔ کچھ حکومتیں رجسٹریشن کرانے کا تقاضا کرتی ہیں اور کسی مذہب یا عقیدے پر عمل کو رجسٹریشن سے مشروط کر دیتی

ہیں۔ اس سے بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ مذہب کے اظہار کی آزادی کو رجسٹریشن سے مشروط نہیں کرنا چاہیے۔ رجسٹریشن ان کمیونیٹیوں کو قانونی تشخص دینے کے لیے ہونی چاہیے، جو ایسا چاہیں۔

غیر رجسٹر شدہ مذہبی اظہارات پر پابندی

اکثر ایسی ریاستیں جو غیر رجسٹر شدہ مذہبی اظہارات پر پابندی لگاتی ہیں ان کے ہاں مذہبی گروہوں کی رجسٹریشن کو محدود کرنے کے لیے قانونی رکاوٹیں بھی موجود ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر قزاقستان میں غیر رجسٹر شدہ مذہبی سرگرمی پر پابندی ہے اور کئی مذہبی گروہ ایسے ہیں جن کی رجسٹریشن نہیں کی گئی۔ اسی طرح اپنے مذہب کے بارے میں اپنی کمیونٹی سے باہر کسی سے بات کرنا غیر قانونی ہے اور تمام مذہبی لٹریچر کو استعمال سے قبل سینسر کرنا ضروری ہے۔ اس سے تمام مذہبی کمیونٹیاں متاثر ہوتی ہیں۔

حکومتیں مذہبی رسوم پر عمل میں بے شمار مختلف طریقوں سے رکاوٹ ڈالتی ہیں۔ ویت نام کی حکومت نے ہاؤ ہاؤ بدھ مت کے پیروکاروں کو اپنے واحد پگوڈا عبادت خانے میں جانے سے روکنے کے لیے چیک پوسٹیں بنا رکھی ہیں۔ سعودی عرب میں غیر مسلم عوامی طور پر عبادت نہیں کر سکتے اور کچھ تارکین وطن کو عبادت کے لیے جمع ہونے پر چھاپہ مار کر گرفتار اور ملک بدر بھی کیا گیا ہے۔ چین اور انڈونیشیا کے کچھ علاقوں میں چرچ کی عمارات کو حکومتی اداروں نے گرا دیا ہے۔

انتہا پسند سماجی ذہنیت

انتہا پسندی کے خلاف روسی قوانین کے تحت ہزاروں مطبوعات پر پابندی لگائی گئی ہے جن میں وہ بہت سی مطبوعات بھی ہیں جو مذہبی اعتقادات کو امن پسندی کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ کسی متن کو چیک کرنا تقریباً ناممکن ہے لیکن کسی کے پاس اس کی موجودگی جرمانوں، قید یا کسی مذہبی کمیونٹی پر پابندی کا باعث بن سکتی ہے۔ کئی رکاوٹیں اس پر بھی ہیں کہ مذہبی اعتقادات کب کس کے

ساتھ اور کس کی طرف سے شئر کیے جا سکتے ہیں۔

فرانس میں کچھ قصبوں کے میئر ز نے عوامی جگہوں پر امن و امان کے نام پر بر کینی پر پابندی لگانے کی کوشش کی۔ بر کینی تالاب میں نہانے کا خواتین کا لباس ہے جو چہرے کے علاوہ سارا بدن ڈھانپتا ہے۔ یہ قانون اعلی ترین انتظامی عدالت نے منسوخ کر دیا لیکن عوامی جگہوں پر چہرے کے نقاب پر پابندی برقرار رکھی گئی۔ اس طرح کچھ یورپی ممالک میں حلال اور کوشر گوشت پر پابندی ہے۔

مذہب کے اظہار کا حق معاشرے میں لوگوں یا گروہوں کے بعض اقدامات سے بھی محدود ہوتا ہے۔ نو (9) یورپی ملکوں میں پانچ ہزار (5000) یہودیوں کے ساتھ کیے گئے ایک سروے کے مطابق، بائیس فیصد لوگوں نے کہا کہ وہ اپنے ذاتی تحفظ کے خوف کی وجہ سے مذہبی لباس جیسے کہ ان کی ٹوپی، پہننے سے اجتناب کرتے ہیں۔ اسی طرح بہت سے ممالک میں یہودی قبرستانوں کی بے حرمتی کی گئی ہے۔

مصر، پاکستان اور نائجیریا جیسے ممالک کے کچھ علاقوں میں لوگ عبادت خانوں میں جانے سے اس لیے خوف کھاتے ہیں کہ کہیں وہاں دہشت گرد اسلام کے نام پر پر تشدد حملہ نہ کر دیں۔ جبکہ سنٹرل افریقن جمہوریہ میں اجتماعی جمعہ کی نماز پڑھنا مسلمانوں کو نشانہ بنانے والے دہشت گردوں کے حملے کے خوف کی وجہ سے ناممکن ہے۔

مختصر یہ کہ مذہب یا عقیدے کے اظہار کی آزادی سے افراد اور گروہوں کے ان حقوق کا تحفظ ہوتا ہے کہ وہ اپنے مذہب یا عقیدے کا الفاظ اور اعمال کے ذریعے اظہار کر سکیں۔ یہ نجی اور عوامی دونوں سطحوں پر کیا جا سکتا ہے۔ انسانی حقوق کی دستاویزات میں ایسی بے شمار مثالیں دی گئی ہیں کہ کس طرح کی عبادات اور رسوم کا تحفظ موجود ہے اور ان میں سے گروہوں کا ایک بہت اہم حق ان کی مذہبی قانونی شناخت کا حق ہے۔

مذہب یا عقیدے کے اظہار کے حق کو محدود تو کیا جا سکتا ہے لیکن صرف اسی صورت میں کہ کچھ اصولوں پر سختی سے عمل کیا جائے جن سے یہ پتہ چلتا ہو کہ یہ تحدید قانونی ہے، دوسرے لوگوں

کے تحفظ کے لیے ضروری ہے، غیر امتیازی ہے اور اس مسئلے کی مناسبت سے ہے جسے حل کیا جانا ہے۔ بدقسمتی سے دنیا بھر میں بہت سی حکومتیں ان اصولوں کی پابندی نہیں کرتیں۔ اپنے مذہب یا عقیدے کے اظہار کے حق کو حکومتوں اور معاشرے کے بعض دوسرے گروہوں کی طرف سے پامال کیا جاتا ہے۔

۳۔ جبر سے تحفظ کا حق

مذہب یا عقیدے کی آزادی کا ایک اہم پہلو جبر سے تحفظ کا حق ہے۔ جبر کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی آپ کو کوئی کام کرنے پر مجبور کرنے کے لیے طاقت کا استعمال کرے۔ مذہب یا عقیدے کی آزادی کا ایک مرکزی پہلو یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنا مذہب یا عقیدہ رکھنے یا بدلنے کا حق ہے۔ اسی بات کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ مذہب یا عقیدہ اور اس کا اظہار رضاکارانہ ہوتا ہے۔

جبر سے تحفظ کا حق اسی کی مزید وضاحت کرتا ہے۔ کوئی بھی، خواہ وہ ریاست ہو، مذہبی رہنما ہوں، یا کوئی بھی اور شخص یا گروہ ہو، یہ حق نہیں رکھتا کہ وہ اپنے مذہب یا رسوم کو زبردستی یا جبر کے ساتھ آپ پر لاگو کرے۔ نہ ہی وہ آپ کو کوئی مذہب یا عقیدہ رکھنے، اختیار کرنے یا بدلنے پر مجبور کر سکتا ہے۔

شہری اور سیاسی حقوق کا بین الاقوامی معاہدہ، دفعہ 18، پیرا گراف 2

'کسی شخص پر کوئی ایسا دباؤ نہیں ڈالا جائے گا جس سے اپنی پسند کا مذہب یا عقیدہ رکھنے یا اختیار کرنے کی آزادی کو گزند پہنچے۔'

یہ پہلو نہ صرف ریاست کو لوگوں پر جبر کرنے سے روکتا ہے بلکہ یہ ریاستوں پر یہ فرض بھی عائد کرتا ہے کہ وہ دھمکیوں اور تشدد سے لوگوں کا تحفظ کریں جس کا سامنا انہیں معاشرے میں دوسرے لوگوں یا گروہوں سے ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود ہم دنیا میں دھمکیوں، تشدد اور جرمانوں یا قید کی سزاؤں جیسی جبر کی مثالیں دیکھتے ہیں۔ جبر کی کچھ شکلیں بالواسطہ بھی ہیں، جیسے مذہب کی

تبدیلی کے صلے میں نوکری دینا، یا کوئی مذہب چھوڑنے یا اختیار کرنے سے انکار پر صحت یا تعلیم تک لوگوں کی رسائی میں رکاوٹ ڈالنا۔

ریاستی جبر

بعض اوقات ریاست بھی جبر میں شامل ہوتی ہے، کبھی باقاعدہ قانون سازی کے ذریعے اور کبھی مقامی سطح پر اپنے افسروں کے اقدامات کے ذریعے۔

بہائی کمیونٹی ایران میں سب سے بڑی غیر مسلم مذہبی اقلیت ہے۔ 1979 کے انقلاب کے بعد سے بہائیوں کو منظم طور پر حکومت کی پالیسی کے تحت نشانہ بنایا جاتا ہے، اس لیے کہ وہ اسلام قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ انقلاب کے بعد کے دس سالوں میں دو سو (200) سے زیادہ بہائی قتل ہوئے۔ سینکڑوں تشدد کا نشانہ بنے یا انہیں قید کیا گیا اور لاکھوں لوگ اپنی نوکریوں، تعلیم اور دیگر حقوق تک رسائی سے محروم کیے گئے، صرف اور صرف اپنے مذہبی اعتقاد کی وجہ سے۔ دسمبر 2017 میں ایران میں 97 بہائی اپنے ضمیر کے قیدی تھے، جن میں 6 قومی سطح کے بہائی قائدین بھی شامل تھے۔

اس مثال سے امتیاز اور جبر میں تعلق کی وضاحت ہوتی ہے۔ ایران میں بہائیوں پر یونیورسٹی میں داخلے اور سول سروس میں ملازمت حاصل کرنے پر پابندی ہے۔ یہ امتیازی قانون جابرانہ ہے۔ اگر کسی طالب علم یا ملازم کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ بہائی ہے تو اس کے سامنے دو ہی راستے ہوتے ہیں، یا تو اسلام قبول کر لے یا اپنی پوزیشن سے محروم ہو جائے۔

بعض اوقات تشدد پر آمادہ قوم پرست یا انتہا پسند گروہ لوگوں کو اپنا مذہب یا عقیدہ بدلنے پر مجبور کرتے ہیں۔ نام نہاد اسلامک اسٹیٹ یا داعش نے یزیدیوں اور مسیحیوں دونوں کو اپنا مذہب بدلنے پر مجبور کیا ہے اور ایسا نہ کرنے والوں کو قتل کیا ہے۔ بھارت میں ہندو قوم پرستوں کے فرقہ وارانہ فسادات کے حوالے سے ہندومت میں جبری تبدیلی مذہب کے واقعات کو ریکارڈ کیا گیا ہے۔ میانمار میں ایسی مثالیں ریکارڈ کی گئی ہیں جن میں فوج نے بندوق کی نوک پر مسیحیوں کو مجبور کیا کہ وہ

اپنا مذہب چھوڑ کر بدھ مت اختیار کریں۔ سنٹرل افریقن ریپبلک میں مسلمانوں کو مسیحیت اختیار نہ کرنے پر جان سے مارنے کی دھمکیاں دی گئیں۔

اگرچہ جبر پر پابندی کا اطلاق رسمی طور پر مذہب یا عقیدہ رکھنے، اختیار کرنے یا بدلنے کی لوگوں کی صلاحیت پر ہوتا ہے لیکن بہت سے لوگ اپنے مذہب یا عقیدے پر عمل درآمد کے حوالے سے بھی ریاستی یا سماجی جبر کے تجربے سے گزرتے ہیں۔ ایک مسئلہ جس سے اس جبر کی وضاحت ہوتی ہے، اس کا تعلق عورتوں کے لباس سے ہے۔ کچھ ممالک قانونی طور پر عورتوں کو مذہبی لباس پہننے کا پابند کرتے ہیں جبکہ کچھ دوسرے ممالک ایسا کرنے پر پابندی لگاتے ہیں۔ خواتین مذہبی لباس پہننے پر اپنی کمیونٹی سے باہر کے لوگوں کی طرف سے ہراسیت کا شکار ہو سکتی ہیں اور نہ پہننے پر خود اپنی کمیونٹی کے لوگوں کی طرف سے۔

بہت سے مختلف لوگ جبر کا شکار ہو سکتے ہیں۔ کئی ملکوں میں جن لوگوں کے مذہبی خیالات اور رسوم ریاستی نظریے سے یا سماجی اقدار سے مختلف ہوتے ہیں، جبر سے متاثر ہوتے ہیں۔ اقلیتیں، ملحدین، مذہب تبدیل کرنے والے یا وہ لوگ جن کا مذہب غیر ملکی تصور کیا جاتا ہے اکثر جبر کا شکار ہوتے ہیں اور خود مذہبی گروہوں کے اندر، وہ لوگ جن کو اپنے مذہب پر تنقید یا توہین کرنے والا سمجھا جاتا ہے یا یہ کہ وہ اپنے مذہب پر درست عمل نہیں کر رہے، وہ بھی ریاست، اپنے خاندان یا کمیونٹی کی طرف سے اپنے اعتقادات اور اعمال بدلنے کے لیے جبر کا شکار ہو سکتے ہیں۔

مختصر یہ کہ جبر میں دھمکیاں، تشدد، امتیاز یا جرمانے یا قید کی سزائیں شامل ہو سکتی ہیں اور یہ جبر ریاست، لوگوں یا کمیونٹی کے گروہوں کی طرف سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ کہنے کا مطلب کہ کسی کو بھی جبر کا شکار نہیں ہونا چاہیے، یہ ہے کہ بین الاقوامی انسانی حقوق کا قانون نہ صرف ریاستوں کو لوگوں پر جبر کرنے سے روکتا ہے بلکہ وہ ریاستوں پر یہ فرض بھی عائد کرتا ہے کہ وہ موثر طریقے سے کام کرتے ہوئے لوگوں کا جبر سے تحفظ کریں اور معاشرے میں سے جبر کا خاتمہ کریں۔

۴۔امتیاز سے تحفظ

ایک حق جس کا قریبی تعلق مذہب یا عقیدے کی آزادی کے حق سے ہے، وہ امتیازی سلوک سے تحفظ کا حق ہے۔ امتیازی سلوک کا مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگوں کے ساتھ ان کے مذہب یا عقیدے کی وجہ سے دوسروں جیسا برابری کا سلوک نہ کیا جائے۔

بین الاقوامی انسانی حقوق کے قانون کا ایک مرکزی اصول یہ ہے کہ ریاستوں کو کسی کے ساتھ کسی بھی بنیاد پر، جن میں مذہب اور عقیدہ بھی شامل ہے، امتیازی سلوک کی اجازت نہیں ہے۔ شہری اور سیاسی حقوق پر بین الاقوامی معاہدہ (آئی سی سی پی آر) اور انسانی حقوق کے عالمی منشور کی دفعہ نمبر ۱۲اس کی وضاحت کرتی ہے۔

آئی سی سی پی آر، دفعہ 2، پیرا گراف 1

'اس میثاق میں شریک ہر ملک اپنے علاقے میں رہنے والے ہر فرد اور ان حدود کے اندر موجود ہر شخص کے ان حقوق کو تسلیم کرنے کا عہد کرتا ہے جو موجودہ میثاق میں تسلیم کیے گئے ہیں۔ اس میں نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب، سیاسی یا دوسرے نظریے، قومی یا معاشرتی جڑوں، جائیداد، پیدائش یا دوسری حیثیت کی بنا پر کسی قسم کا امتیاز نہیں برتا جائے گا۔'

چنانچہ مذہب یا عقیدے کی بنیاد پر امتیاز پر پابندی ہے۔ امتیاز پر پابندی جبر پر پابندی کا ہی عکس ہے۔ ریاست کے لیے نہ صرف یہ ضروری ہے کہ وہ خود اپنے اقدامات میں امتیاز سے باز رہے بلکہ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ موثر اقدامات کے ذریعے معاشرے سے امتیاز کا خاتمہ کرے۔

اس کے باوجود، مذہب یا عقیدے کی آزادی کے حق کی خلاف ورزی کا سب سے زیادہ عام تجربہ امتیازی سلوک کی صورت میں تقریباً ہر عقیدے اور مذہب والوں کو ہوتا ہے۔

سویڈن میں محققین نے دریافت کیا ہے کہ وہاں یہودیوں کو کوئی نوکری ملنے کا امکان دوسروں سے 26 فیصد کم ہے جبکہ مسلمانوں کے لیے یہ امکان 30 فیصد کم ہے۔ یہ سوال کہ آجروں

کے لیے اپنے سٹاف پر مذہبی علامات جیسے صلیب یا حجاب پہننے پر پابندی لگانا، کب اور کیسے امتیاز قرار پائے گا، بھی بہت اہم ہے۔ اور یہ سوال یورپی عدالتوں اور اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کی کمیٹی میں کئی بار موضوعِ بحث بن چکا ہے۔

امتیازی سلوک کی شکلیں

امتیاز یا امتیازی سلوک کی بہت سی شکلیں ہیں۔ کبھی یہ ریاست کی طرف سے کسی ایک مذہب کو فوقیت دینے کی صورت میں ہے، جس کی ایک مثال مختص کردہ ریاستی وسائل کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرتے ہوئے امتیاز سے کام لینا ہے۔ کبھی یہ امتیاز زیادہ سخت شکل اختیار کرتا ہے جس سے دوسروں کے حقوق پامال ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر جب کچھ گروہوں کو قانونی شناخت حاصل کرنے سے یا اپنی عبادت گاہ کی تعمیر سے روک دیا جائے۔ مذہب یا عقیدے کی بنیاد پر ریاستی امتیاز سے صرف مذہبی سرگرمیاں ہی متاثر نہیں ہوتیں۔ اس سے زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہو سکتا ہے، مثلاً شادی، بچے کی حوالگی یا ملازمتوں، رہائشی اسکیموں، رفاعی خدمات یا انصاف جیسے شعبے میں امتیاز۔

کئی ملکوں میں لوگوں کے شناختی کارڈ پر ان کا مذہب لکھا ہوتا ہے۔ اس سے اقلیتوں کو ہر اس وقت امتیازی سلوک کا سامنا ہو سکتا ہے جہاں بھی انہیں اپنا شناختی کارڈ دکھانا پڑے۔

انڈونیشیا کے کچھ علاقوں میں ہندوؤں کو اپنی شادی یا پیدائش کی رجسٹریشن کے لیے کافی دور جانا پڑتا ہے کیونکہ مقامی افسران ان کی رجسٹریشن نہیں کرتے اور مسیحیوں کو اپنے چرچ کی تعمیر و مرمت کی اجازت حاصل کرنے میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ قومی عدالتیں اکثر مسیحیوں کے حق میں فیصلے دیتی ہیں لیکن مقامی افسران اکثر ان کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور بعض اوقات اس کی وجہ انتہا پسند گروہوں کا خوف ہوتا ہے۔

پاکستان میں قوانین نے احمدی کمیونٹی کے لیے اپنے مذہب کی تبلیغ و اشاعت کو جرم بنا دیا ہے اور ان کو ووٹ کا حق بھی حاصل نہیں ہے۔

کینیا میں انسانی حقوق کی تنظیموں کا کہنا ہے کہ ملک میں دہشت گردی کے خلاف لڑائی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ سیکیورٹی فورسز کی طرف سے مسلمانوں کو بڑے پیمانے پر ٹارگٹ کیا جاتا ہے اور اجتماعی طور پر سزا دی جاتی ہے۔ بے جا گرفتاریوں، تشدد، قتل اور غائب کر دینے کی رپورٹس موجود ہیں جن کا حکومت انکار کرتی ہے۔

میانمار کے بائیس دیہاتوں میں مقامی بدھسٹ مونکس نے اپنے دیہات کو مسلمان فری علاقے قرار دے دیا ہے اور سائن پوسٹ لگا دیے ہیں کہ گاؤں میں مسلمان کا داخلہ اور رات گزارنا منع ہے، مقامی لوگوں پر مسلمانوں سے شادی کرنے پر بھی پابندی لگا دی ہے اور نفرت انگیز پراپیگنڈا کیا جاتا ہے۔ حکمرانوں یا انتظامیہ نے ان چیزوں کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

اکثر لوگوں کو ایک سے زیادہ وجوہات کی بنا پر امتیازی سلوک کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، ان کے مذہب کی بنیاد پر بھی اور ان کی نسل، ذات، جنس اور طبقاتی فرق کی بنیاد پر بھی۔ انسانی حقوق کی زبان میں اسے انٹر سیکشنل (بین الشعبہ جاتی) امتیاز کا نام دیا جاتا ہے۔ اس سے کچھ گروہ مذہب اور عقیدے کی آزادی کی خلاف ورزیوں کی زد میں زیادہ آجاتے ہیں۔ مثال کے طور پر، خواتین، قدیمی مقامی لوگ (انڈیجنس لوگ)، نسلی اور لسانی اقلیتیں اور ایل جی بی ٹی کمیونٹی، مہاجر اور آبادکار۔

بھارت میں انٹر سیکشنل امتیاز کی ایک مثال

ہندوؤں کا ذات پات کا نظام ایک طے شدہ طبقاتی نظام ہے جس میں لوگوں کو اونچی اور کم تر ذاتوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ان میں دلت بھی شامل ہیں جنہیں کوئی بھی ذات رکھنے کے قابل نہیں سمجھا گیا۔ دلت عام طور پر غریب ترین لوگ ہوتے ہیں جنہیں سخت ترین سماجی اور معاشی امتیاز کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگرچہ اس نظام کی جڑیں ہندومت میں ہیں، طبقاتی نظام پورے بھارتی معاشرے میں سرایت کر چکا ہے اور تمام مذاہب کے ماننے والوں کو کسی خاص ذات یا طبقے کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، بہت سے بھارتی مسیحی اور مسلمان دلت ذات سے تعلق رکھتے ہیں۔

جب بھارت نے آزادی حاصل کی تو حکومت نے طبقاتی نظام پر پابندی لگادی اور طبقاتی امتیاز کا مقابلہ کرنے کے لیے مثبت اقدام کا نظام متعارف کرایا۔ (مثبت اقدام کا مطلب ان لوگوں کو ترجیح دینا ہے جو پہلے امتیاز کا شکار رہے ہوں۔)۔ اس نظام کے تحت سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں دلتوں کا کوٹہ مقرر کیا گیا اور کئی رفاعی فوائد ان کے لیے رکھے گئے۔ بظاہر یہ بہت اچھا لگتا ہے۔ لیکن یہ فوائد صرف ہندو دلتوں یا دلت ذات والے سکھ اور بدھسٹوں کو پہنچائے گئے لیکن دلت ذات ہی کے حامل مسلمانوں اور مسیحیوں کو ان فوائد سے محروم رکھا گیا۔

مسیحی اور مسلمان دلتوں کو دوہرے امتیاز کا سامنا ہے، ایک تو ان کی ذات کی وجہ سے اور دوسرا ان کے اقلیتی مذہب کی وجہ سے۔ ان کے خلاف ریاست کی طرف سے بھی، ان کے مذہب کی بنیاد پر انہیں مثبت اقدام سے باہر رکھ کر جو طبقاتی نظام کا مقابلہ کرنے کے لیے ہی بنایا گیا تھا، امتیاز کیا جاتا ہے۔ یہ مسیحی اور مسلمان دلتوں کی معاشی اور سماجی ترقی پر اثر انداز ہوتا ہے۔

مختصر یہ کہ ریاستوں کو مذہب یا عقیدے کی بنیاد پر لوگوں کے ساتھ امتیاز کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ ان کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ معاشرے سے امتیاز کو روکنے اور اس کا خاتمہ کرنے کے لیے موثر اقدامات کریں۔ امتیاز کی بہت سی شکلیں ہیں اور یہ زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کرتی ہیں۔ اکثر لوگ متعدد اور انٹر سیکشنل وجوہات سے، جن میں ان کا مذہب اور عقیدہ بھی شامل ہے، امتیاز کا سامنا کرتے ہیں۔

۵۔ والدین اور بچے کے خصوصی حقوق

شہری اور سیاسی حقوق پر بین الاقوامی معاہدہ کی دفعہ 18 میں مذہب اور عقیدے کی آزادی کے حوالے سے والدین اور بچوں کے خصوصی حقوق کی وضاحت کی گئی ہے۔ والدین اور قانونی سرپرستوں کو اپنے بچوں کو مذہبی اور اخلاقی تعلیم دینے کا حق حاصل ہے اور یہ بھی کہ وہ اپنی گھریلو زندگی کو اپنے عقائد کے مطابق چلائیں۔

لیکن صرف بڑوں کو ہی انسانی حقوق حاصل نہیں ہیں! بچوں کو بھی مذہب یا عقیدے کی

آزادی کا حق حاصل ہے۔۔۔مثال کے طور پر کسی مذہبی کمیونٹی کی زندگی کا حصہ ہونااوران کی مذہبی عبادات اور تہواروں میں شامل ہونا۔بچوں کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے والدین اور سرپرستوں کی خواہشوں کے مطابق مذہبی تعلیم حاصل کر سکیں۔انہیں ان کے والدین کی مرضی کے خلاف کسی لازمی مذہبی ہدایات میں شریک ہونے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا اور جب بچے بڑے ہو جائیں تو خود ان کی اپنی خواہشات کو مدنظر رکھنا بھی ضروری ہے۔

ان حقوق کی پامالی کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔وسطی ایشیا کے ممالک میں، سوویت ماضی کے ایک ورثے کے طور پر حکومتوں کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ معاشرے کے ہر پہلو کو کنٹرول کریں۔ مثال کے طور پر تاجکستان میں قانونی طور پر اٹھارہ سال سے کم عمر کے بچوں کو کسی بھی مذہبی عبادت یا تقریب میں شامل ہونے کی اجازت نہیں ہے، سوائے جنازے میں شرکت کے۔اور کئی وسطی ایشیائی ریاستوں میں حکومتوں نے سکول جانے والے ان بچوں کی تفتیش کی ہے اور ہراساں کیا ہے جو مسجدوں یا مسیحی چرچوں میں گئے یا جو سمر کیمپ جیسی سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں،اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے بچوں کو سکولوں میں سب کے سامنے مذمت کا نشانہ بنایا ہے۔

تو کچھ حکومتیں بچوں کو مذہب پر عمل سے روکتی ہیں۔کچھ اور حکومتیں اقلیتی مذاہب سے تعلق رکھنے والے بچوں کو مذہبی ہدایات میں شرکت کرنے پر اس لیے مجبور کرتی ہیں کہ انہیں اکثریتی مذہب قبول کروایا جائے۔ حالانکہ حکومتوں کا یہ فرض ہے کہ یہ یقینی بنائیں کہ بچے لازمی مذہبی ہدایات میں شرکت سے نہ صرف نظری بلکہ عملی طور پر استثنا حاصل کر سکیں۔

ترکی میں مذہبی ثقافت اور اخلاقیات کے نصاب میں کچھ اصلاحات کے باوجود لازمی مذہبی ہدایات شامل ہیں۔یہودی اور مسیحی طلبہ کو نظری طور پر اس سے استثنا حاصل ہے لیکن یہ استثنا حاصل کرنا عملی طور پر بہت مشکل یا ناممکن ہو سکتا ہے۔جبکہ ،علوی، بہائی، لامذہب، ملحد خاندانوں کے طلبہ کو بھی، جن کے اپنے اعتقادات ہیں، ان کلاسز میں شرکت پر مجبور کیا جاتا ہے۔ان تمام مثالوں میں والدین اور بچوں کے حقوق پامال ہوتے ہیں۔

بچے کے حقوق پر معاہدہ (سی آر سی) ہونے سے قبل بین الاقوامی انسانی حقوق کے قانون میں بچے کے حقوق کو خاص طور پر موضوع نہیں بنایا گیا تھا۔ مذکورہ بالا معاہدے (کنونشن) نے اس صورت حال کو تبدیل کیا اور اس پر زور دیا کہ بچے بھی حقوق رکھتے ہیں اور دفعہ 14 کی رو سے وہ مذہب یا عقیدے کی آزادی کا حق بھی رکھتے ہیں۔

دفعہ 14 میں بچوں کو آزاد لیکن زد پذیر قرار دیا گیا ہے جنہیں اپنے مذہب یا عقیدے کی آزادی کو استعمال کرنے کے لیے والدین یا سرپرستوں کی مدد اور رہنمائی کی ضرورت ہے، خاص طور پر جب اس کا تعلق ریاست کے ساتھ ہو۔

اس کنونشن کے مطابق تمام معاملات کو دیکھنے کا اصول یہ ہے کہ بچے کا بہترین مفاد کس میں ہے۔ یہ بچوں کے اس حق پر بھی زور دیتا ہے کہ وہ ان تمام معاملات میں اپنی رائے دے سکتے ہیں جن سے وہ متاثر ہوتے ہیں۔ جو بھی ہو، یہ اکثر بالغ، خاص طور پر والدین ہوتے ہیں جو یہ طے کرتے ہیں کہ بچوں کے بہترین مفادات کیا ہیں اور پھر ان کی طرف سے بات کرتے ہیں۔

تاہم بعض اوقات بچوں اور والدین کے مفادات مختلف ہو سکتے ہیں۔ ایسے کیسز میں مذہب یا عقیدے کی آزادی کے بچوں کے حق کو والدین کے اسی حق کے ساتھ توازن قائم کرنا پڑے گا۔ مثال کے طور پر کس عمر میں بچے کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مذہبی عبادت، رسم یا عقیدے کے بارے میں فیصلہ کر سکے۔ مثلاً کیا وہ چرچ جانا چاہتے ہیں؟

بچوں کے حقوق پر کنونشن کے مطابق مذہب یا عقیدے کے معاملات میں والدین کی ہدایات بچے کی بڑھتی ہوئی صلاحیتوں کے مطابق ہونی چاہییں۔ دوسرے لفظوں میں بچہ جوں جوں بڑا اور سمجھدار ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ آزادی انہیں حاصل ہونی چاہیے۔

بین الاقوامی قانون کے مطابق، بلوغت کی عمر اٹھارہ سال ہے۔ لیکن بچے جیسے بڑے ہو رہے ہوتے ہیں تو کس حد تک آزادی اور ذہنی پختگی وہ حاصل کرتے ہیں اس کا بڑی حد تک تعلق ان کی ثقافت اور ان کے سیاق وسباق سے ہے۔ مختلف ممالک میں مختلف قوانین اور ضابطے ہیں۔ مثال کے

طور پر سویڈن میں بچے کو بارہ سال کی عمر کے بعد ان کی مرضی کے خلاف کسی مذہبی کمیونٹی کا حصہ نہیں بنایا جاسکتا۔

بچے کے حقوق پر کنونشن نے ایک عالمی اصول یہ طے کر دیا ہے جس کا والدین کو بچوں کی پرورش میں خیال رکھنا ضروری ہے۔۔اور وہ اصول یہ ہے کہ مذہب یا عقیدے پر کوئی عمل ایسا نہ ہو جو بچے کی جسمانی اور ذہنی صحت کو نقصان پہنچائے یا بچے کی ترقی میں رکاوٹ ہو۔

مذہب اور عقیدے کی آزادی کے والدین کے حقوق اور بچوں کے حقوق سے متعلق زیادہ کیسز عدالتوں میں نہیں جاتے۔تاہم یہووا کے گواہوں کی کمیونٹی کے والدین کے اس حق کے خلاف کہ وہ بچوں کو ضرورت پڑنے پر خون لگوانے سے روک دیں، عدالت کے فیصلے کی مثال موجود ہے۔ عدالت نے اس مثال میں والدین کے مذہب یا عقیدے کی آزادی کے حق کے خلاف بچے کی زندگی کے حق میں فیصلہ دیا۔

بچوں کو مذہب یا عقیدے کی آزادی کا حق حاصل ہے اور والدین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے اعتقادات کے مطابق بچوں کی پرورش کریں۔ یہ اس انداز میں ہونا چاہیے کہ بچے کی بڑھوتری کے مطابق ہو اور مذہب یا عقیدے پر عمل سے اس کی جسمانی اور ذہنی صحت اور اس کی ترقی کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ ان حقوق کی پامالی کی مثالوں میں وہ ریاستیں شامل ہیں جو بچوں کو مذہب پر عمل سے روکتی ہیں اور وہ ریاستیں جو اقلیتی مذہب کے بچوں پر اکثریتی مذہب کی ہدایات کو زبردستی لاگو کرتی ہیں۔

۶۔ ضمیر کے مطابق انکار کا حق

شہری اور سیاسی حقوق کے کنونشن کی دفعہ اٹھارہ میں مذہب اور عقیدے کی آزادی کے ساتھ ساتھ فکر اور ضمیر کی آزادی کا تحفظ بھی موجود ہے۔ چنانچہ اپنے ضمیر کے مطابق انکار کرنے کا حق بھی مذہب اور عقیدے کی آزادی کا حصہ ہے۔

ضمیر کے مطابق انکار کی آزادی کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایسا کام کرنے سے انکار کرنا جس کو کرنے سے آپ کے ضمیر یا مذہبی عقیدے کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔

عام طور پر جن کاموں سے انکار کا حق رکھنے کا لوگ دعویٰ کرتے ہیں ان میں مثال کے طور پر، لازمی فوجی سروس، حلف اٹھانے، تبدیلی خون یا کسی میڈیکل پروسیجر میں شرکت سے انکار جیسے کام شامل ہیں۔ اقوام متحدہ کی دستاویزات میں ضمیر کے مطابق انکار کی جس واحد شکل کا ذکر کیا گیا ہے، وہ لازمی فوجی سروس سے انکار ہے۔ اور یہ بھی نہ تو اقوام متحدہ کے قانونی طور پر پابند بنانے والے معاہدوں یا کنونشن میں ہے اور نہ ہی انسانی حقوق کے عالمی اعلامیے میں۔ بلکہ اس کا ذکر اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کی کمیٹی کے کمنٹ نمبر 22 میں موجود ہے۔ یہ دستاویز اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے ماہرین نے یہ وضاحت کرنے کے لیے لکھی ہے کہ ریاستوں کو شہری اور سیاسی حقوق کے بین الاقوامی معاہدے کی دفعہ 18 کو کس طرح سمجھنا ہے۔ اس کمیٹی کے مطابق دفعہ اٹھارہ لازمی فوجی سروس جس کا تقاضا کسی کو مارنا ہو، سے ضمیر کے مطابق انکار کے حق کی حمایت کرتی ہے کیونکہ یہ آپ کے ضمیر کی آزادی اور اپنے مذہب یا عقیدے کے اظہار کے حق سے متصادم ہے۔

بہت سے ممالک اس حق کو تسلیم کرتے ہیں اور متبادل قومی سروس یا استثنا کی اجازت دیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ایسی ریاستیں بھی ہیں جو اپنے ضمیر یا نظریے کی بنیاد پر لازمی فوجی سروس کرنے سے انکار کرنے والوں کو قید کر دیتی ہیں۔ یہوواہ کے گواہوں کی کمیونٹی اس سے سب سے زیادہ متاثر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر دسمبر 2016 میں اپنے ضمیر کے مطابق لازمی فوجی سروس سے انکار کرنے پر جنوبی کوریا میں یہوواہ کے گواہوں کی کمیونٹی کے 389 لوگ جیل میں قید کی سزائیں کاٹ رہے تھے۔

اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے اداروں کے مطابق، غیر فوجی سروس کے متبادل انتظامات تک ضمیر کے مطابق، سب انکار کرنے والوں کو کسی امتیاز کے بغیر رسائی حاصل ہونی چاہئے اور لازمی فوجی سروس سے متاثر ہونے والوں کو ان کے ضمیر کے مطابق انکار کے حق کو استعمال کرنے کے بارے میں معلومات تک بھی رسائی ہونی چاہیے۔ ایسے لوگوں اور رضاکاروں کو لازمی فوجی سروس

سے پہلے اور اس کے دوران بھی اس سے انکار کے قابل ہونا چاہیے۔

اپنے ضمیر کے مطابق فوجی سروس سے انکار کے علاوہ ضمیر کے مطابق انکار کی دیگر شکلوں کو اکثر قومی سطح پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کا تعلق زیادہ تر صحت کے شعبے سے ہے، جیسے وہ دائیاں اور ڈاکٹر جو ابارشن کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ بعض ممالک میں ضمیر کے مطابق انکار کا مسئلہ ہم جنس شادیوں کے معاملے میں بھی اٹھایا گیا ہے۔ کبھی کبھار جب یہ حق دیگر حقوق سے ٹکراتا ہو تو مشکل سوالات سامنے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر، اگر ضمیر کے مطابق انکار کا حق خواتین کے حقوق سے ٹکراتا ہو یا امتیازی سلوک کے خلاف قانون سازی کے ساتھ متنازع ہو۔

ضمیر کے مطابق انکار کی بین الاقوامی قانونی ہدایات

ضمیر کے مطابق اس طرح کے انکار کے حق کے بارے میں کوئی واضح بین الاقوامی قانونی ہدایات موجود نہیں ہیں۔ دراصل یہ مسئلہ کافی متنازع ہے۔

ذیل میں تین طرح کے دلائل پیش کیے جارہے ہیں جن کا کسی کو سامنا ہو سکتا ہے:

کچھ لوگوں کے مطابق ضمیر کے مطابق انکار کا حق آپ کے مذہب یا عقیدے کی آزادی کے حتمی حق کا لازمی حصہ ہے جس کو کبھی بھی محدود نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا کہنا ہے کہ اپنے ضمیر کے مطابق عمل کرنے کا نتیجہ کسی قیمت یا سزا کی صورت میں نہیں نکلنا چاہیے۔ بہر حال یہ درست ہے کہ نظریاتی طور پر جنگ کے کسی سچے مخالف (پیسیفسٹ) کو ایک فوجی بننے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا کیونکہ جنگ کے مخالفین کو فوجی بننے پر مجبور کرنے سے مذہب یا عقیدہ رکھنے کے ان کے داخلی اور مُطلق حق کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔

کچھ دوسروں کے مطابق، یہ حق ضرور مُطلق ہے لیکن حالات کی بھی اہمیت ہے۔ ان کی دلیل ہے کہ لازمی فوجی سروس میں آئے ہوئے، قیدی اور دوسرے جن کو اپنی صورت حال پر کوئی اختیار حاصل نہیں ہے، ان کو اپنے ضمیر کی خلاف ورزی کرنے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن وہ

لوگ جو خود کسی نوکری کی درخواست دیتے ہیں اور اسے کبھی بھی چھوڑ سکتے ہیں وہ اپنے آجر سے اپنے ضمیر کے مطابق کام کروانے کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ دوسرے لفظوں میں، اپنے ضمیر پر عمل کرنے کا انتخاب کرنے کی ایک قیمت ہے۔

کچھ اور لوگوں کی دلیل یہ ہے کہ ضمیر کے مطابق انکار ایک عمل ہے اور جو آپ کے ضمیر، مذہب یا عقیدے کا اظہار ہے۔ اور اس اظہار کو وہاں محدود کیا جا سکتا ہے جہاں ایسا کرنا دوسروں کے حقوق اور آزادی، عوام کی صحت، نظم و نسق یا اخلاق کے لیے ضروری ہو۔ جہاں تک ضمیر کے مطابق فوجی سروس سے انکار کا تعلق ہے وہاں یہ جاننا اہم ہے کہ قومی سلامتی کی بنیاد پر، مذہب یا عقیدے کی آزادی کو محدود کرنے کی کوئی جائز وجہ نہیں ہے۔

قانونی ماہرین کا اس پر اتفاق نہیں ہے کہ ان تینوں دلائل میں سے کون سی دلیل درست ہے۔

ضمیر کے مطابق انکار کا حق ایسا حق ہے جس کے تحت آپ وہ کام کرنے سے انکار کر دیں جس کے کرنے کی عام طور پر آپ سے توقع کی جاتی ہے۔ بین الاقوامی انسانی حقوق کے قانون میں اپنے ضمیر کے مطابق لازمی فوجی سروس سے انکار کرنے کا تحفظ کیا گیا ہے۔ کئی ممالک اس حق کو تسلیم کرتے ہیں اور کئی ایسا کرنے والوں کو جیل میں ڈال دیتے ہیں۔ کئی اور ریاستیں اپنے ضمیر کے مطابق انکار کرنے کے حق کی دیگر شکلوں کو قومی سطح پر تسلیم کرتی ہیں۔ تاہم یہ حقوق متنازع ہیں اور اس موضوع پر بین الاقوامی قانون ابھی مکمل مرتب نہیں ہوا۔

۷۔ مذہب یا عقیدے کی آزادی کی حدود

بہت سی حکومتیں مذہب یا عقیدے کی آزادی پر پابندیاں لگاتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مذہبی اظہارات پر پابندی کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے۔ تو ہم کیسے جان سکتے ہیں کہ یہ پابندیاں درست ہیں جن کی اجازت دی جا سکتی ہے یا نہیں۔

انسانی حقوق کے بین الاقوامی قانون کے مطابق، کوئی مذہب یا عقیدہ رکھنے، تبدیل کرنے،

اختیار کرنے یا چھوڑنے کا حق حتمی اور مطلق ہے جس کو کبھی محدود نہیں کیا جاسکتا۔ تاہم دوسری طرف کسی مذہب یا عقیدہ کا اظہار کرنے کا حق محدود کیا جاسکتا ہے لیکن صرف اس وقت جب درج ذیل چار اصولوں کی پابندی کی گئی ہو:

1۔ ایسی تمام حدوں یا پابندیوں کا تعین قانون میں کیا گیا ہو۔

اس کا مقصد ریاستوں، پولیس اور عدالتوں کو غیر متوقع طور پر یا عدم تسلسل کے ساتھ کوئی عمل کرنے سے روکنا ہے۔

2۔ یہ حدیں عائد کرنا عوام کے تحفظ، امن عامہ، صحت یا اخلاق یا دوسروں کے مذہب یا عقیدے کے تحفظ کے لیے ضروری ہو۔

یہ بہت اہم ہے۔ کچھ حدود کو اس لیے لاگو کرنا کہ یہ دوسرے لوگوں کے تحفظ کے لیے ضروری ہے، ووٹ حاصل کرنے کے لیے پابندیاں لگانے سے بہت مختلف ہے۔

3۔ یہ پابندیاں یا حدود امتیازی نہ ہوں۔

4۔ اور کوئی بھی حدود یا پابندیاں اس مسئلے کی مناسبت سے ہوں جو کسی مذہب یا عقیدے کے اظہار کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

یہ اصول بہت اہم ہیں۔ ان کے بغیر حکومتیں جس گروہ یا رسم / عمل پر جسے وہ پسند نہ کرتی ہوں، جب چاہیں اور جیسے چاہیں پابندی لگا دیں۔ یہ پابندیاں ریاستی کنٹرول کے لیے نہیں بلکہ ایک آخری چارہ کار کے طور پر ہیں۔

آیئے ایک فرضی مثال کے ذریعے سمجھتے ہیں کہ ان اصولوں کا کیا مطلب ہے۔

ایک ایسے قصبے کا تصور کریں جہاں پانچ مختلف مذاہب کے لوگ رہتے ہیں۔ ان سب کی اپنی عبادت گاہیں ہیں جہاں سے سب کی اپنی اپنی طرح مخصوص اونچی آوازیں باہر آتی ہیں جن سے باقی پڑوسی پریشان ہوتے ہیں۔ لیکن پولیس کو صرف ایک چھوٹے اور غیر مقبول مذہبی گروہ کے بارے

میں شکایات موصول ہوتی ہیں۔

اونچی آوازوں کا شور صحت اور عوامی صحت کے لیے مضر ہے اور اس پر پابندی لگانے کا جواز موجود ہے۔ چنانچہ مقامی انتظامیہ کو کیا کرنا چاہیے؟ کس طرح کی پابندیاں ضروری، غیر امتیازی اور عوامی صحت کے تحفظ کے لیے مناسب ہیں؟

اس معاملے میں، ایک عام قانون جو عوامی اجلاس کے لیے آوازوں کی سطح کا تعین کرے مناسب ہے۔ ایک ایسا قانون جو تمام مذہبی گروہوں اور دوسروں کے لیے یکساں نافذ ہو۔ اگر کوئی بھی گروپ اپنی آوازوں کو مقررہ حد سے بڑھاتا ہے تو مناسب ہوگا کہ ان آوازوں کی سطح کم کی جائے یا ان پر جرمانہ عائد کر دیا جائے۔ تاہم یہ مناسب نہیں ہوگا کہ ان سے مکمل خاموش ہو جانے کا مطالبہ کیا جائے یا انہیں عوامی اجلاس بلانے سے ہی یکسر منع کر دیا جائے۔

اور پولیس کو یہ قانون صرف ایک غیر مقبول مذہبی گروہ کے خلاف نہیں جس کے خلاف شکایت ملی، بلکہ سب پر یکساں لاگو کرنا ہوگا۔

یہ ایک چھوٹی اور سادہ سی مثال ہے۔ جب ہم مذہب یا عقیدے کی آزادی کی بڑی بڑی خلاف ورزیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو جب پابندیاں واضح طور پر غیر ضروری، امتیازی اور غیر مناسب ہوں تو ان میں عام طور پر انہی اصولوں کو نظر انداز کیا گیا ہوتا ہے۔

کچھ ممالک ایسی تمام مذہبی سرگرمیوں پر پابندی لگا دیتے ہیں جو اس مقصد کے لیے رجسٹر شدہ عمارت کے باہر وقوع پذیر ہوں۔ اس سے وہ شکرانے کی دعا بھی غیر قانونی ٹھہرتی ہے جو لوگ اپنے مہمانوں کے ساتھ کھانے سے پہلے پڑھتے ہیں۔ اس طرح کی پابندی یقیناً درست نہیں ہے۔

لیکن بہت سے ایسے معاملات ہیں جو متنازع ہیں۔ کیا فرانس میں ایک ٹاؤن میئر کے لیے ٹھیک ہے کہ وہ برکینی پر پابندی لگائے، جو تالاب میں تیرنے کا ایک ایسا لباس ہے جس میں چہرے کے علاوہ پورا جسم ڈھانپا جاتا ہے؟ یا بھارت کے کچھ علاقوں میں انتظامیہ دوسروں کو اپنے عقیدے کے بارے میں بتانے پر پابندی لگا سکتی ہے؟

آخری بات

مذہبی آزادی اور مختلف مذاہب یا غیر مذاہب کے درمیان تعامل کا سوال مذہبی معاشروں میں بھی اور غیر مذہبی معاشروں میں بھی نہایت پیچیدگی کا حامل ہے کیونکہ اس کا سامنا صدیوں کی پختہ روایتوں، انسانوں کے ذہنی اور مذہبی اور سماجی میلان، ان کے مفادات کے تحفظ، برتری اور غلبے کی نفسیات، طاقت اور اختیار کے حصول کی خواہش اور جدوجہد سے ہے۔ تاہم شائد ان آزادیوں کو عالمگیر انسانی حقوق کے تناظر میں سمجھنے سے اور دنیا بھر میں موجود تنوع کو تسلیم کرنے سے بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ انسانی حقوق کا عالمگیر تصور انسانی تاریخ میں مساوات اور امن قائم کرنے کی طرف ایک انقلابی پیش رفت ضرور ہے، تاہم اس کو عملی اور مثالی طور پر رائج کرنے کے لیے ابھی کافی فاصلہ طے کرنے کی ضرورت ہے۔

کسی ایک گروہ کے بارے میں جاننا ان کے وسیع تر تناظر کو سمجھے بغیر ناممکن ہے۔ اس میں یہ جاننا بھی شامل ہے کہ وہاں دیگر مذہبی گروہ کس طرح متاثر ہوئے ہیں۔ کوئی ایسے ممالک نہیں ہیں جہاں کسی صرف ایک ہی مذہبی کمیونٹی یا گروہ کے حقوق پائمال ہوئے ہوں۔ تمام مثالوں میں، مختلف انداز اور مختلف سطح پر، متعدد گروہ متاثر ہوتے ہیں

اسی طرح جب معلومات کا مطالعہ کیا جائے تو پراپیگنڈے اور تعصب کے خطرے سے بھی آگاہ رہنا ضروری ہے۔ کچھ حکومتیں پراپیگنڈے، دھمکی اور جبر کے ذریعے انسانی حقوق کے بارے میں معلومات اور خبروں کا راستہ روکتی ہیں۔ چنانچہ قومی حکومتوں کی طرف سے اپنے ہی ملک کی صورت حال کے بارے میں دی جانے والی معلومات ممکن ہے قابل اعتبار نہ ہوں۔ کبھی کبھار غیر ملکی حکومتوں یا مذہبی اور سول سوسائٹی کے کارکنوں کی طرف سے فراہم کردہ معلومات بھی تعصب پر مبنی یا گمراہ کن ہو سکتی ہیں۔ کبھی کبھی ارادتاً سیاسی تعصب ہو سکتا ہے۔ کبھی کسی صورت حال کے بارے میں گمراہ کن تاثر مجموعی طور پر صرف کسی ایک گروپ پر ساری توجہ رکھنے کا غیر ارادی نتیجہ ہو سکتا ہے۔ اس لیے انسانی حقوق کی صورت حال اور کسی علاقے میں مذہبی آزادیوں یا ان پر پابندیوں کو

سمجھنے کے لیے مختلف ذرائع سے معلومات حاصل کرنا اور تنقیدی انداز میں سوچنا ضروری ہے۔ کیونکہ امن، سلامتی، اور ترقی کا انحصار انسانی حقوق کی فراہمی پر ہوتا ہے۔ گہرے اختلافات کے باوجود اکٹھا رہنے اور سب کے حقوق کو تسلیم کرنے کی ہماری صلاحیت کم اہم نہیں، جس میں مسلسل بہتری لانا عالمی امن اور انسانی مساوات کی منزل کے حصول کے لیے ناگزیر ہے۔

نوٹ: اس مضمون کی تیاری میں درج ذیل ویب سائٹ پر موجود مواد سے ان کے شکریے کے ساتھ مدد لی گئی ہے۔ www.forb-learning.org

مغربی سیاست و سماج میں اسلاموفوبیا: اسباب، مسائل اور تدارک

عبدالرشید اگوان

فکری حلقوں میں جب مذہبی آزادی کی بات کی جاتی ہے تو اس کے ساتھ جو پہلو زیربحث آتا ہے وہ یہ بھی ہے کہ بعض ادیان یاکمیونیٹیز کو کچھ علاقوں میں زیادہ منافرت کا نشانہ کیوں بنایا جاتا ہے اور ان سے خوف کا احساس کیسے پیدا کردیا جاتا ہے۔ اس کی ایک بڑی مثال مغرب میں اسلاموفوبیا ہے، جو پہلے سماجی سطح تک تھا مگر وقت کے ساتھ مرکزی سیاست میں بھی اس کے اثرات نظر آنے لگے۔ مغرب میں اسلاموفوبیا کے بلاشبہ ٹھوس اسباب ہیں، تاہم اس خوف یا منافرت کا کوئی جواز نہیں ہے اور اس کا تدارک کیا جانا چاہیے کیونکہ اس کی وجہ سے مغرب میں موجود ایک بڑی کمیونٹی کو خطرات لاحق ہیں اور اس فوبیا کے سبب مسلم دنیا بارے عدم اعتماد کی فضا تنازعات کو مزید ہوا دیتی ہے۔ اِس مضمون میں مغربی سیاست و سماج میں اسلاموفوبیا کے اسباب، مسائل و تدارک پر گفتگو کی گئی ہے۔ مضمون نگار سماجی کارکن اور دانشور ہیں، بھارت سے تعلق رکھتے ہیں۔

فوبیا کا لغوی معنی بے جا خوف اور نفرت ہے، انگریزی میں Xenophobia (دوسرے ملک کے لوگوں سے نفرت/خوف) Anti-Semitism (یہودیوں کے خلاف نفرت / خوف) جیسے الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں، مجموعی اعتبار سے ان تمام اصطلاحات میں عدم رواداری اور نسل پرستی کا مفہوم پایا جاتا ہے۔

یہ اصطلاح دو لفظ سے مل کر بنی ہے، یعنی اسلام اور فوبیا، ان دونوں لفظوں کے بیچ میں انگریزی زبان کا "O" بھی بڑھایا جاتا ہے تاکہ ان کے درمیان نسبت کا معنی پیدا ہو جائے، اس طرح اسلاموفوبیا کا معنی اسلام سے بے جا خوف، نفرت اور مسلمانوں کے بارے میں منفی ذہنیت رکھنا ہے۔

اسلاموفوبیا کی ابتدا اور ارتقاء

اگرچہ اسلاموفوبیا ایک جدید اصطلاح ہے مگر اس کی بنیادیں کافی قدیم ہیں، ایک ریسرچ

اسکالر کی رائے ہے کہ اس اصطلاح کو 1921 میں سب سے پہلے فرانسیسی مستشرق Etienne Diet نے استعمال کیا، اس کے بعد 1991 میں امریکی رسالہ "Insight Magazine" میں یہ اصطلاح استعمال ہوئی، اس اصطلاح کو شہرت اس وقت ملی جب 1991 میں برطانیہ کے ایک مشہور ادارہ Runnymede Trust نے اسلامو فوبیا کے موضوع پر ایک تفصیلی رپورٹ "Islamophobia: A Challenge for all us" کے عنوان سے شائع کی۔ جنوری 2001 میں Stock Holm International Forum نے Xenophobia اور Anti-Semitism کی طرح اس لفظ کو بھی نسل پرستی اور عدم رواداری کے دائرہ میں شامل کر لیا گیا۔ 11 ستمبر 2001 کے حادثہ کے بعد اسلاموفوبیا کا لفظ کثرت سے استعمال ہونے لگا، یہاں تک کہ 2004 میں اقوام متحدہ نے اسلاموفوبیا پر قابو پانے کے لیے ایک کانفرنس منعقد کی اور اقوام متحدہ کے سکریٹری جناب کوفی عنان نے اسلاموفوبیا کو افسوس ناک، تکلیف دہ اور امتیاز پر مبنی رجحان قرار دیا، کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ اسلاموفوبیا مغربی ملکوں میں ہمیشہ رہا ہے، البتہ پچھلے دو دہوں سے اس رجحان میں شدت اور تیزی پیدا ہوگئی ہے۔ اس رائے کی تائید میں Humphriies, Pater اور Naik لکھتے ہیں:

"Islamophobia has always been present in Western countries and cultures. In the last two decades, it has become accentuated, explicit, and extreme." (The 3 R,s in social work – Religion, Race, Racism PP.197-198).

اس کے بر خلاف ماہر سماجیات پروفیسر Vertovec کی رائے ہے کہ اس رجحان میں تیزی نہیں آئی ہے، بلکہ عوامی زندگی میں اس کو دریافت کرنے کا صرف مزاج پیدا ہوا ہے۔

"Islamophobia has not necessarily escalated in the past decades, but that there has been increased public scrutiny of it." (Islamophobia and Muslim recognition in Britain PP32-33).

اسلاموفوبیا کے اسباب

الف-اسلام کے بارے میں غلط فہمی:

اسلاموفوبیا کا ایک سبب یہ ہے کہ مغربی قوموں میں اسلام سے متعلق غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، اس غلط فہمی کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ان کے سامنے اسلام کی تفہیم بہت مشکل ہے، مثلاً وہ اسلام کو مغرب کے مقابلہ میں مختلف سمجھنے کے بجائے اس کو مغرب سے کمتر سمجھتی ہیں، اسلام کو متنوع اور ترقی پسند مذہب سمجھنے کے بجائے اس کو منجمد اور ترقی کا دشمن مانتی ہیں، اسلام ان کی نظر میں حلیف ہونے کے بجائے حزب مخالف ہے، اس لئے یہ قومیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت اور امتیاز کو نہ صرف درست خیال کرتی ہیں بلکہ اس کی پزیرائی بھی کرتی ہیں، افسوس کی بات یہ ہے کہ جو لوگ مغرب میں امتیاز و نسل پرستی کے خلاف آواز اٹھانے والے ہیں، ان کی نظر میں بھی اسلاموفوبیا کوئی بری بات نہیں ہے، صورتحال یہ ہے کہ یورپ اور مغربی دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کی ایسی تصویر بٹھادی گئی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اسلام اور مسلمان ان کی قومیت اور تہذیب کے بالکل برعکس ہیں، لہذا ان سے مفاہمت اور ہم آہنگی ممکن نہیں ہے۔

ب-مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی

یہ ایک حقیقت ہے کہ پچھلے عرصہ میں یورپ، امریکہ، برطانیہ وغیرہ میں مسلمانوں کی آبادی تیزی سے بڑھی ہے، چنانچہ فرانس میں مسلمانوں کی آبادی 5 ملین ہو گئی ہے، جرمنی میں مسلمانوں کی آبادی 4 ملین سے متجاوز ہے اور اس بات کا اندیشہ ہے کہ اگر ترکی یورپ میں شامل ہو گیا تو یورپ میں مسلمان اکثریت میں آجائیں گے، امریکہ میں بھی مسلمانوں کی آبادی 5 ملین ہو چکی ہے اور پھر اس تعداد میں روزافزوں اضافہ ہو رہا ہے، اسی وجہ سے مغربی قومیں مسلمانوں سے خوف زدہ ہیں، حکومتیں اس کے تدارک کے لیے اقدامات کر رہی ہیں۔ مگر ماہر سماجیات پروفیسر Steven Vertovec کا کہنا ہے کہ حکومتی اقدامات سے مسلمانوں کو عوامی زندگی میں نمایاں مقام تو ضرور ملے گا مگر اس سے اسلاموفوبیا کا ازالہ نہیں ہو سکے گا، کیونکہ مسلم مخالف افراد اور تنظیموں کے منفی جذبات

اس سے اور بڑھیں گے۔

"As the public sphere shifts to provide a more prominent place for Muslims, Islam phobic tendencies may amplify." (Islamophobia and Muslim Recognition in Britain PP 32-33).

ج۔میڈیا کا منفی کردار

اسلامو فوبیا کو فروغ دینے میں میڈیا سب سے زیادہ پیش پیش رہی ہے، اس بات کا اعتراف الیزبتھ پال نے انسائکلوپیڈیا آف ریس اور ایتھنک اسٹڈیز میں کیا ہے، مثال کے طور پر 1994 سے لے کر 2004 تک برطانوی پریس میں شائع ہونے والے مضامین کا جائزہ لیا گیا تو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے نقطہ نظر کی نمائندگی بہت کم ہوئی ہے اور اگر کچھ ہوئی بھی تو وہ منفی نقطہ نظر سے۔ جواد اور بین لکھتے ہیں:

"Hostility towards Islam and Muslim are closely linked to media portrayals of Islam as barbaric, irrational, primitive and sexist." (Benn, Jawad).

دنیا کے مختلف ملکوں میں اسلامو فوبیا

دنیا کے اکثر حصوں میں اسلامو فوبیا کے واقعات رونما ہوئے ہیں، یہاں تک کہ ہندوستان جیسے سیکولر ملک میں بھی اسلامو فوبیا کے اثرات دیکھنے میں آتے ہیں، گودھرا فسادات اس کی واضح مثال ہیں، سچر کمیٹی رپورٹ میں بھی اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ سرکاری ملازمتوں، سماجی اور سیاسی اداروں میں مسلمانوں کی نمائندگی تشویشناک حد تک کم ہے، مثلاً مغربی بنگال جہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب 27 فیصد ہے لیکن سرکاری ملازمتوں میں ان کا تناسب بمشکل 3 فیصد ملے گا۔

اسلامو فوبیا کا اظہار حالیہ دنوں میں ہونے والے "گلوبل مانیٹر" نامی ادارہ کے ایک سروے سے بھی ہوتا ہے، اس سروے کے مطابق %62 جرمن باشندے اسلام کی وسعت سے فکر مند ہیں جبکہ %33 لوگ اسلام کی اشاعت سے بہت زیادہ خوف زدہ ہیں اور صرف 29 فیصد لوگ اس بارے

میں معتدل رائے رکھتے ہیں، اسی ادارہ کی جانب سے ہونے والے دوسرے سروے میں بتایا گیا ہے کہ 37% برطانوی باشندوں کا خیال ہے کہ مساجد کے میناروں پر پابندی لگائی جائے۔ 25 فیصد لوگوں کا کہنا ہے کہ میناروں پر پابندی لگانے کی ضرورت نہیں ہے، امریکہ میں 21 فیصد لوگوں کی رائے ہے کہ میناروں پر پابندی لگنی چاہئے جبکہ 19 فیصد لوگ اس کے خلاف ہیں، کینیڈا میں بھی 35 فیصد لوگوں کی رائے ہے کہ مساجد کے میناروں پر پابندی لگنی چاہئے جبکہ 27 فیصد لوگوں نے اس سے اختلاف کیا ہے پیو رریسرچ سنٹر کے سروے کے مطابق ٹیکساس میں قائم فورٹ ہوڈ آری سنٹر پر میجر ندال ملک حسن کی فائرنگ کے بعد 52 فیصد امریکیوں کا ماننا ہے کہ اسلام امریکہ کے لئے شدید خطرہ ہے، اس قسم کے سروے اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ پوری دنیا اسلام اور مسلمانوں سے عمومی طور پر خوف زدہ ہے اور مغرب میں خاص طور پر اس بارے میں سماجی بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔

اسلاموفوبیا کی تردید

کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ اس اصطلاح کی کوئی اصل نہیں ہے، مارچ 2006ء میں اس نظریہ سے وابستہ 12 مصنفین نے ایک مشترکہ بیان جاری کیا جس میں اس اصطلاح کو غلط قرار دیا، ان کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ نسل پرستی ہی کی ایک قسم ہے، اس لئے اس کو ایک الگ نام دینے کی ضرورت نہیں، ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ اسلاموفوبیا کی اصطلاح کے ذریعہ اظہار رائے کی آزادی پر قدغن لگتی ہے اور روح تنقید متاثر ہوتی ہے جو کسی بھی ترقی یافتہ معاشرہ کے لئے مناسب نہیں ہے، انہوں نے یہ الزام لگایا کہ مسلمانوں کے خلاف نفرت کا جو ماحول ہے وہ مسلمانوں کی غلط حرکتوں کی وجہ سے ہے، اس لئے مسلمانوں کو اپنی اصلاح کرنی چاہئے نہ کہ ان کے خلاف اٹھنے والی آواز کو خاموش کرنے کی کوشش۔

Roger Kinball کا کہنا ہے کہ اسلاموفوبیا غلط اصطلاح ہے؛ کیوں کہ فوبیا کا مطلب بے جا خوف ہے جب کہ اسلام کا خوف بجا ہے اور اس خوف کی بنیادیں درست ہیں:

"A phobia describes an irrational fear, and it is axiomatic that fearing the effects of radical Islam is not irrational, but on the

contrary very well-founded indeed." (After the suicide of the west-2006)

"Many of the stereotypes and misinformation that contribute to the articulation of Islamophobia are rooted in a particular perception of Islam, such as the notion that Islam promotes terrorism; especially prevalent after the September 11, 2001 attacks." (Islamophobia watch)

Runnymede Trust نے اپنی رپورٹ میں مغربی نظریات کو 8 شقوں میں بیان کیا ہے، جن کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

1- Islam is seen as a monolithic bloc, static and unresponsive to change.
2- It is seen as separate and "other". It does not have values in common with other culture, is not affected by them and does not influence them.
3- It is seen as inferior to the west. It is seen as barbaric, irrational, primitive and sexist.
4- It is seen as violent, aggressive, threatening, supportive of terrorism and engaged in a clash of civilization.
5- It is seen as a political ideology, used for political or military advantage.
6- Criticisms made of "the west" by Muslims are rejected out of hand.
7- Hostility towards Islam is used to justify discriminatory practices towards Muslims and exclusion of Muslims from mainstream society.
8- Anti-Muslim hostility is seen as natural and normal. (Runnymede trust,s report on Islamophobia-1997)

1—اسلام کے بارے میں خیال ہے کہ یہ ایسا سیاسی نظام ہے جو کسی دوسرے نظام کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو سکتا؛ کیونکہ وہ تبدیلیوں کے خلاف ہے۔

2—ان کا خیال ہے کہ اسلام مغربی دنیا سے الگ تھلگ رہنے والا ایک جامد مذہب ہے اور وہ مشترکہ اقدار حیات میں یقین نہیں رکھتا ہے، اس میں نہ قبول کرنے کی صلاحیت ہے اور نہ ہی اثر انداز ہونے کی۔

3–اسلامی نظام کو مغربی نظام سے کمتر سمجھا جاتا ہے، اور اس غیر مذہب، عیر معقول، قدامت پرست اور جنسی امتیازات کی وکالت کرنے والا مذہب قرار دیا جاتا ہے۔

4- اسلام کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ تشدد کا حامی، جارحانہ، خطرناک، دہشت گردی کو فروغ دینے والا اور تہذیبی تصادم کو بھڑکانے والا مذہب ہے۔

5–اسلام کو روحانی مذہب سمجھنے کی بجائے اس کو ایک ایسا سیاسی نظام سمجھتے ہیں جس کا استعمال سیاسی اور عسکری بالادستی حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے۔

6–مسلمانوں کی طرف سے مغرب کے خلاف جو آواز اٹھائی جاتی ہے اس کو فوراً رد کر دیا جاتا ہے۔

7–مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک اور ان کو سماجی دھارا سے خارج کرنے کے لئے اسلام پر ستم ڈھایا جاتا ہے۔

8–مسلمانوں کے خلاف ظلم و ستم کو فطری اور معمول کی کاروائی قرار دیا جاتا ہے۔

تاہم Runnymede Trust کی رپورٹ خامیوں سے خالی نہیں؛ کیوں کہ اس میں بتایا گیا ہے کہ Self Help کے طور پر مسلمانوں کو یہودیوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون کرنا چاہئے اور ہر وہ چیز جس سے یہودیوں کے احساسات کو ٹھیس لگتی ہو، مسلمانوں کی طرف سے اس کی بھرپور مذمت ہونی چاہئے۔ لیکن اسی ادارے نے 1995ء میں Anti-Semitism پر رپورٹ شائع کی تو یہودیوں کو یہ مشورہ دینا گوارہ نہیں کیا کہ وہ مسلمانوں کے احساسات کا لحاظ رکھیں۔ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ کہیں نہ کہیں ان دانشوروں کے ہاں بھی اسلاموفوبیا کا عنصر موجود ہے۔

اسلاموفوبیا کے تدارک کی کوششیں

اسلاموفوبیا کے تدارک کے لیے Runnymede Trust نے 60 سفارشات پیش کی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو میڈیا اور سیاست میں اپنا اشتراک بڑھانا چاہیے، چنانچہ اس رپورٹ کے بعد ہی برطانیہ میں مسلمانوں نے ایک ادارہ ''مسلم کونسل آف برطانیہ'' کے نام سے قائم کیا تاکہ متحد ہو کر حکومت پر دباؤ ڈالا جائے کہ وہ مسلمانوں کے مسائل پر سنجیدگی سے غور کریں اور انہوں نے میڈیا کے اداروں سے بھی ربط و ضبط بڑھایا تاکہ ذرائع ابلاغ میں اپنی بہتر نمائندگی کر سکیں، ظاہر ہے

کہ صرف سیاست اور صحافت کے میدان میں کوشش کرنے سے مسائل حل نہیں ہو سکیں گے بلکہ درجنوں ایسے میدان ہیں جہاں اسلامو فوبیا کا معاملہ درپیش ہے اور وہاں کام کرنے کی ضرورت ہے۔

اسلامو فوبیا کے خلاف کئی شخصیتیں اور ادارے سرگرم ہیں مثلاً آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس (امریکہ) جس نے اس رجحان کے لیے دستاویزات تیار کیے ہیں، فرانسیسی مسلمانوں نے دستخطی مہم شروع کی اور پچاس ہزار لوگوں کے دستخط کے ساتھ سابق صدر کو ایک پٹیشن پیش کی اور ان سے مطالبہ کیا کہ اسلامو فوبیا کو نسل پرستی کی طرح قابل جرم قرار دیا جائے۔ کئی برطانوی تنظیموں نے اسلامو فوبیا کے نام پر سیمینار منعقد کئے تاکہ اس رجحان پر قابو پایا جاسکے، ان کے علاوہ کئی تنظیمیں اور ادارے اس میدان میں متحرک ہیں مثلاً ''اسلامو فوبیا واچ'' جس کا آغاز جنوری 2005 میں ہوا، اس کا مقصد یہ ہے کہ اسلامو فوبیا جو مغربی استعمار کی نئی شکل ہے، اس پر قابو پایا جاسکے، خاص بات یہ ہے کہ اس ویب سائٹ کو دیگر مسلم افراد نے قائم کیا ہے، اسی طرح Islamphobia.org اور Islamicawareness.net جیسی ویب سائٹس اس میدان میں کام کر رہی ہیں، اس رجحان پر قابو پانے کے لیے پروفیسر دیپا کمار جیسی شخصیت اس اہم معرکہ میں حصہ لے رہی ہے، ان کا کہنا ہے کہ ہر باضمیر انسان کو اسلامو فوبیا کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے۔

"At time like this, people of conscience need to organize and speak out against Islamophobia." (Fighting Islamophobia: A response to critics-2006).

متعدد مغربی ملکوں کے دستور میں مسلمانوں کے سیاسی دستوری اور تہذیبی حقوق کو تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن از روئے انصاف ملنے والے حقوق جبکہ از روئے حقیقت انہیں جو کچھ ملتا ہے اس میں بڑا فرق اور تضاد ہے، مقامی افسران اکثر انتہا پسندوں سے مل جاتے ہیں اور دستور کے تحت مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو دیئے گئے حقوق کی پامالی میں معاون ہوتے ہیں اس کی ایک مثال نئی مسجدوں کی تعمیر کی عوامی مخالفت ہے، اور حکام اقلیتوں کو ان کے دستوری حقوق کی ضمانت دینے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہیں اور عوام کا ساتھ دیتے ہیں، اٹلی، جرمنی اور اسپین میں نئی مساجد کی تعمیر کے خلاف احتجاج بہت پھیلا ہوا ہے، اگر مقامی حکام نئی مسجدوں کی تعمیر کی اجازت بھی دیتے ہیں تو وہ شہر سے دور ایسے

علاقوں میں ہوتا ہے جو عموماً انتہا پسندوں کی نظروں سے اوجھل رہتی ہیں، اس صورتحال کے پیش نظر مسلمانوں کے لئے اس کے سوا چارہ کار نہیں کہ وہ پرائیویٹ ہال، موٹر گیراج، دفتروں یا مکانات میں ہی نماز ادا کریں، اسلامی سنٹروں کی تعمیر کے لیے بھی مقامی حکام اسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتے ہیں، اسی طرح حلال خوراک کی فراہمی، اسکولوں میں سر ڈھکنے کے معاملہ میں ایسا ہی انداز اختیار کیا جاتا ہے۔

مغرب میں تارکین وطن کا مسئلہ، تنازع اور احتجاج کا موضوع بنا ہوا ہے، اکثر اس پر نسل پرستی اور غیر لوگوں سے اجتناب کے اثرات بھی نمایاں ہوتے ہیں، تارکین وطن کے مسئلہ پر سیاسی مہم جوئی بھی ہوتی ہے اور اکثر اس سے سیاسی صف آرائی کا ماحول بھی پیدا ہو جاتا ہے، انتہا پسند سیاسی پارٹیاں لوگوں میں خوف کا ماحول پیدا کرتی ہیں، مہاجروں کی دوسری اور تیسری نسل کے افراد کو بھی جو مغربی ممالک میں ہی پیدا ہوئے اور پروان چڑھے انہیں بھی غیر ملکی قرار دیا جاتا ہے، الیکشن میں مہاجرین/تارکین وطن کا مسئلہ زور شور سے اٹھایا جاتا ہے اور حکومت کو ان مہاجرین کے خلاف اقدامات کرنے ہوتے ہیں اس خوف سے کہ کہیں الیکشن میں وہ انتہا پسند سیاسی جماعتوں سے ہار نہ جائیں۔

مشرق وسطی اور مذہبی آزادی

مشرق وسطی کی خانہ جنگیاں: کیا مذہب ہی واحد وجہ ہے؟

ابراہیم قالن

پچھلی چند دہائیوں سے مشرق وسطی فرقہ وارانہ تنازعات کی زد میں ہے اور اس پر سیاسی و فکری حلقوں میں بات ہوتی رہتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ عرب بہار کے بعد سے کئی علاقوں میں خانہ جنگی کا باعث بھی فرقہ واریت ہی ہے کہ شیعہ سنی فریقوں نے انہی بنیادوں پر ایک دوسرے کے خلاف محاذ کھولے۔ جبکہ بعض ماہرین کی رائے میں اس خانہ جنگی کی اساس اصل میں شناخت کی سیاست اور قومی حکومتوں کے مفادات ہیں جس میں مسلکی اختلافات کو ابھارا اور استعمال کیا جاتا ہے۔ مضمون نگار ابراہیم قالن تُرک صدر رجب طیب ایردوان کے مشیر اور ترجمان ہیں۔ ان کا یہ مضمون ترکی میڈیا 'ٹی آر ٹی' پہ شائع ہوا۔

شام اور عراق سے لے کر بحرین اور لبنان تک سنّی اور شیعہ مسلمان معاشرے جنگ، معاشرتی تناو، غربت، معاشی عدم مساوات، ظلم، بالواسطہ جنگوں، عسکریت پسندی اور اس سے مشابہہ چیزوں کے سمیت متعدد مسائل سے نبرد آزما ہیں۔ ہر مسئلے کے نسلی اور مذہبی فرقے سے متعلق بعض مسائل موجود ہیں۔ اس مسئلے کی تہہ میں شناخت کی سیاست کارفرما ہے جو عام سماجی معاشی (Socio-Economic) اور سیاسی مسائل کو انتہا پسندی کے حامل شناختی دعووں میں تبدیل کر رہی ہے۔ لبنان کی شیعہ سنّی کشیدگی فرقہ واریت کی نہایت پیچیدہ صورت کی حامل ہے۔ شام کی جنگ کا اسلام کے سنّی یا شیعہ فرقے کے ساتھ تعلق بہت کم ہے۔ اس کے برعکس اس جنگ کا تعلق، جنگ میں کلیدی کردار ادا کرنے والوں کی نسلی یا فرقہ وارانہ شناخت کے بجائے، اس بات سے ہے کہ عرب ممالک کے مستقبل کو شکل کون دے گا۔

یورپ میں 16ویں اور 17ویں صدی میں کیتھولک اور پروٹسٹینٹ مسیحی مسالک کے درمیان دینی جنگوں کا طاقت اور حاکمیت سے بھی اتنا ہی تعلق تھا جتنا کہ شناخت کے ساتھ۔ اسی طرح عالم اسلام میں اس وقت موجود فرقہ وارانہ کشیدگیوں کے، اسلام میں سنّی اور شیعہ فرقوں کا سبب بننے

والے تاریخی واقعات کے علاوہ، متعدد اسباب موجود ہیں۔ پیغمبر اسلام ﷺ کا پہلا خلیفہ ہونا کس کا حق تھا؟اس سوال کا جواب عام طور پر اسلامی تاریخ میں سنّی شیعہ اختلافات کی ابتدا کے طور دکھائی دیتا ہے۔ سنّی فرقے کا موقف ہے کہ صحابہ کرامؓ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو معاشرے کی مشترکہ رائے کے مطابق پہلا خلیفہ منتخب کیااور یہ بات پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ کی دینی اور سیاسی جائز حیثیت کی تشکیل کرتی ہے۔ جبکہ شیعہ فرقے کا موقف ہے کہ علی ابن ابی طالبؑ کا پیغمبر کے خلیفہ کے طور پر منتخب ہونا ضروری تھا۔

متعدد اہم سوالات کے ساتھ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ سے متعلق اس اختلاف نے اسلام میں شیعہ اور سنّی فرقوں کے ابھرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ لیکن یہ دونوں مکتبہ ہائے فکر اسلامی عقائد اور تہذیب کے بنیادی عناصر کے حامل ہیں۔ قانون، سائنس، فلسفے، فن اور تصوف میں اللہ کی وحدانیت اور انسانی عظمت کے موقف کے علمبردار ہیں۔ امام جعفر صادق سے لے کر امام ابو حنیفہ تک ، ابن سینا سے لے کر ناصر الدین الطوسی تک ، امام غزالی سے لے کر ملّا صدرا تک سنّی اور شیعہ مکتبہ فکر کی اہم شخصیات نے کلاسیکی اسلامی مدنیت کے بنیادی افکار کو واضح شکل میں پیش کیا ہے۔ موجودہ دور کا مسئلہ اس تاریخ کو اختلاف و تفریق کی جگہ مفاہمت اور اتفاق کے حوالے سے دیکھنا ہے۔ مسلمان علماء اور مفکّرین پر یہ اہم ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اسلامی تاریخ کا احاطہ کرنے والے نقطہ نظر کو پیش کریں اور تاریخ اور جدید دنیا کے مسائل سے دوچار سنّی اور شیعہ مسلمانوں کو ایک نیا رُخ عطا کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔

آج جس چیز کو مذہبی فرقہ وارانہ جھڑپ کا نام دیا جا رہا ہے اس کی تہہ میں زیادہ تر شناخت کی سیاست اور قومی حکومت کے مفادات کارفرما ہیں۔ تمام جدید قومی حکومتوں کی طرح مسلمان قومی حکومتوں کی اکثریت شخصی مفادات کو پیش نظر رکھے ہوئے ہے اور نسلی و فرقہ وارانہ شناخت کو استعمال کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ قومی حکومتوں کے مفادات اور شناخت کی سیاست کا خطرناک اجتماع معاشروں میں تفریق کا سبب بن رہا ہے جو کسی بھی مخالف صورتحال میں نارمل سماجی سیاسی ماحول کو تباہ کن بنا سکتا ہے۔

یہاں ایک اور عنصر پایا جاتا ہے جس سے عام طور پر صرف نظر کیا جاتا ہے اور وہ عنصر یہ ہے کہ جنگیں ناکام اور کمزور حکومتوں کے حامل معاشروں کی نسلی اور دینی ساخت کو بڑے پیمانے پر سماجی اور نفسیاتی نقصان پہنچا رہی ہیں۔ ساتھ ہی یہ جنگیں سیاسی نظام کی ناکامی کو بنیاد بنا کر دینی فرقہ وارانہ جھڑپوں میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ شام، عراق اور یمن کی کمزور حکومتی ساختوں کا عالم اسلام میں شیعہ سنّی کشیدگی کا اہم ترین سبب ہونا محض اتفاق نہیں ہے۔ دہشت گرد تنظیم داعش جیسے انتہا پسند گروپ اور دہشتگرد تنظیمیں شام کی جنگ، یمن کی جان لیوا جدوجہد، عراق کی کمزور حکومتی ساخت اور افغانستان، نائجیریا اور مالی میں مرکزی اتھارٹی کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا رہی ہیں۔

بعض کٹّر اور متعصب سوچ کے حامل افراد اس بات پر دل سے یقین کر سکتے ہیں کہ وہ سنّی اسلام یا شیعہ اسلام کے لئے جنگ کر رہے ہیں۔ یہ افراد قدرتی طور پر مندرجہ بالا بیان کردہ تاریخی اختلاف کو مثال کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ اپنے انتہائی اقدامات کو جائز قرار دینے کے لئے دوسرے فریق کی جارحیت کو مثال کے طور پر پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن اکثر اوقات یہ جنگیں دنیا میں طاقت کے حصول کے لئے اور بااثر ہونے کے لئے لڑی جا رہی ہیں۔ اقتدار کی جنگ کو جائز ثابت کرنے کے لئے سنّی اور شیعہ شناختوں کو استعمال کیا جا رہا ہے۔

سنّیوں اور اہل تشیع کے درمیان تاریخی اختلاف سب پر آشکار ہے جسے قبول کرنا چاہیے، 21 ویں صدی میں تازہ جنگیں شروع کرنے کے لئے انہیں بڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لئے ایک دوجہتی نقطہ نظر کی ضرورت ہے۔

اوّلین طور پر مسلمان علماء، مفکّرین، دینی صاحب اختیار شخصیات اور دینی رہنماوں کو چاہیے کہ وہ اپنے مریدوں کو دشمنی اور جھڑپوں کی بجائے امن اور مفاہمت کا راستہ دکھائیں۔ حنفی آئینی مکتبہ فکر کے بانی امام ابو حنیفہ (پیدائش 767 ہجری) اور چھٹے شیعہ امام اور جعفری آئینی مکتبہ فکر کے بانی امام جعفر الصادق (پیدائش 765 ہجری) باہم فکری اور دقیق مباحث کرتے اور ایک دوسرے سے فیض یاب ہوتے تھے۔ ان اماموں کی طرح موجودہ دور کے مسلمان علماء کو بھی مفاہمت اور اتحاد کی فضاء کو تحریک دینا چاہیے۔ سنّی اور شیعہ رہنماوں کو بدترین برائیوں اور تباہیوں کے مقابل بھی اعتدال کے

راستے کی نشاندہی کرنا چاہیے اور شدت کی حامل تمام انتہا پسندیوں کی مذمت کرنا چاہیے۔

دوسرے نمبر پر مسلمان ممالک کی جنگوں پر، ناکام اور کمزور حکومتوں پر اس حوالے سے غور کرنا چاہیے کہ شدت کی حامل انتہا پسندی کو انسانوں کی تکلیفوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہ مل سکے۔ اس کے لئے بہادر سیاسی قیادت اور ماہر حکومتی شخصیات کی ضرورت ہے۔ شام اور یمن میں جاری جنگیں، عراق اور افغانستان میں درپیش بڑے پیمانے پر سکیورٹی کے مسائل عدم استحکام اور تباہی و بربادی کا سبب بنتے رہیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ سیاسی موقع پرست اور انتہائی سوچ کے حامل گروپوں کی طرف سے ان عناصر کو دینی فرقہ وارانہ کشیدگی کو ہوا دینے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا رہے گا۔

امام البیہقی (پیدائش 1066 ہجری) نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے ان الفاظ کو رقم کیا ہے "اگر تمہارے پاس کوئی دعوی آئے تو کتاب الٰہی کے مطابق فیصلہ کرو۔ کوئی بھی چیز تمہیں کتاب الٰہی کے علاوہ کسی اور چیز کے مطابق فیصلہ کرنے پر مائل نہ کرے۔ اگر کسی مسئلے کے بارے میں اللہ کی کتاب میں فیصلہ تلاش نہ کر سکو تو میری سنت اور عمل پر نگاہ ڈالو اور اس کے مطابق فیصلہ کرو، اگر میری سنت میں مسئلے کا حل تلاش نہ کر سکو تو میرے صحابہ کرامؓ کے بیانات کو دیکھو۔ میرے صحابہ کرام آسمان کے ستاروں کی مانند ہیں ان میں سے جس کو منتخب کرو گے اور اس کے پیچھے چلو گے وہ تمہیں راستہ دکھائے گا۔ صحابہ کرامؓ کے درمیان اختلاف تمہارے لئے رحمت ہے" یہ آخری جملہ (میری امت کے درمیان اختلافات ایک رحمت ہے) کی شکل میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ اگر ہم اس حدیث کو پیش نظر رکھ کر اختلافات کو ایک طرف رکھیں تو اس کے معنٰی واضح ہیں اور براہ راست موجودہ دور کے مسلمانوں کے بارے میں ہے۔ اختلافات کی قدر و قیمت کو سمجھنے کے لئے ہم سب کو اس حدیث کی حکمت پر غور کرنا چاہیے۔

سعودی عرب کا وژن 2030ء اور مذہبی رواداری کے لیے کوششیں

محمد اسرار مدنی

سعودی عرب کو پوری دنیا میں اسلام کے روحانی پیشوا اور نمائندے کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ خصوصاً غیرمسلم دنیا میں اس کی یہ حیثیت اور بھی زیادہ معنویت کی حامل ہے۔ اس لیے مذہبی آزادی کے حوالے سے مملکت کا رویہ خصوصی توجہ کا حامل ہوتا ہے۔ بعض قوانین اور روایات کی وجہ سے ماضی قریب تک سعودی عرب کو ایک سخت گیر ریاست کے طور پہ دیکھا جاتا رہا ہے اور اس پر تنقید بھی ہوتی رہی ہے۔ یہاں اگرچہ باقاعدہ طور پہ مذہبی اقلیتیں وجود نہیں رکھتیں لیکن پھر بھی قوانین کی حد تک اور فکری تناظر میں یہ ایک نمایاں موضوع رہتا ہے۔ البتہ یہاں مسلکی کشمکش موجود رہی ہے۔ تاہم گزشتہ کچھ برسوں سے مملکت میں تیزترین تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں جن کا ایک حصہ مذہبی و نظریاتی بھی ہے اور اس بنا پر یہ سمجھا جا رہا ہے کہ سعودی عرب میں مذہبی آزادی کے لیے فضا پہلے سے زیادہ وسیع ہو رہی ہے۔ زیرنظر مضمون میں انہی تبدیلیوں کے مذہبی اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ محمد اسرار مدنی ادارہ 'انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور' کے سربراہ، کئی کتب کے مصنف اور تربیت کار ہیں۔ مکالمہ اور رواداری کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔

اسلام سعودی عرب کا سرکاری مذہب ہے اور اس کا قانون تمام شہریوں کے مسلمان ہونے کو ضروری قرار دیتا ہے۔ اسلام کے سوا دیگر مذاہب کے پیروکاروں کی اعلانیہ عبادت ممنوع ہے۔ کسی غیر مسلم کو سعودی عرب کی شہریت حاصل کرنے کے لیے اسلام قبول کرنا ضروری ہے۔

سعودی عرب میں سنی سلفی تحریک کا حنبلی اسلام نافذ ہے۔ لیکن یہ بات متنازع ہے کہ سعودی عرب میں سلفی/وہابیوں کی اکثریت ہے یا نہیں، کیوں کہ تخمینہ ہے کہ مقامی آبادی کے صرف 22.9 فیصد افراد ہی یہ عقیدہ رکھتے ہیں (خاص طور پر نجد میں)۔ وہابی تحریک دو سو سال سے نجد میں غالب رہی ہے، لیکن ملک کے دیگر حصوں حجاز، الشرقیہ اور نجران وغیرہ میں ان کا غلبہ

1913ء سے 1925ء کے درمیان میں ہوا۔ 15 سے 20 ملین سعودی شہریوں میں سے زیادہ تر سنی مسلمان ہیں، اسے بعض اوقات "اسلام کا گھر" بھی کہا جاتا ہے، مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ مسلمانوں کا بڑا اہم مقام ہے۔ مکہ شہر میں ہر سال حج کا اجتماع ہوتا ہے اور عالم اسلام سے ہزاروں طالب علم اور علما یہاں تعلیم کے لیے آتے ہیں۔ سعودی عرب کے بادشاہ کا سرکاری خطاب ہی 'خادم الحرمین الشریفین' ہے جو مسجد الحرام، مکہ اور مسجد نبوی، مدینہ کی وجہ سے دیا گیا ہے، یہ دونوں شہر اسلام کے مقدس ترین شہروں میں سے ہیں۔

سعودی عرب میں اقلیتیں

سعودی عرب ایک ایسا ملک ہے جہاں دیگر ادیان کے لوگ موجود نہیں ہیں۔ وہاں صرف اسلامی فکر کے مختلف مسلکی طبقات پائے جاتے ہیں اور ان میں سب سے نمایاں سنی اور شیعہ ہیں، اور انہی دو مسالک کے کے مابین تاریخی طور پہ ایک گونہ کشمکش رہی ہے۔

بعض غیر سرکاری ذرائع نے اندازہ لگایا ہے کہ سعودی عرب کی تقریباً 20 ملین مقامی آبادی میں اہل تشیع کی آبادی 10 فیصد ہے۔ سعودی عرب کے اثنا عشری شیعہ بحرینی، بنیادی طور پر ملک کے مشرقی صوبے میں بستے ہیں، خاص کر قطیف اور الحساء شہروں میں۔ اثنا عشری شیعہ مدینہ منورہ میں بھی پائے جاتے ہیں جو نخاولہ کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ اسی طرح، ایک قبائلی شیعہ آبادی علاقہ حجاز میں موجود ہے، جو تین قبیلوں : بنو حسین (مکہ کے شریف جنہوں نے پانچ صدیوں تک حکومت کی)، کے ساتھ دو روایتی طور پر خانہ بدوش حجازی قبیلوں حرب (خاص طور پر بنو علی کی شاخ) اور جہینہ میں منقسم ہے۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ یہ قبیلے شیعہ تھے نہ کہ زیدی یا اثنا عشری، وہ ان کو 'نو کیسانیہ' عقائد سے منسلک بتاتے ہیں۔ سعودی عرب کے جنوبی علاقوں اور نجران میں یم قبیلہ روایتی طور پر سلیمانی اسماعیلی آبادی والا ہے۔

وژن 2030ء کے تحت مذہبی رواداری کے لیے اصلاحات

سعودی عرب جس تیزی کے ساتھ تبدیل ہو رہا ہے 2015ء سے قبل اس کی کوئی توقع نہیں کر سکتا تھا۔ مملکت کے داخلی روایتی ڈھانچے سے قطع نظر اس کا جغرافیائی تشخص بھی جس تاثر اور امیج کا متقاضی ہے، اسے دیکھتے ہوئے حالیہ وقوع پذیر ہونے والی تبدیلیاں آسان نہیں لگ رہی تھیں۔ لیکن خطے کی مسابقتی صورتحال، مستقبل کے اقتصادی تقاضے، رجعت پسندی کا بین الاقوامی تشخص اور سلطنت کی اندرونی حکومتی کشمکش، چند ایسے عوامل ہیں جن کی بنا پر سعودی عرب تیزی کے ساتھ تبدیل ہو رہا ہے۔ ان اقدامات میں سے بعض پر کچھ لوگوں کو تحفظات ہیں لیکن وژن 2030ء کے تحت سعودی عرب میں متعارف کرائی جانے والی سماجی و معاشی اصلاحات کا ایک محور مذہبی رواداری کا فروغ اور اس پس منظر میں سعودی عرب کے تشخص کو نرم کرنا ہے۔

حال ہی میں دی اٹلانٹک کو دیا گیا انٹرویو شہزادہ محمد بن سلمان کا سب سے مضبوط اور تفصیلی موقف ہے جس سے ان کی آراء کھل کر سامنے آئیں۔ اس میں سعودی عرب میں مذہبی رواداری کے حوالے سے کھل کر باتیں کیں اور یہ کہا کہ وہ شدت پسندانہ موقف سے پیچھے ہٹ رہے ہیں۔ مثال کے طور پہ ان کا کہنا تھا:

''ہم اسلام کی اصل تعلیمات کی طرف لوٹ رہے ہیں، جیسے پیغمبر اسلام اور خلفائے راشدین نے زندگی گزاری، جو کھلے اور پُرامن معاشرے تھے۔ ان کی حکمرانی میں مسیحی اور یہودی بھی تھے۔ انہوں نے ہمیں تمام ثقافتوں اور مذاہب کی تعظیم کی تعلیم دی۔ پیغمبر اسلام اور چاروں خلفا کی تعلیمات مکمل ہیں۔ ہم اپنی جڑوں کی جانب واپس جا رہے ہیں، جو اصل چیز ہے۔ ہوا یہ کہ شدت پسندوں نے اسلام کو ہائی جیک کر لیا اور ہمارے مذہب کو اپنے مفادات کے لیے تبدیل کر لیا۔ وہ لوگوں کو اپنی نظر سے اسلام کو دکھانا چاہتے ہیں۔ اور مسئلہ یہ ہے کہ ان سے کوئی بحث نہیں کر رہا، اور ان کے خلاف کوئی بھی سنجیدگی سے برسرپیکار نہیں ہے۔ چنانچہ انہیں اپنے یہ تمام شدت پسندانہ نظریات پھیلانے کا موقع ملا، جس کی وجہ سے سنی اور شیعہ دنوں میں شدید قسم کے دہشت گرد گروہوں کی تخلیق ہوئی''۔

ایک اور جگہ کہتے ہیں:

"سعودی عرب میں سنی اور شیعہ ہیں، اور سنیوں میں چار مکاتب فکر ہیں، اور اہل تشیع کے بھی مختلف مکاتب فکر ہیں، اور ان کو کوئی مذہبی بورڈز کی نمائندگی دی گئی ہے۔ آج، سعودی عرب میں کوئی بھی اپنے مکاتب فکر کے نظریات کی ترویج ایسے نہیں کر سکتا کہ مذہب کو دیکھنے کا صرف نظریہ ہو۔ شاید ایسا تاریخ کے کچھ حصوں میں ہوا ان واقعات کی وجہ سے جن کا میں نے ذکر کیا، بالخصوص 80، اور 90 اور 2000 کے ابتدائی برسوں میں، لیکن آج ہم صحیح راستے پر واپس آچکے ہیں جیسا میں نے کہا۔ ہم اپنی جڑوں کی جانب واپس جا رہے ہیں، خالص اسلام کی طرف، اس بات یقینی کو بناتے ہوئے کہ سعودی عرب کی روح، جس کی بنیاد اسلام، ہماری ثقافت خواہ قبائلی ہو یا شہری، عوام کی خدمت ہے، قوم کی خدمت، مذہب کی خدمت، ساری دنیا کی خدمت، اور معاشی ترقی ہے۔ اور گذشتہ پانچ برسوں میں ایسا ہی ہوا۔"

شیعہ رہنماؤں کی رائے

محمد بن سلمان کے مذہبی رواداری سے متعلق بیانات کو مملکت کے شیعہ علماء نے بہت سراہا ہے اور دیکھا جائے تو پہلے شاہی حکمرانوں کی بہ نسبت اہل تشیع شہری محمد بن سلمان کے لیے نرم گوشہ رکھتے ہیں اور اپنے خطبات وغیرہ میں ان کے خلاف بیانات نہیں دیتے۔ دی اٹلانٹک کے انٹرویو کے بعد سعودی عرب میں شیعہ عالم دین شیخ حسین علی المصطفی نے ایک ٹویٹ کی جس میں انہوں نے ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان آل سعود کو مخاطب کیا۔ شیخ حسین نے لکھا کہ "وطن کے ساتھ آپ کی پاسداری کا کمال مرتبہ یہ ہے کہ آپ اس سرزمین کے ساتھ مخلص اور وفادار رہیں جہاں آپ نے زندگی بسر کی ہے اور جس وطن نے آپ کو آغوش فراہم کی۔ یہ ارضِ وطن ہر آن آپ کے ساتھ وابستہ ہے لہذا اس کے ساتھ ایک خود سے قائم عنوان کے طور پر معاملہ کیا جائے۔ یہ ہی سعودی ویژن 2030 ہے"۔

اسی طرح الاحساء ضلع میں "امام حسین مسجد" کے منبر سے خطبہ دیتے ہوئے محمد رضا

السلمانے لوگوں پر زور دیا کہ وہ ویژن 2030 کی تفصیلات کا مطالعہ کریں۔ انہوں نے دی اٹلانٹک جریدے کے ساتھ شہزادہ محمد بن سلمان کے حالیہ انٹرویو کو نہایت شاندار قرار دیا۔

محمد رضانے سعودی عرب میں حال ہی میں منظور کیے جانے والے "ذاتی احوال کے قانون" کو اپنی نوعیت کی بہترین پیش رفت شمار کی۔ انہوں نے کہا کہ اس کے ذریعے ہم بند دنیا سے ایک کھلی دنیا کی طرف منتقل ہو رہے ہیں اور اس کا سہرا ولی عہد کے سر ہے۔

ایک اور شیعہ عالم شیخ حسن الصفار نے 11 مارچ کو قطیف ضلع کی "الرسالہ مسجد" میں جمعے کا خطبہ دیتے ہوئے دی اٹلانٹک کے ساتھ شہزادہ محمد کے انٹرویو کو سراہا۔ انہوں نے کہا کہ سعودی ولی عہد کے بیان کیے گئے مواقف نہ صرف ملک و قوم بلکہ پوری امت کے لیے باعث افتخار ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آج کے سعودی معاشرے میں شیعہ حلقوں اور شیعہ علماء کو ماضی کی نسبت کہیں زیادہ آزادی اور خود مختاری حاصل ہے۔ مملکت کی دانش مند قیادت شیعہ آبادی کو پوری طرح قومی دھارے میں لانے کے اقدامات کر رہی ہے۔

غیر مسلم تارکینِ وطن

سعودی عرب میں ایک مختصر تعداد ان غیر ملکی غیر مسلموں کی بھی رہتی ہے جو مملکت کے شہری نہیں ہیں لیکن وہاں کام اور ملازمت کے سلسلے میں رہائش پذیر ہیں۔ ان میں مغربی ممالک کے لوگ بھی ہیں اور بعض دیگر مذاہب کے افراد بھی ہوتے ہیں۔ ان مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد اپنے دینی تہوار کو نہیں منا سکتے تھے یا چھپ کر مناتے تھے۔ لیکن اب کچھ نرمیاں لائی گئی ہیں۔ پچھلے دو سالوں سے سعودی عرب میں کرسمس کے موقع پر کرسمس کا سامان بازاروں میں فروخت ہونے لگا ہے۔ غیر ملکی سیاحوں اور تارکین وطن کی بڑھتی ہوئی تعداد کے باعث سعودی عرب میں مختلف تہواروں پر رواداری کا رجحان بڑھنے لگا ہے۔ اب ماضی کے مقابلے میں حالیہ برسوں میں تبدیلی آئی ہے اور مارکیٹوں میں کرسمس سے متعلق اشیا فروخت کیلئے پیش کی جانے لگیں ہیں۔

تیز ترین تبدیلیوں کا مرحلہ

سعودی عرب میں سماجی مذہبی سطح پر بہت سی تبدیلیاں تیزی سے رونما ہو رہی ہیں جس کا مقصد دنیا کو پیغام دینا ہے کہ سعودی کا روایتی مذہبی تشخص تبدیل ہو رہا ہے۔ اسی کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ پہلے مدینہ کی حدود میں داخل ہوتے ہوئے بڑے بڑے سائن بورڈ دکھائی دیتے تھے جن پر لکھا ہوتا تھا کہ آپ کے سامنے دو راستے ہیں۔ اگر آپ مسلمان ہیں تو ایک راستے سے جائیے، غیر مسلم ہیں تو دوسرے سے۔ لیکن اب سعودی حکام نے مدینہ آنے والے سیاحوں کے لیے ان رہنما بورڈوں کی عبارت میں تبدیلی کر دی ہے اور اب 'غیر مسلموں کے لیے' کی جگہ صرف 'حد حرم' لکھا نظر آتا ہے۔

سعودی عرب کے مختلف ادارے اور وزارتیں دوسرے ممالک اور اقوام کی ثقافتوں کے درمیان رابطوں اور ڈائیلاگ کے لیے سرگرم ہیں۔ اس سلسلے میں اہل تشیع اور دیگر مسالک کے علما کو سعودی عرب میں مدعو کیا جا رہا ہے تاکہ مملکت کے عوام میں یہ تاثر پیدا کیا جا سکے کہ سعودی عرب میں ریاست اب غیر سنی مسالک کے لیے رواداری کا رویہ اپنا رہی ہے۔

محمد بن سلمان امور خارجہ اور معیشت کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ سعودیہ کے مذہبی معاملات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ روایتی طور پہ مملکت میں مذہبی معاملات کو علمائے کرام طے کرتے رہے ہیں اور اس ضمن میں حکومت کم سے کم مداخلت کرتی ہے۔ مگر شہزادہ محمد نے اسلامی اصول فقہ (یعنی اسلامی قانون) پر ڈگری لے رکھی ہے۔ اسی لیے وہ مذہبی قانونی معاملات میں بھی عمل دخل رکھتے ہیں۔ شہزادہ محمد مملکت میں اعتدال پسند اسلام رائج دیکھنا چاہتے ہیں، انہوں نے کئی بار یہ اظہار کیا کہ اس کے تمام شہری دیگر مذاہب کا بھی احترام کریں اور حکومت اجتہاد سے کام لے کر ایسے اقدامات کرے جو بلا تفریق تمام شہریوں کی زندگیاں آسان بنا دیں۔

مشہور برطانوی اخبار، گارڈین کو انٹرویو دیتے ہوئے شہزادہ محمد نے کہا "پچھلے تیس برس کے دوران سعودی معاشرہ نارمل نہیں ہو رہا اور بتدریج انتہا پسندی کی طرف مائل ہوتا گیا۔" انہوں نے

دعویٰ کیا کہ ایرانی انقلاب کا مقابلہ کرنے کے لیے سعودی حکومت نے معاشرے میں ایسے قوانین متعارف کرائے جو سخت تھے۔ ''مگر اب ہم سعودیہ میں معتدل اسلام کا بول بالا کرنا چاہتے ہیں جو ہمارا حقیقی مذہب ہے۔''

بین المذاہب مکالمہ

سعودی عرب نے ایک شعبہ ''بین الاقوامی مرکز برائے بین المذاہب مکالمہ'' کا بھی افتتاح کیا جس میں دیگر مذاہب کے لوگوں کے ساتھ روابط کو استوار کرنا مقصود ہے۔

اس کے علاوہ ''شاہ عبدالعزیز مرکز برائے قومی مکالمہ'' بھی ملک کے اندر شہریوں میں رواداری کو فروغ دینے کے لیے کوشاں ہے۔ اس ادارے نے اعلان کیا ہے کہ اُس نے خطے میں رواداری سے متعلق اپنی نوعیت کا پہلا انڈیکس تیار کیا ہے۔ اس انڈیکس کے ذریعے معاشرے میں رواداری کی حقیقی صورت حال کو جانا جاسکتا ہے۔

مزید یہ کہ سعودی عرب کی سربراہی میں 2012ء میں آسٹریا اور اب یورپ میں KAICIID کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا جو مذہبی آزادی، بین المذاہب مکالمہ اور امن کاری کے لیے دنیا میں ایک مؤثر ترین فورم کے طور پہ آگے بڑھ رہا ہے۔

مکہ دستاویز

2019ء میں رابطہ عالم اسلامی نے مکہ مکرمہ میں اپنے اختتامی اجلاس کے موقع پر ''مکہ دستاویز'' جاری کی،اس میں مسلم معاشروں کے مختلف طبقات کے درمیان رواداری اور پُر امن بقائے باہمی کے فروغ کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔ یہ سات صفحات کو محیط ہے اور اس میں انتیس مختلف اسلامی اصول بیان کیے گئے ہیں۔ان کے ساتھ رواداری اور مساوات کے فروغ اور منافرت پھیلانے والے مبلغین کی حوصلہ شکنی کے لیے رہ نماہدایات دی گئی ہیں ۔ نیز کسی فرقے کے پیروکاروں کو کم تر خیال کرنے کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔

ابتدائی صفحہ میں دستاویز کو مقدس شہر مکہ مکرمہ سے جاری کرنے کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے کہ اس کو کیوں دنیا بھر میں بسنے والے ایک ارب ساٹھ کروڑ مسلمانوں کے قبلہ کے مقام سے جاری کیا جارہا ہے۔

اس میں اسلام کے خلاف منافرت پھیلانے کی روک تھام کے لیے تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ دستاویز میں کہا گیا ہے کہ "اسلاموفوبیا اسلام کو حقیقی طور نہ جاننے کا نتیجہ ہے۔اسلام کو درست طور پر جاننے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا معروضیت سے مطالعہ کیا جائے اور کوئی بے بنیاد حکم لگانے سے گریز کیا جائے"۔

دستاویز میں دوسرے ممالک کے داخلی امور میں مداخلت اور بالخصوص سیاسی بالادستی، اقتصادی لالچ یا فرقہ وار نظریات کی حوصلہ افزائی کے ذریعے دخل اندازی کو مسترد کیا گیا ہے۔

اس میں کسی خاص دین کو اس کے پیروکاروں کے سیاسی اعمال سے جوڑنے سے متعلق امور کا بھی احاطہ کیا گیا ہے اور اس حقیقت پر زور دیا گیا ہے کہ توحید پر مبنی تینوں بڑے ادیان کا ان کے پیروکاروں کی منفی سرگرمیوں اور اعمال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

دین اور ثقافت سے متعلق تنازعات کے خاتمے کے لیے دستاویز میں نفرت پھیلانے والے مبلغین اور تشدد اور دہشت گردی کی حوصلہ افزائی کرنے والوں کے خلاف قانونی کارروائی کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔

دستاویز کے انیتس میں سے ایک اصول میں کہا گیا ہے کہ "یہ ہر کسی کی ذمے داری ہے کہ وہ دہشت گردی اور جبر واستبداد سے نمٹنے کے لیے کردار ادا کرے اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کو مسترد کردے۔اس میں اسلام میں خواتین کے حقوق پر زور دیا گیا ہے۔ بالخصوص ان حقوق کے مذہبی، سائنسی، سیاسی اور سماجی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا تھا اور جنس کی بنیاد پر اجرتوں میں تفریق کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔

پرامن بقائے باہمی کے لیے مسلم تاریخ میں پہلے بھی کئی اقدامات کیے گئے جس کا فائدہ ہوتا

ہے۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد مسلمانوں کا یہود اور مقامی آبادی سے ایک معاہدہ طے پایا تھا۔ تاریخ میں یہ میثاقِ مدینہ کے نام سے معروف ہے۔ یہ ایک آئینی دستاویز تھی جس کا مقصد ریاست مدینہ میں آباد مختلف عناصر اور طبقات کے درمیان اتحاد و یگانگت کو فروغ دینا اور پُرامن بقائے باہمی کے اصول کی بنیاد پر مل جل کر رہنے کی حوصلہ افزائی کرنا تھا۔

نصاب میں اصلاحات

سعودی عرب کے اندر وژن 2030ء کے تحت سماج میں رواداری کو فرغ دینے کے لیے نہ صرف یہ کہ انتظامی دائرے میں اقدامات کیے گئے بلکہ نصاب میں اعتدال پسندی اور رواداری کے موضوعات پر مواد شامل کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ حکومتی سطح پہ نوجوانوں کے لیے تعلیمی اداروں میں اور باہر تربیتی شعبے قائم کیے گئے تاکہ سخت گیر فکر کا مقابلہ کیا جاسکے۔ سعودی عرب کے اس ضمن میں اقدامات بین الاقوامی معیار کے سمجھے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سعودی عرب میں امن وامان کی فضا تشکیل پا گئی ہے۔ بالخصوص عرب بہار کے بعد کچھ ممالک میں تلخ تجربات کے بعد عوام ریاست کے حق میں ہیں اور اس کی پالیسیوں کو سراہتے ہیں، جبکہ کچھ طبقات تنقید بھی کرتے ہیں۔

ایران میں مذہبی اقلیتوں کی صورتحال

تحمید جان ازہری

مشرق وسطی میں ایران ایک ایسا ملک ہے جسے عالمی سطح پہ کافی تنقید کا نشانہ بھی بنایا جاتا ہے اور اس پہ کئی طرح کی پابندیاں بھی عائد ہیں۔ اس کے علاوہ مسلکی تشخص کے ضمن میں بھی اسے سخت گیر سمجھا جاتا ہے۔جبکہ ایک تیسرا پہلو یہ بھی ہے کہ مذہبی افکار کے حوالے سے جتنا تنوع ایران میں پایا جاتا ہے اتنا مشرق وسطی کے کسی دوسرے ملک میں نہیں۔ لہذا ایران میں مذہبی آزادی کی صورتحال سے آگہی بہت سے لوگوں کے لیے کافی دلچسپ ہوتی ہے۔ زیرنظر مضمون میں ایران کے اسی مذہبی تنوع اور اس کی حالت پر کلام کیا گیا۔ مضمون نگار تحمید جان ازہری تربیت کار اور سماجی کارکن ہیں۔ گزشتہ کئی سالوں سے ملک میں رواداری کے فروغ اور اس سلسلے میں نوجوانوں کی فکری تربیت میں مشغول ہیں۔

تاریخی تناظر

تاریخی طور پر زرتشتیت ایران کا قدیم مذہب تھا، خاص کر ہخامنشی سلطنت(The Achaemenid Empire)، سلطنت اشکانیان(The Parthian Empire)اور ساسانی سلطنت(The Sasanian or Sassanid Empire)کے ادوار میں زرتشتیت ہی ایران کا سب سے بڑا مذہب تھا۔651ء کے لگ بھگ مسلمانوں نے ایران کو فتح کیااور یہاں سے آتش پرست ساسانی سلطنت کا سقوط ہو گیا، مسلم فتح کے بعد دھیرے دھیرے اسلام پھیلتا گیا۔ایران میں لوگ 15ویں صدی تک سنی اسلام کے پیروکار تھے،تاہم 1501 میں صفوی سلطنت قائم ہوئی جس نے 16ویں صدی میں زیادہ تر مسلم آبادی کو اثنا عشریہ اہل تشیع مسلم میں تبدیل کیا۔

سرکاری مذہب

آج اثنا عشریہ شیعہ اسلام ایران کا سرکاری مذہب ہے۔ایران کی 90 فیصد آبادی شیعہ اسلام کی پیروکار ہے،8 فیصد سنی اسلام اور باقی کے 2 فیصد غیر مسلم ہیں۔

دیگر مذاہب

2011 کی ایرانی مردم شماری کے مطابق، 99.94 فیصد ایرانی اسلام پر یقین رکھتے ہیں، جبکہ باقی آبادی دیگر اقلیتوں کے سرکاری طور پر تسلیم شدہ اقلیتوں: مسیحیت، یہودیت اور زرتشت پسندی پر یقین رکھتی ہے۔تاہم، ایرانی حکومت میں الحاد کو تسلیم نہیں کیا گیا اور اسلام سے مرتد ہونے والے کو سزائے موت بھی دی جاسکتی ہے۔ ایک سروے میں بتایا گیا ہے کہ 96.5 فیصد ایرانی شہری اسلام پر یقین رکھتے ہیں۔

مذہبی آزادی اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ

آئینی طور پہ تسلیم شدہ اقلیتوں کے لیے ایران میں حقوق کے تحفظ کے لیے قوانین موجود ہیں۔امام خمینی کے کئی ایسے خطبات موجود ہیں جن میں انہوں نے علماء کو یاد دہانی کرائی کہ اپنے مخالف نظریات کو وسعت قلب کے ساتھ سنیں اور اجارہ داری کا تاثر دینے اور تہمتیں لگانے سے پرہیز کریں۔ مثال کے طور پہ انہوں نے کہا:

”میں یاد دہانی اور تاکید کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ آج جبکہ بہت سے جوان اور دانشور ہمارے اسلامی ملک کے آزاد ماحول میں یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ مختلف اسلامی مسائل اور موضوعات کے بارے میں اپنے نظریات بیان کر سکتے ہیں تو آپ لوگ خندہ پیشانی اور وسعت قلب کے ساتھ ان کی باتوں کو سنئے اور اگر وہ غلط راستے پر چل رہے ہیں تو آپ لوگ محبت اور خلوص سے لبریز بیان کے ساتھ ان کو اسلامی راستہ دکھائیں اور اس نکتے کو مد نظر رکھئے کہ ان کے معنوی اور

جذباتی احساسات وجذبات سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا ہے اور ان کی تحریروں پر بے دینی اور گمراہی کی تہمت نہیں لگائی جاسکتی اور سب کو دفعتاً شک وتردد کی وادی میں نہیں دھکیلا جاسکتا ہے"۔[1]

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"حکومتی اسلام کے برخلاف اسلامی حکومت میں شریعت اسلامی کے مقرر کردہ حدود میں فکر واظہار کی آزادی ہے اور کسی کو یہ آزادی سلب کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ اسلامی جمہوریہ ایران کے آئین میں اس سلسلے میں بہت گرانقدر نکات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً، شق ۲۴ میں آیا ہے "اخبار وجرائد اس وقت تک مطالب بیان کرنے میں آزاد ہیں جب تک وہ اسلامی اصولوں یا عمومی حقوق کے خلاف مطالب درج نہ کریں اور ان پر پابندی لگانے کا تعین قانون کرے گا"۔[2]

"جماعتوں، پارٹیوں، سیاسی جماعتوں، اسلامی تنظیموں اور معروف دینی اقلیتوں کو آزادی حاصل ہے بشرطیکہ خود مختاری، آزادی، قومی محاذ، اسلامی قوانین اور اسلامی جمہوریہ کی بنیاد کے خلاف کوئی عمل انجام نہ دیں۔ کسی شخص کو بھی ان کارکن بننے سے منع نہیں کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی کسی ایک کارکن بننے پر مجبور کیا جاسکتا ہے"۔[3]

اسی طرح امام خمینی کا قول ہے:

"ہم نے بارہا کہا ہے کہ اسلام دینی اقلیتوں کے احترام کا قائل ہے اور وہ ہماری اس مملکت میں آزاد ہیں یہاں تک کہ انہیں ووٹ دینے کا حق ہے، انہیں اپنے رکن پارلیمنٹ کے انتخاب کا حق حاصل ہے، یہ جو کہا گیا ہے کہ ہم ان کے مخالف ہیں یہ شاہ کی پھیلائی ہوئی افواہ ہیں، اسلام نے ہمیشہ ان کے ساتھ پرامن رویہ اختیار کیا ہے اور یقیناً اسلامی حکومت میں ان کی زندگی موجودہ زندگی سے

---

[1] پیام استقامت، تیر ماہ، 667

[2] آئین شق نمبر، 244

[3] آئین شق نمبر، 26

بہتر ہو گی۔''[4]

غیر تسلیم شدہ اقلیتیں

ایران میں مسیحیوں، یہودیوں اور زرتشتیوں کو تو باقاعدہ تسلیم شدہ مذہبی اقلیتوں کی حیثیت حاصل ہے، مگر اس حیثیت سے صوفی اور بہائی برادریوں کو محروم رکھا گیا ہے۔ ان مذہبی اقلیتی گروپوں کو شیعہ اکثریتی آبادی والے ایران میں 'بدعتی گروہ' قرار دے کر ان کا تعاقب کیا جاتا ہے۔

یہودی اقلیت سب سے محترم

ایران کی اقلیتی برادریوں میں سب سے قابل احترام برادری یہودی ہیں۔ اسرائیل کے شدید ترین دشمن خیال کیے جانے کے باوجود جائزے میں یہودی مخالف ایرانیوں کی تعداد کم ہے۔ مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ میں یہود مخالفت کے بارے میں ایک عالمی تنظیم کے حالیہ جائزے سے یہ نتیجہ سامنے آیا ہے کہ یہود مخالفت میں ایرانی سب سے پیچھے ہیں۔ اس نتیجے کو عام تصور کے برخلاف اور حیران کن تصور کیا جاتا ہے۔ اینٹی ڈیفیمیشن لیگ (اے ڈی ایل) یا ہتکِ عزت مخالف لیگ نامی تنظیم کے اس جائزے کے مطابق صرف 56 فیصد ایرانی یہودیوں کے خلاف رائے رکھتے ہیں جب کہ ترکی میں اس رائے کا تناسب 69 فیصد اور فلسطینی علاقوں میں 93 فیصد ہے۔ ایران خود کو یہودی مخالف قرار دینے کی بجائے اسرائیل مخالف کہتا ہے۔ اگرچہ حکومتی سطح پر اسرائیلی یہودیوں کے بارے میں سخت رویہ اپنایا جاتا ہے اور اس حوالے سے رائے بھی ہموار کی جاتی ہے، اس کے باوجود ڈی ایل کا جائزہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ایرانی آبادی کا بڑا حصہ ایرانی سخت گیر قیادت کے ان منفی خیالات سے متاثر نہیں ہے جو وہ یہودیوں کے بارے میں رکھتے ہیں۔ یہودی برادری کے مطابق اب اسلامی جمہوریہ ایران میں لگ بھگ 12 ہزار سے 15 ہزار تک کے یہودی مذہب کے پیروکار موجود ہیں۔

ایران میں یہودیوں کی موجودگی کی تاریخ تین ہزار سال پہلے کی ہے۔ اس وقت ایران کی

---

[4] صحیفہ امام، 5/234

یہودی برادری کا پارلیمنٹ میں ایک نمائندہ ہے اور یہودی مذہب کے پیروکار دوسرے ایرانیوں کی طرح حقوق اور دوسری خدمات سے مستفید ہوتے ہیں۔

امام خمینی نے انقلاب کے بعد کہا تھا کہ ایران کے نقطہ نظر سے اسلامی جمہوریہ ایران میں موجود یہودی برادری کا ناجائز صہیونی ریاست سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

2014ء میں ایران اور عراق کے درمیان آٹھ سال [1980-1988] جاری رہنے والی جنگ میں 'کام آنے والے 'ایرانی یہودیوں کی ایک تاریخی یادگار قائم کی گئی تھی۔اس جنگ میں مجموعی طور پر دونوں ملکوں کے دس لاکھ سے زاید افراد لقمہ اجل بنے تھے۔ جنگ میں مارے جانے والے یہودی فوجیوں کی یادگار کی تقریب میں اُس وقت کے صدر حسن روحانی کے مشیر برائے اقلیتی و مذہبی امور علی یونسی سمیت کئی اہم شخصیات نے شرکت کی تھی۔

بہائی برادری کے لیے مسائل

ایران میں موجود یہودیوں کے علاوہ دیگر اقلیتوں میں سے جن کو مسائل کا سامنا ہے ان میں سے بہائی برادری سر فہرست سمجھی جاتی ہے۔ایران میں صوفی مذہبی برادری اور بہائیوں کی حالت خاص طور پر باعث تشویش ہے۔انسانی حقوق کی تنظیموں کے مطابق اسلامی جمہوریہ ایران میں صوفی، بہائی اور دیگر اقلیتی مذہبی برادریوں کے ارکان کا ان کے عقیدے کی وجہ سے تعاقب کیا جاتا ہے اور انہیں گرفتار کر لیا جاتا ہے۔

بہائی عقیدہ ایک نسبتاً جدید وحدانیت پسند مذہب ہے جس کی روحانی جڑیں ایران میں انیسویں صدی کے اوائل سے ہیں جو تمام لوگوں کے اتحاد اور مساوات کو فروغ دیتا ہے۔ بہائی پیروکاروں کا کہنا ہے کہ عقیدے کے اصول ایک غیر متصادم نقطہ نظر کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں جسے "تعمیری لچک'' کہا جاتا ہے اور اصرار کرتے ہیں کہ ایران کے بہائی ملکی قیادت کے خلاف نہیں بلکہ ریاست کی بھلائی کے لیے کام کرنا چاہتے ہیں۔

ایران میں بہائی فرقے سمیت دیگر اقلیتوں پر دباؤ کے حوالے سے طویل قید کی سزاؤں، قتل کی دھمکیوں اور نفسیاتی تشدد کی خبریں بڑے پیمانے پر حالیہ دنوں میں منظر عام پر آتی رہی ہیں جس سے عالمی برادری اور انسانی حقوق کے کارکنوں میں تشویش پائی جاتی ہے۔

ایران میں بہائی مذہب کے پیروکاروں پر تمام حکومتی ملازمتوں اور سماجی پینشن کے نظام کے دروازے بند ہیں۔ وہ نہ تو جائیداد کے مالک بن سکتے ہیں اور نہ ہی انہیں اپنے خلاف جرائم یا کسی نقصان کے نتیجے میں ازالہ وصول کرنے کا حق حاصل ہے۔

سُنی مسلک کے شہری

ایران میں مسلم اکثریتی مسلک اہل تشیع کے علاوہ سنی مسلک کو ماننے والوں کی تناسب آٹھ فیصد ہے۔ آئین و قوانین میں انہیں برابر حقوق حاصل ہیں لیکن وہاں کے سنی علما کی تنظیمیں اور انسانی حقوق کی تنظیمیں کہتی ہیں کہ سنی آبادی کو عملاً امتیازی سلوک کا سامنا ہے۔ ایرانی کے مشہور صحافی اور مصنف بھمن نیرومند کے مطابق ایرانی آئین تو سُنیوں کو برابر کی آزادی فراہم کرتا ہے اور ایرانی وزارت خارجہ بھی یہی کہتی ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''عملی طور پر ایران میں سُنی اقلیت کے ساتھ امتیازی سلوک برتا جاتا ہے۔''

ہیومن رائٹس واچ کے مطابق سول سروس اور سیاسی سطح پر بھی سُنیوں کو دشواریوں کا سامنا ہے۔ سن دو ہزار تین میں اٹھارہ سنی اراکین پارلیمان نے ایران کے روحانی پیشوا کے نام 'کھلا خط' لکھا تھا کہ ان کے ساتھ دوسرے درجے کے شہریوں جیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ مقامی میڈیا کے مطابق ایران میں پہلی مرتبہ سن دو ہزار پندرہ میں کسی سنی عقیدت کے حامل شخص کو سفارتکار بنایا گیا تھا۔

ایران میں حکمران طبقے کو ملک کے اندر بھی ایک سخت گیر عنصر سمجھا جاتا ہے۔ اگر ایران میں مذہبی رواداری کے کچھ مسائل موجود ہیں تو اس کا ذمہ دار سماج کی ذہنیت کی بجائے حکمران حلقے کو خیال کیا جاتا ہے۔

مذہبی تبدیلی کی جستجو

یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ ایران میں عوامی سطح پہ مذہبی تبدیلی کی جستجو میں اضافہ ہو رہا ہے۔ایران میں The Grpup for Analyzing and Measuring Atitudes in Iran(GAMAAN) کی طرف سے کرائے گئے سروے میں 50ہزار ایرانی شہریوں سے سوالات کیے گئے۔اس سروے سے معلوم ہوا کہ ان میں سے 47 فیصد افراد نے بتایا کہ ان میں "مذہبی ہونے سے غیر مذہبی ہونے کی طرف تبدیلی آئی ہے۔‘‘

ایرانی مردم شماری کے مطابق ملک میں 99.5 فیصد آبادی شیعہ مسلمانوں کی ہے۔ تاہم GAMAAN کی طرف سے کرائے گئے سروے میں شریک افراد کی 80 فیصد تعداد کا کہنا تھا وہ خدا پر یقین رکھتے ہیں تاہم صرف 32.2 فیصد نے اپنی شناخت شیعہ مسلمان کے طور پر کرائی۔ اعداد و شمار کے مطابق ان میں سے نو فیصد نے خود کو لادین، آٹھ فیصد نے زرتشت، سات فیصد نے روحانی، چھ فیصد نے لادری جبکہ پانچ فیصد نے خود کو سنی مسلمان کے طور پر ظاہر کیا۔ سروے میں شامل قریب 22 فیصد افراد نے ان میں سے کسی بھی گروپ سے اپنا تعلق نہیں بتایا۔

لبنان: مذہبی و فرقہ وارانہ کشمکش کی سرزمین

شفیق منصور

لبنان جو کبھی مشرق وسطی کا پیرس کہلاتا تھا اور ایک نہایت ہی پرامن اور سیاحتی علاقہ تھا، آج وہاں بدامنی پھیلی ہوئی ہے اور معاشی حالت انتہائی ابتری کا شکار ہے۔ ماہرین اس کی وجہ مذہبی و فرقہ وارانہ تنازعات بتاتے ہیں۔ سماج مختلف طبقات میں تقسیم ہیں اور قومی مفادات کو بھی گروہ بندیوں کے ساتھ منسلک کردیا گیا ہے۔ فرقہ وارانہ مسلح کشمکش نے ملک میں عدم تحفظ اور عدم استحکام کو جنم دیا ہے۔ یہ ملک ایک ایسی مثال ہے جس سے دیگر مسلم دنیا کے لیے سیکھنے کے لیے بہت سا سبق ہے۔اس مضمون میں لبنان کی سخت گیر بین المذاہب و بین المسالک کشاکش کی تاریخ کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے کہ کس طرح رفتہ رفتہ ایک پرامن خطہ بدامنی کا شکار ہوگیا۔ مضمون نگار سالنامہ 'تحقیقات' کے مدیر اور انٹرنیشنل کونسل برائے مذہبی امور میں بطور ریسرچر کام کرتے ہیں۔

مذاہب و مسالک

لبنان میں سرکاری طور پر 18 منظور شدہ مذہبی فرقے آبادی ہیں۔ان میں سے بارہ مسیحی، چار اسلامی، ایک دروزی اور ایک یہودی ہے۔ کل آبادی میں مسلمانوں کی تعداد 75.7 فیصد ہے۔ان میں سے 28.7 فیصد سنی اور 28.6 فیصد ہی شیعہ ہیں۔ بعض عالمی ذرائع مسلمانوں کی تعداد 60 فیصد تک بتاتے ہیں۔ دراصل لبنان میں ابھی تک مردم شماری نہیں کرائی گئی۔ تمام فرقوں کو خدشہ ہے کہ اگر ناپسندیدہ نتائج آئے تو ملک دوبارہ خانہ جنگی کا نشانہ بن سکتا ہے۔اسی لیے مردم شماری کرانے سے گریز کیا جاتا ہے۔

مسلمان اور مسیحی

ماضی کی نسبت لبنان میں اب مسلمانوں کی تعداد خاصی بڑھ چکی ہے۔ایک وجہ تو یہ ہے کہ

خانہ جنگی کے دوران پندرہ سولہ لاکھ مسیحی مغربی ممالک ہجرت کر گئے۔ دوم، مسلمانوں میں شرح پیدائش غیر مسلموں سے زیادہ ہے۔ اسی لیے لبنان میں پہلے کی نسبت کہیں زیادہ مسلمان آباد ہیں۔ عام طور پر سرکاری معاملات میں دروزیوں کو بھی مسلمانوں کے ساتھ شامل کیا جاتا ہے۔ لبنان میں آبادی کا 5.6 فیصد حصّہ دروزی ہے۔

مسیحی فرقے آبادی کا 29 فیصد حصّہ ہیں۔ ان میں 21 فیصد مارونی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ رومن کیتھولک کلیسا کے تحت آتے ہیں۔ 8 فیصد مسیحی یونانی کلیسا اور بقیہ دیگر چھوٹے فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

آبادی کا فرقہ وارانہ جغرافیائی تناظر

سنی مسلمان جنوبی لبنان کے ساحلی مقامات، شمالی لبنان، طرابلس اور مغربی بیروت میں آباد ہیں۔ شیعہ مسلمان جنوبی بیروت، وادی البقاع اور جنوبی لبنان میں بستے ہیں۔ مارونی فرقے کے باشندے مشرقی بیروت اور لبنان کے پہاڑی علاقوں میں رہتے ہیں، دیگر مسیحی فرقوں کے لوگ شہری یا دیہی آبادی میں شامل ہیں۔ واضح رہے، لبنان میں 88 فیصد افراد شہروں میں رہتے ہیں۔

کثیر الجہت فرقہ وارانہ ریاستی نظام

مشرقِ وسطیٰ کے پیرس کی شہرت پانے والے اس اہم عرب ملک کی قومی زندگی تضادات میں گندھی ہوئی ہے۔ لبنان میں اقتدار کی تقسیم کثیر الجہت فرقہ وارانہ نظام کے تحت ہے۔ جہاں مختلف فرقے مل کر ملک کی باگ ڈور سنبھالتے ہیں۔ لبنان ایک ایسا ملک ہے جس میں مختلف مذاہب و مسالک کے لوگ آباد ہیں اور یہاں ان بنیادوں پر اختلافات خانہ جنگی تک پہنچے ہیں۔ وہاں اب بھی لبنان کے اقتدار اور اس کے وسائل پر تسلط کے لیے کشمکش جاری ہے۔ یہ مسیحی مسلم بنیادوں پر ہوتی ہے تو کبھی سنی شیعہ بنیادوں پر۔

آئین میں فرقہ وارانہ شناخت

لبنان نے استعمار سے 1946ء میں آزادی حاصل کی تھی لیکن اقتدار کی تقسیم کے حوالے سے اصول و قواعد اس سے قبل فرانسیسی استعمار نے وضع کیے تھے جو آئین کا حصہ بنے۔ 1926ء میں بننے والا لبنان کا یہ آئین مختلف مذہبی گروہوں کے حقیقی تناسب کو مد نظر رکھے بغیر ان کے درمیان طاقت کا توازن قائم کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ 1932ء کی مردم شماری کے مطابق پارلیمنٹ کی سیٹیں 6 مسیحی اور 5 مسلمان کے تناسب سے تقسیم کی گئیں۔ 1946ء میں لبنان ایک ''آزاد ریاست'' کے طور پر وجود میں آیا مگر اس کے باوجود سیاسی ڈھانچہ پرانی طرز پر قائم رہا۔ آئین کے مطابق صدر ایک مارونائٹ مسیحی، اسپیکر ایک شیعہ مسلمان جبکہ وزیر اعظم کے لئے ایک سنی مسلمان ہونا لازم قرار دیا گیا۔ 1948ء کی عرب اسرائیل جنگ کے بعد تقریباً ایک لاکھ دس ہزار فلسطینی مہاجرین لبنان آکر آباد ہو گئے۔ 1960ء تک لبنان میں مسلمان اکثریت میں ہو گئے لیکن قانونی طور پر وہ ''اقلیت'' تھے جس کے باعث ان میں بے چینی جنم لینے لگی۔ 1967ء کی عرب اسرائیل جنگ کے نتیجے میں مزید فلسطینی مہاجرین لبنان میں آباد ہوئے اور 1970ء میں اردن میں سیاہ ستمبر کے بعد لبنان میں ہزاروں فلسطینی مسلح اور منظم ہونا شروع ہو گئے۔ انہوں نے جنوبی لبنان میں اپنے اڈے بنائے جہاں سے وہ اسرائیل کے اندر حملے کرتے تھے۔ اس سب کے بعد مسیحی اور مسلم طبقات کے مابین 1975ء میں خانہ جنگی شروع ہوئی، جو فرقوں اور مسالک تک پھیل گئی۔ 1989ء میں ان مختلف مذہبی طبقات اور فرقوں میں 'صلح' کروائی گئی۔ لیکن 1992ء کے بعد جو آئین بنوایا گیا اس میں اس مذہبی تفریق کو نہ صرف قائم رکھا گیا بلکہ اس کو آئینی اور قانونی تحفظ بھی فراہم کیا گیا۔ آج بھی لبنان میں موجود اہم سیاسی جماعتوں کی بنیاد مذہبی فرقہ واریت پر مبنی ہے جو سماج میں مسلسل انتشار پھیلانے کا باعث بنتی رہتی ہے۔

خانہ جنگی کو ختم کرنے کے لیے 22 اکتوبر 1989ء کو سعودی عرب کے شہر، طائف میں فریقین کے مابین جنگ بندی جو معاہدہ طے پایا تھا اس کے ذریعے لبنان میں آئینی تبدیلیاں بھی انجام پائیں۔ اب وزیر اعظم صدر نہیں پارلیمنٹ کے سامنے جواب دہ بن گیا۔ نیز پارلیمنٹ کی 128 نشستیں مسلمانوں اور غیر مسلموں میں برابر برابر تقسیم ہو گئیں۔ معاہدے کی رو سے لبنان میں تمام مسلح

تنظیمیں بھی ختم کر دی گئیں۔ تاہم حزب اللہ کو کام کرنے کی اجازت مل گئی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ جنوبی لبنان میں اسرائیلی استعمار سے نبرد آزما رہ سکے۔

تقسیم معاشرہ

لبنان اِس وقت مختلف مذہبی و مسلکی فرقوں کے مابین تناؤ کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ عوام کے مفادات بھی ان فرقوں کے ساتھ وابستگی سے جڑ گئے ہیں اور وہ انہی میں کسی کی حمایت پر مجبور ہیں۔ لبنانی عوام فرقہ پرست تنظیموں کے خلاف بولنے یا کوئی بھی قدم اٹھانے سے قاصر ہیں کیونکہ 1990ء کے بعد سے جس طرح ان فرقہ پرست تنظیموں نے ملک کے عوام کو اپنے شکنجے میں کس رکھا ہے، اس سے وہ نفسیاتی طور پر ملک میں موجود فرقہ پرست تنظیموں کے زیرِ اثر آتے چلے گئے۔ اب وہ ان کے علاوہ کسی دوسری سیاسی تنظیم یا جماعت میں شامل ہونا گوارا نہیں کرتے۔ ہر فرقے کی اپنی ایک تحریک و جماعت ہے جو نہایت مضبوط اور سخت گیر ہے۔ جس طریقے سے گزشتہ 30 برس کے دوران لبنانی عوام نے اپنے آپ کو مختلف فرقوں اور تنظیموں میں محصور کر لیا ہے اس کے پیشِ نظر ایسا کوئی متبادل ابھرتا نظر نہیں آتا جو ایک مرتبہ پھر لبنانی عوام کو متحد کر سکے۔ کیونکہ موجودہ بحران میں بھی اپنی روزمرہ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے عوام کی اکثریت انھیں فرقہ وارانہ تنظیموں کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے۔

گروہی اور فرقہ وارانہ مصلحتوں کو لبنان کے قومی مفادات پر مقدم جاننے والی سیاسی قیادت نے عوام کو اپنا ہمنوا بنانے کے لیے یہ تاثر قائم کیا ہے کہ اگر وہ جمہوری لبنان کے شہری کی بجائے اپنی وفاداریاں مخصوص مسلک یا گروہ کے سپرد کریں گے تو ان کی زندگیاں زیادہ محفوظ ہوں گی۔

عدم برداشت کے معیشت پر اثرات

1975ء سے قبل کے دس برسوں میں لبنان کی معیشت میں سالانہ 6 فیصد کا اضافہ ہو رہا تھا جبکہ مہنگائی 5 فیصد پر برقرار رہی۔ ان معاشی پالیسیوں کے نتیجے میں کرنٹ اکاؤنٹ اور فسکل سرپلس پیدا ہوا۔

اس عرصے میں جو سیاح بیروت گھومنے کے بعد ایتھنز کا دورہ کرتے تھے، وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے کہ بیروت کی چمک دمک کے آگے یونان کا دارالحکومت ماند پڑ جاتا ہے۔ صحافی رانیہ ابوزیدی نے حال ہی میں 'نیویارک ٹائمز' میں اس بات کی نشاندہی کی کہ لبنان میں حکومتی عہدے میرٹ کی بنیاد پر نہیں دیے جاتے۔ ان کے مطابق یہ عہدے 'محصصۃ' (کوٹہ سسٹم) کی بنیاد پر دیے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سرکاری عہدے من پسند فرقے سے تعلق رکھنے والے افراد کو ہی دیے جاتے ہیں۔

لبنان میں آبادی کا تناسب بدل گیا ہے۔ لبنان میں مسیحی اپنے ہی وطن میں بدلتی اقلیت اور اقتدار میں دوسری جماعتوں کی اکثریتی شراکت سے پریشان ہیں۔ پارلیمان میں مسیحیوں کی زیادہ نمائندگی، ہو سکتا ہے کہ اگلے ایک یا دو عشروں تک کے لیے قابل قبول ہو اور ہو سکتا ہے کہ اسے بالکل بھی برداشت نہ کیا جائے۔ ملک میں ایک طرف اقتدا کے حصول کے لیے بین المذاہب سطح پر کشمکش ہے تو دوسری طرف بین المسالک سطح پر بھی بدامنی نمایاں ہے۔ لبنان کے حکومتی حلقوں میں اب بھی ایک چیختی ہوئی خاموشی گونج رہی ہے اور سر پر گھمبیر مسئلوں کی تلوار لٹک رہی ہے اور یہ صورتحال مشرق وسطی کو ایک نئی خونریزی کی طرف دھکیل رہی ہے۔

تاریخی طور پر جب تک لبنان، وہاں کے عوام کی پہلی ترجیح رہا اور وہ خود کو سنی، شیعہ، میرونائٹ یا دروز فرقوں سے ماورا لبنانی شہری سمجھتے رہے تو بیروت کی یہ مسلکی ہمہ ہمی لبنانیوں کا اثاثہ تھی۔ مگر جب انہوں نے فرقہ وارانہ وابستگی کو لبنان سے مقدم جاننا شروع کیا تو ایسے میں یہی مسلکی تنوع ان کے درمیان دشمنی، مقابلے اور تنازع کی بنیاد بن گیا۔ بحران کے دنوں میں لبنان کی حقیقی امید اس کے عوام اور سول سوسائٹی ہیں کہ وہ اپنی عوامی اور شہری قوت کو سیاسی طاقت میں تبدیل کرتے ہوئے فرقہ واریت سے پاک سیاسی جماعتیں تشکیل دینے کے لیے آگے بڑھیں تاکہ جمہوری تبدیلی کی راہ ہموار ہو سکے اور فرقہ واریت کی بیخ کنی ممکن ہو۔

ترکی، اقلیتوں کے لیے محفوظ اور مثالی جگہ

فائزہ حسیب

مسلم دنیا میں سے ترکی کو کئی حوالوں سے امتیازی خصوصیات کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ اس سماج میں ہر نظریے والے فرد کو جس طرح کی آزادی میسر ہے وہ قابل ستائش ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک عمدہ سیاحتی مرکز ہے اور مختلف ممالک و مذاہب کے لاکھوں لوگ بلاخوف وہاں کا رخ کرتے ہیں۔ اگرچہ گزشتہ ایک دہائی سے تسلسل کے ساتھ عالمی میڈیا میں ترکی کو نشانہ بنایا جاتا ہے کہ وہاں اسلام پسند حکومت قائم ہے۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ اس معاشرے میں کسی بھی طرح مذہبی اقلیتی طبقات کو نشانہ نہیں بنایا گیا اور نہ ان کے حقوق کو دبایا گیا ہے۔ ترکی میں مسلکی سطح پہ علویوں کے خلاف جو رائے رہی ہے وہ تاریخی ہے جس میں اب بہتری آتی جارہی ہے۔ زیرنظر مضمون میں مذہبی آزادی کے پس منظر میں ترکی کی تاریخی اور عصری صورتحال کا جائزہ لیا گیا ہے۔ فائزہ حسیب ادارہ 'وائس میڈیا نیٹ ورک' کی ایگزیکٹو ڈائریکٹر ہیں۔

مذہبی شناختیں

اسلام ترکی کا سب سے بڑا مذہب ہے۔ تقریباً 99.8 فیصد لوگوں نے خود مسلمان درج کروایا ہے۔ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کے والدین کسی مصدقہ مذہب کے ماننے والے نہیں ہیں۔ باقی 2 فیصد میں مسیحی، یہودی، دیگر مذاہب کے ماننے والے ہیں۔ اس طریقہ کار سے لادین مسلمان ماں باپ کے غیر مذہبی بچے جنہوں نے خود کو کسی غیر مذہبی ہونا درج نہیں کروایا ہے، مسلمان مانے شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ اپنا مذہبی ریکارڈ تبدیل یا حذف کروا سکتے ہیں۔ اس کے لئے ایک ای فارم بھرا جاتا ہے اور ای دستخط کیا جاتا ہے۔ حکومت نے یہ اختیار مئی 2020ء سے دیا ہے۔ سرکاری دستاویز میں مذہب تبدیل کروانے کے بعد نیا شناختی کارڈ جاری ہوتا ہے۔ اور مردم شماری ریکارڈ میں تنقیح کا عمل کیا جاتا ہے۔

مسلم آبادی کی تعداد

حکومتی اعداد و شمار کے مطابق ترکی میں مسلمان 99 فیصد ہیں مگر تعلیمی اور ادارتی تحقیقات ثابت کرتی ہیں کہ ترکی میں کل 90 فیصد ہی مسلمان ہیں۔ بعض ادارے اس سے بھی کم بتاتے ہیں۔ ترک ادارے 'اپسوس' نے 17180 بالغ افراد کا انٹرویو کیا جس سے یہ نتیجہ سامنے آیا کہ ترکی میں 82 فیصد مسلمان ہیں، 7 فیصد لامذہب ہیں، 6 فیصد روحانیت میں یقین رکھتے ہیں مگر کسی مذہب کو نہیں مانتے۔ یہ اعداد و شمار ان 17180 انٹریو کی بنیاد پر ہیں۔

مسالک اور فرقے

2006ء میں سابانچی یونیورسٹی نے ایک سروے کرایا، اس کے مطابق ترکی میں 98.3 فیصد مسلمان تھے۔ ان میں تقریباً 80.5 فیصد آبادی سنی مسلمانوں کی ہے۔ ان کے علاوہ شیعہ، علوی شیعہ، فقہ جعفری اور نصیریہ کی تعداد مسلمانوں کی تعداد کا کل 16.5 فیصد ہے۔ شیعہ مسلمانوں میں ایک وافر حصہ اسماعیلیوں کا بھی۔ مسیحیت، اورینٹل راسخ الاعتقادی، یونانی راسخ الاعتقاد کلیسیا اور آرمینیائی رسولی کلیسیا اور یہودی اور سفاردی یہودی کل آبادی کا 0.2 فیصد ہیں۔

سرکاری طور پہ سیکولر ریاست

سرکاری طور پر ترکی ایک سیکولر ریاست ہے جہاں 1928ء کی آئینی ترمیم کے بعد اس ریاست کا کوئی سرکاری مذہب نہیں ہے۔ 5 فروری 1937ء کو جدید ترکی کے بانی اور پہلے صدر مصطفیٰ کمال اتاترک نے ترکی میں سیکیولرازم کو مضبوط کیا اور مکمل طور پر نافذ کر دیا۔

تعلیمی اداروں میں مذہبی تعلیم

مگر آج کے دور میں تمام ابتدائی اور عالی اسکولوں میں مذہب کا ایک مضمون ضرور ہوتا ہے

جس میں سنی اسلام کی ترویج ہوتی ہے۔ البتہ دیگر مذاہب کو بھی پڑھایا جاتا ہے۔ ان کلاسوں میں طالبعلموں کو سنی اسلامی طریقہ پر نماز اور دیگر طریقہ عبادت بھی سکھایا جاتا ہے۔ اس طرح گرچہ سرکاری طور ترکی ایک سیکولر ریاست ہے مگر در حقیقت یہاں اسلام کا غلبہ ہے۔ گو کہ اسکولوں میں مذہبی تعلیمات ایک متنازع امر رہا ہے۔

ترکی مذہبی رواداری کے اعتبار سے ایک مثالی ملک

ترکی میں مذہبی رواداری کو سیکولرزم کی دین بھی سمجھا جاتا ہے۔ عقائد کے معاملے میں خاصی پختہ قوم کے باوجود ترکوں نے کوئی بڑا مذہبی لیڈر پیدا نہیں کیا کیونکہ ایسا کرنے کی صورت میں ریاست کے سیکولر آدرشوں سے تصادم کا خطرہ تھا۔ اور پھر قید و بند کی (غیر منطقی) صعوبتیں بھی تھیں۔ آج بھی ترکی کے سیاسی اور قانونی نظام پر سیکولرازم کے عروج کے زمانے کے نقوش سلامت ہیں۔ بوسٹن (امریکا) کی نارتھ ایسٹرن یونیورسٹی کے تجزیہ کار برنا تورم کا کہنا ہے کہ ترکی کے اسلامی عناصر آج بھی ری پبلک (ریاست) کے فرزند ہیں۔

بین المسالک تاریخی کشیدگی

تاریخی طور پہ ترکی میں بین المذاہب سے زیادہ بین المسالک کشیدگی پائی جاتی رہی ہے۔ اس ضمن میں سنیوں اور علوی شیعوں کے مابین شدید اختلاف رہا ہے۔ ترکی میں ایک بڑی تعداد علوی شیعوں کی پائی جاتی ہے۔ پہلے ترکی میں علومی مسلک کے لوگ اپنی شناخت چھپا کر رکھتے تھے۔ ماضی میں سنیوں اور علویوں کے علاقے بھی الگ الگ ہوا کرتے تھے۔ ان کا رہن سہن بھی الگ تھا اور رسوم بھی الگ تھیں۔ ان میں ساتھ رہنے کا رجحان نہیں تھا۔ معاشی سرگرمیوں کی حد تک تو ان میں میل جول تھا مگر مجموعی طور پر وہ ایک دوسرے سے بیگانے رہتے تھے۔ شہروں کی آبادی میں اضافے سے یہ ہوا کہ سنی اور علوی ایک علاقے ہی میں نہیں بلکہ ایک عمارت میں بھی ساتھ ساتھ رہنے لگے۔ ان کے بچے ساتھ ساتھ

پڑھتے ہیں۔ سنی اور علوی جب ایک دوسرے کے قریب آئے تو ان کے رویے میں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ انہوں نے ایک دوسرے میں دلچسپی لینا شروع کی، ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے لگے۔ علویوں کی عبادت گاہیں کم ہیں۔ انہوں نے شہری کلچر کے زیر اثر سیکولرازم کو اپنالیا۔ اب ان کے لیے علیٰحدہ مذہبی حیثیت محض علامتی سی ہو کر رہ گئی ہے۔ سنیوں میں بھی سیکولر اقدار پروان چڑھیں تو دونوں نے ایک دوسرے کو زیادہ قبول کیا۔ ایسے ماحول میں ان کے مابین شادیاں بھی ہونے لگی ہیں۔ ترکی میں سنیوں کے بیشتر علما نے علویوں سے شادی کی اجازت دے رکھی ہے کیونکہ ان کے نزدیک علوی بھی اللہ اور رسول اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور حضرت علی کو دیگر پر مقدم رکھتے ہیں۔

سنیوں اور علویوں میں بعض امور بہت مختلف ہیں۔ سنی مسجد میں عبادت کرتے ہیں اور علوی اپنی عبادت گاہ کو سیمیوی (Cemevi) کہتے ہیں۔ علوی عام طور پر ترک یا کرد زبان میں اپنی رسوم ادا کرتے ہیں جبکہ سنی مذہبی رسوم ادا کرنے کے لیے عربی کا سہارا لیتے ہیں۔ علویوں کی بہت سی رسوم میں موسیقی اور رقص کو بھی دخل ہے جسے وہ سماع کا نام دیتے ہیں۔ ترکی کی ۷ کروڑ کی آبادی میں علویوں کی تعداد ساٹھ لاکھ سے ڈیڑھ کروڑ کے درمیان ہے۔

ہم آہنگی کی طرف قدم

ترک معاشرے میں اب وقت کے ساتھ تبدیلی رونما ہو رہی ہے۔ سنی اور علوی ایک دوسرے کو ازدواجی معاملات میں بھی اپنا رہے ہیں۔ بین المسالک شادیاں عام ہو رہی ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے قبولیت بڑھ رہی ہے۔ اسی طور سنیوں اور کردوں میں بھی شادیوں کا تناسب بڑھ رہا ہے۔ بیشتر معاملات میں جوڑوں کے خاندان بھی شادی کو قبول کر رہے ہیں اور یوں معاشرے میں مثبت تبدیلیوں کی راہ ہموار ہو رہی ہے۔

غیر مسلم اقلیتوں کی حالت

اسلامی مسالک کے علاوہ ترکی میں مسیحی اور یہودی بھی رہتے ہیں۔ ماضی میں ایک موقع پر

مسیحیوں اور ترک مسلمانوں کے مابین شدید مسائل بھی رہے ہیں۔ ترکی پر الزام لگایا جاتا ہے کہ 1925ء میں سلطنت عثمانیہ نے آرمینیائی باشندوں کا قتل عام کیا تھا۔ ترکی کا دعوی ہے کہ اس حوالے سے مغربی ممالک اعداد و شمار کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ تاہم اب ترکی میں مذہبی اقلیتیں پر سکون زندگی گزار رہی ہیں۔ ملک میں مسیحی آبادی دو لاکھ سے ڈھائی لاکھ تک ہے۔ ایک صدی قبل آرمینیائی مسیحیوں کی تعداد بیس لاکھ تک تھی مگر اب گھٹ کر 60 ہزار ہو چکی ہے۔ ان کی زیادہ تر تعداد استنبول میں مقیم ہے۔

مسیحی آبادی ترکی کی موجودہ صورتحال سے خوش اور راضی ہے۔ ان کے خیال میں 2008ء کے بعد سے ترکی میں ان کے لیے بہتر اقدامات کیے گئے ہیں۔ اگرچہ موجودہ حکومت نے تعلیمی سطح پر مذہبی تشخص کے لیے اقدامات کیے ہیں لیکن اس ضمن میں مسیحی اور دیگر دینی اقلیتوں پر کوئی جبر نہیں ہے۔

حال ہی میں ترک صدر رجب طیب ایردوآن نے استنبول کے نواح میں ایک نئے چرچ کا سنگ بنیاد رکھا ہے۔ 1923 میں ترکی کے جدید ریاست بننے کے بعد وہاں پہلی مرتبہ ایک نیا چرچ تعمیر کیا جا رہا ہے۔

استنبول کے نواح میں واقع یشلکئے میں تعمیر کیے جانے والے اس چرچ سے شامی مسیحی کمیونٹی کے سترہ ہزار افراد استفادہ کر سکیں گے۔ یہ کمیونٹی اس چرچ کی تعمیر کے لیے رقم بھی فراہم کر رہی ہے۔ شامی مسیحیوں کی بڑی تعداد مشرقی مسیحی روایات کی ماننے والی ہے اور وہ آرامی زبان میں عبادت کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یسوع مسیح نے اسی زبان میں عبادت کی تاکید کی تھی۔

اس چرچ کی سنگ بنیاد رکھنے کی خصوصی تقریب سے خطاب میں ترک صدر ایردوآن نے کہا کہ جمہوریہ ترکی کا فرض ہے کہ شامی کمیونٹی کی مذہبی ضروریات کو پورا کرتے ہوئے انہیں ایک عبادت گاہ فراہم کی جائے۔ ایردوآن نے مزید کہا کہ یہ مسیحی لوگ اس علاقے کے قدیمی باسی ہیں۔

ترک صدر نے امید ظاہر کی ہے کہ شامی آرتھوڈکس سینٹ افرام چرچ نامی اس مسیحی عبادت گاہ کی تعمیر کا کام دو برسوں میں مکمل ہو جائے گا۔ سن دو ہزار نو میں جب ایردوآن وزیر اعظم تھے، تو انہوں نے استنبول کی انتظامیہ سے کہا تھا کہ وہ اس چرچ کی تعمیر کے لیے جگہ کا انتظام کرے۔ حالیہ برسوں میں

ترک حکومت نے کئی پرانے چرچوں کی تعمیر نو کی اور انہیں دوبارہ عوام کے لیے کھولا ہے۔

ماضی میں ترک سلطنت دنیا میں ایک ایسی جگہ رہی ہے کہ جب یہودیوں پر پوری دنیا میں دروازے تنگ تھے اور ان کے خلاف نفرت پائی جاتی تھی، تو ایسے وقت میں عثمانی سلطنت میں ان کے لیے امن و سکون میسر تھا، انہیں تجارت کی آزادی تھی اور عقائد کے لیے بھی رواداری کا مظاہرہ کیا جاتا تھا۔ ان کے الگ محلے بھی تھے اور چھاپہ خانے بھی جہاں وہ اپنی کتب شائع کر سکتے تھے۔ اِس وقت ترکی میں یہودی آبادی 15 ہزار سے 20 ہزار کے درمیان ہے۔ یہ زیادہ تر اسپین اور پرتگال سے آئے تھے۔ ن کی زیادہ تر آبادی استنبول اور ازمیر میں رہتی ہے۔ صرف استنبول میں ان کے 29 گرجا گھر ہیں جنہیں مکمل تحفظ اور آزادی حاصل ہے۔ ترکی یہودیوں کے اپنے الگ تعلیمی ادارے بھی قائم ہیں جہاں وہ اپنی اقدار کے مطابق تعلیم دے سکتے ہیں۔

مذہبی معاملات میں عدم مداخلت

ترک معاشرہ مختلف النوع رہا ہے۔ سنی یا علوی، ترک، کرد یا دیگر نسلوں کے افراد، مسلمان، غیر مسلم، دین پر کاربند یا سیکولر طرز زندگی کے حامل ترک شہری مختلف نظریات، فلسفوں اور اعتقادات کے حامل ہیں۔ اگرچہ ترکی میں اب اسلام سند جماعت اقتدار میں ہے لیکن وہ بھی سمجھتے ہیں کہ ایک ایسے معاشرے میں سب لوگوں کو ایک جیسا بنانے کی کوشش کرنا نہ صرف کارلا حاصل ہے بلکہ انسانیت کی توہین بھی ہے۔ ایسی آبادی کے لیے اشتراک عمل پر مبنی یا جمہوری طرز حکمرانی ہی واحد حل ہے جہاں کسی گروہ، اکثریت یا اقلیت کو دوسروں پر امتیاز حاصل نہ ہو۔

ریاست انسانوں کا قائم کردہ ایک ایسا نظام ہوتا ہے جس کا مقصد ان کے بنیادی حقوق اور آزادی کی حفاظت کرنا اور امن و انصاف کا قیام ہوتا ہے۔ ''ریاست'' بذاتِ خود ایک مقصد نہیں بلکہ ایک ذریعہ ہے جس کے ذریعے لوگ اس دنیا اور آخرت میں خوشیوں کا حصول کر سکتے ہیں۔ ریاست

کو اصولوں اور روایات سے ہم آہنگ کرنا ان کی پیروی کرنے والوں کی ہم آہنگی کے مترادف ہے جو سسٹم کی تشکیل انھیں اصولوں پر کرتے ہیں۔ اسی طرح چونکہ اسلام میں کوئی کلیسائیت جیسا نظام نہیں، اس لیے مذہبی جبر اسلامی روح کے خلاف ہے۔ اس طرح ریاست دراصل ایک ایسا معاہدہ ہے جو انسانوں کے درمیان، انسانوں ہی کی مدد سے کیا جاتا ہے اور یہ نہ تو اسلامی ہوتا ہے اور نہ ہی مذہبی۔

مذہب وریاست سے متعلق یہ خیالات صرف حکمران اشرافیہ ہی کے نہیں ہیں بلکہ یہ ترک عوام کے نظریات ہیں جو حکمرانوں کو بھی انہیں اصولوں پر کاربند رہنے پر مجبور کرتے ہیں۔

ملائیشیا: ایک کثیر المذاہب اور تنوع پسند سماج

رباب زینب

ملائیشیا، جنوب مشرقی ایشیا کا ایسا ملک ہے جو اپنے جغرافیائی مقام کی وجہ سے کافی پرامن رہا ہے اور اس کی پہچان ایک تجارتی ملک کی رہی ہے۔ یہ ایک وفاقی آئینی انتخابی بادشاہت ہے۔ یہ اگرچہ ایک مسلم ملک ہے لیکن چینی و بھارتی عنصر بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کے دیگر ثقافتی اثرات میں عربی، فارسی اور برطانوی ثقافتیں بھی شامل ہیں۔ ایک کثیرالمذاہب و متنوع النسل ملک ہونے کے باوجود یہاں ایک ایسا معاشرہ تشکیل پاچکا ہے جو ہم آہنگ اور روادار ہے۔ سرکاری مذہب اگرچہ اسلام ہے لیکن دیگر مذاہب کے لوگ بھی امن کے ساتھ رہتے ہیں اور انہیں بھرپور شہری حقوق دستیاب ہیں۔ اس خصوصیت کی وجہ سے ملائیشیا کو مذہبی آزادی کے لیے ایک مثال کے طور پہ پیش کیا جاتا ہے۔اس مضمون میں ملائیشیا کے اندرمذہبی آزادی کے منظرنامے کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ مضمون نگار ادارہ امن و تعلیم میں پراجیکٹ مینیجر کے طور پہ خدمات انجام دیتی ہیں۔

ایک کثیر القومی ملک

ملائشیا ایک کثیر القومی ملک ہے، مقامی ملایا افراد کی شرح 54 فیصد سے زیادہ نہیں ہے، 11 فیصد آبادی ملائشیا کے نواحات سے ہے جو خود کو ملائشیا کے ہی باشندے گردانتے ہیں لیکن ان کی اکثریت غیر مسلم ہے۔ تجارت پر زیادہ تر چینی قبائل کا قبضہ ہے جن کی شرح 24 فیصد تک ہے اور تامل نسل کے ہندوستانی بھی 7 فیصد تک اپنا وجود رکھتے ہیں۔ کل آبادی میں مسلمانوں کی شرح 62 فیصد تک ہے، 20 فیصد بدھ مت کے ماننے والے ہیں، 9 فیصد مسیحی برادی کے لوگ ہیں اور بمشکل 6 فیصد تک ہی ہندو یہاں پر بستے ہیں اور ایک بہت قلیل تعداد چینی مذاہب، تاؤازم، کنفیوشش اور اجداد پرستوں کی بھی ہے۔

مختلف ثقافتی تہوار

ہر مذہب کے لوگ اپنے اپنے مذاہب کے مقدس ایام اپنے طور پر مناتے ہیں تاہم قومی آزادی کا دن اور بادشاہ کی سالگرہ سمیت کچھ ایام مجموعی طور بھی منائے جاتے ہیں۔ ملکی قانون میں زیادہ تر برطانوی نظائر کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔

شرعی عدالتیں

ملک میں شرعی عدالتیں بھی ایک متوازی نظام کی حیثیت سے کام کر رہی ہیں جہاں فقہ شافعی کے مطابق فیصلے کیے جاتے ہیں اور مسلمانوں کے مقدمات انہیں شرعی عدالتوں میں ہی پیش ہوتے ہیں۔

ملائشیا کے اندر دوہرا قانونی نظام ہے جو شہری یا سیکولر عدالتوں، اور شریعت پر مشتمل ہے، شہری یا سیکولر عدالتیں انگلش کامن لاء پر مبنی ہیں۔ شریعت کا قانونی نظام حالانکہ اس سے پہلے کچھ حد تک غیر رسمی تھا اور شہری قانونی نظام کے ماتحت ہوا کرتا تھا، لیکن اب دونوں نظام ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ کام کرتے ہیں، کیونکہ حکومت نے ریاستی سطح کی شرعی عدالتوں کے نظام کو مسلسل بہتر و منظم کیا ہے۔ شرعی عدالتوں کی قانونی حدود میں صرف مسلمان اور ان کے خاندانی، آپسی اور مذہبی مسائل ہی آتے ہیں۔ جبکہ شہری قانون مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں پر الگ ہوتا ہے۔

آئین میں مذہبی آزادی

آئین ملائیشیا کو ایک سیکولر ملک بتاتا ہے اور مذہب کی آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔ تاہم ملائشیا کا آئین عبادات کی آزادی تو دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ تمام مالائی نسلی طور پر مسلمان ہیں اور شریعت کے تحت مسلمانوں کو مذہب تبدیل کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

ملائیشیا میں اسلام کی نمائندگی سنی الہیات کے شافعی مسلک سے ہوتی ہے۔ ملائیشیائی معاشرے میں اپنی اہمیت کی علامت کے لیے اسلام کو "سرکاری مذہب" کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔

رواداری پر مبنی تعلقات

ملائیشیائی چینی مختلف عقائد پر عمل کرتے ہیں۔ مسیحی آبادی زیادہ تر مشرقی حصے میں رہتی ہے اور یہ کسی ایک خاص گروہ یا نسل سے نہیں ہے۔ ملائیشیا میں مختلف مذہبی گروہوں کے مابین تعلقات عام طور پر کافی روادار ہوتے ہیں۔ عید، کرسمس، قمری سال اور دیپالی کو قومی تعطیلات قرار دیا گیا ہے۔

ملائیشیائی مالائی کے تمام لوگ قانون کے مطابق مسلمان ہیں۔ زیادہ تر ملائیشیائی چینی مہایانا بدھ مت یا چینی روایتی مذاہب کی پیروی کرتے ہیں (بشمول تاؤمت، کنفیوشس مت، اجداد پرستی یا نئے فرقے)۔ 2010ء کی مردم شماری کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ملائیشیا کی چینی نسل کا 83.6 فیصد بدھ کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔

اگرچہ ملک میں اکثریتی نسلی گروہ ملئی ہے، جسے بومی پترا (یعنی 'مقامی زمین کا بیٹا') بھی کہا جاتا ہے، اس کے علاوہ آبادی کا تقریباً 25 فیصد چینی نسل کا ہے، جبکہ باقی انڈین ملائیشین، زیادہ تر ساؤتھ انڈین ریاست تامل ناڈو سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ آبادی آٹھ فیصد بنتے ہیں۔

ملایا سیاست میں ہم آہنگی کا فروغ

ملائیشیا کے سیاست دانوں کی طرف سے مذہبی ہم آہنگی کو ترجیحی عمل کے طور پر دکھانے اور مختلف گروہوں کے مابین مذہبی افہام و تفہیم کے فروغ کے لیے مختلف شعبے تشکیل دیے گئے ہیں۔

اپنے ہمسایہ ممالک تجارت کے لیے مشہور سنگاپور اور سیاحوں کی جنت تھائی لینڈ کی چکاچوند ملائشیا پر غالب رہتی ہے لیکن ملائشیا اس خطے کا سب سے دوستانہ اور روادار ملک ہے جہاں اس کی تین بڑی نسلی برادریاں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر زیادہ تر ایک ہم آہنگ ماحول تشکیل دیتی ہیں۔

'محبہ' (یعنی محبت و خیر خواہی) کا اصول

ابھی حال ہی میں اس ملک میں نو واردوں کے لیے نسل پرستی کے واقعات کا سلسلہ شروع ہوا ہے، لیکن اس طرح کے معاملات اب بھی نسبتاً بہت کم ہیں۔ جو چیز اُنھیں ایک دوسرے سے جوڑے رکھتی ہے وہ صرف اپنے ملک سے مشترکہ پیار ہی نہیں ہے بلکہ ایک معاشرتی طور پر 'محبہ' کا ایک جذبہ ہے۔

محبہ کے معنی ہیں محبت یا خیر خواہی۔ ملائیشیا میں اس کی اور بھی بہت زیادہ اہمیت ہے۔ عالم دین اور دینی علوم کی پروفیسر ڈاکٹر قمر اونیاہ قمرالزمان کے مطابق، ملائشیا میں محبہ یکجہتی، مفاہمت، نگہداشت، ہمدردی اور برادرانہ جذبات کا نام ہے۔

جب ملائیشیا نے 1957 میں برطانیہ سے آزادی حاصل کی تو اس کے رہنماؤں نے محبہ کو اس نئے ملک کی یکجہتی کی روح کے طور پر اپنانے کا فیصلہ کیا تاکہ اس بات کو یقینی بنایا جاسکے کہ مختلف نسلی اور مذہبی گروہوں کے درمیان کوئی تناؤ پیدا نہ ہو۔

مثال کے طور پر یہ ملک سرکاری طور پر ایک اسلامی ریاست ہے، لیکن ہر کسی کو اپنے مذہبی عقائد کی پیروی کرنے اور اپنی زبانیں بولنے کا آزادانہ حق ہے۔ اب بھی مقامی اخبارات کے مضامین میں سیاست دان اس لفظ کو پرامن بقائے باہمی کے ساتھ جاری رکھنے کی یاد دہانی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

ملائیشیا کے محبہ کا مطلب یہ بھی ہے کہ اس ملک کے تہواروں کا کیلنڈر سال بھر پر محیط ہوتا ہے، جس کا آغاز چینی قمری سال کے ساتھ ہی ہوتا ہے۔ درمیان میں 'ہری رایا یا عید الفطر بھی اسی کیلینڈر میں کچھ دیر بعد آتی ہے، اور دیپاولی (دیوالی کا دوسرا نام، روشنی کا تہوار) بعد کے مہینوں میں آتا ہے۔ کرسمس کے لیے بھی اس کیلنڈر میں گنجائش موجود ہے جس میں مرکزی گلیوں اور شاپنگ مالز میں یکساں طور پر جعلی برف سے سجاوٹ کی جاتی ہے۔

ثقافتوں کا احترام

ملائیشیا ایک ایسا ملک ہے جہاں تمام مذاہب کے لوگ مل کر رہتے ہیں اور ایک دوسرے کی ثقافت کا احترام کرتے ہیں۔ حال ہی میں ملائیشیا میں ایسی پہلی ایئر لائن شروع کی گئی جس کے تمام اصول و ضوابط اسلامی شرعی قوانین کے مطابق ہیں۔ اس ایئر لائن کی بنیاد ایک ہندو جوڑے روی الگیندرن اور کارتھیانی گووندن نے رکھی ہے۔ ران ایئر لائن میں تمام مذاہب، ملیشیائی، بھارتی، چینی اور ہر نسل کے لوگ ہیں۔ برونائی، سعودی عرب اور ایران میں بھی شرعی قوانین پر عمل کرنے والی ایئر لائن ہیں، لیکن ران ایئر ملائیشیا کی ایسی پہلی ایئر لائن ہے جس نے اپنے آپ کو شرعی ایئر لائن کے طور پر متعارف کروایا ہے۔ رایانی ایئر میں فضائی میزبان وندر سنگھ کا تعلق بھارتی پنجاب سے ہے۔ وہ اپنا تجربہ بتاتے ہیں 'یہاں کام کرنے کا تجربہ بہت اچھا ہے۔ ہم ایک ساتھ کام کرتے ہیں۔ مسلمان ٹیک آف سے پہلے اور لینڈ نگ کے بعد دعا کرتے ہیں۔ ہم اس وقت خاموش بیٹھے رہتے ہیں'۔

ہم آہنگی سے متعلق مسائل کی جہت

مذہبی رواداری ملائیشیا کا ایک عمومی اور مجموعی چہرہ ہے۔ تاہم اس حوالے سے کچھ مفکرین یہ بھی کہتے ہیں کہ اب اس رجحان میں قدرے تبدیلی آرہی ہے۔ چند برسوں کے دوران کچھ ایسے اقدامات کیے گئے ہیں جن سے ملائیشیا کے سیکولر سمجھے جانے والے معاشرے میں مذہبی عدم رواداری کو ابھرنے کا موقع ملا ہے۔ ملائیشیا میں مسلمان اور مسیحی رب العالمین کے اسم ذات اللہ کو مشترکہ طور پر استعمال کرتے تھے مگر اب یہ لفظ مسلمانوں کے لیے مختص کر دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی چارلس ڈارون کی کتاب ''اصل الانواع'' کی اشاعت اور فروخت پر بھی پابندی عائد کر دی گئی ہے۔ اسلام دوست سمجھے جانے والے مغربی مفکرین جان ایسپزیٹو اور کیرن آرم اسٹرانگ کی کتب پر بھی پابندی عائد کی جاچکی ہے۔ یہ سب کیوں ہو رہا ہے، یہ سمجھنا کچھ زیادہ دشوار نہیں۔ نوآبادیاتی دور میں ملائیشیا کی اصل آبادی (یعنی مالے نسل کے لوگ) کو کچل کر رکھا گیا تھا۔ ان کے بہت سے حقوق پر ڈاکا ڈالا گیا۔ آزادی کے بعد انہیں کھل کر پنپنے کا موقع ملا ہے اور بیشتر سیاسی، معاشی اور معاشرتی معاملات میں ان سے

واضح ترجیحی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ یونائٹیڈ مالیز نیشنل آرگنائزیشن بھی کچھ اِسی طرز کی باتیں کر کے اپنی بات آگے بڑھاتی ہے۔ اکثریت پر مبنی مالے نسل یہ سمجھتی ہے کہ اس کے تمام حقوق کی پاسداری اسی وقت ممکن ہے جب یو ایم این او کو اقتدار میسر ہو۔

اگرچہ زیادہ تر نسلی گروہ ہم آہنگی کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں تاہم ناقدین کا کہنا ہے کہ کئی دہائیوں سے مالے مسلمانوں کے حق میں پالیسیوں نے اس ہم آہنگی کو نقصان پہنچایا ہے۔

اہل تشیع کے لیے مشکلات

ملائیشیا میں بین المسالک سطح پر اہل تشیع کے لیے جگہ کافی تنگ ہے اور ان پر پابندیاں بھی عائد ہیں۔ ملائیشیا کی نیشنل فتویٰ کونسل نے 1984ء میں فقہ جعفریہ اور فقہ زیدیہ کو ملائیشیا میں رسمی طور پر تسلیم نہ کرنے کا اعلان کیا۔ تاہم ملائشیا کے اندر شیعہ مخالف رسالے اور مضامین 1990ء میں چھپنا شروع ہوئے۔ ان میں سب سے اہم وہ مضمون ہے جو اسلامک انٹر نیشنل یونیورسٹی اسلام آباد سے فارغ التحصیل ہو کر ملائشیا جانے والے محمد اثری یوسف نے لکھا۔ یہ مقالہ 1992ء میں نیشنل یونیورسٹی آف ملائشیا میں منعقد ہونے والے ایک سیمینار میں پڑھا گیا۔ بعد میں یہ مضمون ''اثنا عشری شیعہ بطور پانچواں فقہی مسلک'' کے عنوان سے شائع ہونے والے مجموعے کا حصہ بنا۔

ملائیشیا کی نیشنل فتوی کونسل نے 1996ء میں ''ملائشیا میں شیعیت'' کے عنوان سے ایک کانفرنس کا انعقاد کیا جس کے بعد ایک فتویٰ جاری کیا گیا کہ جس میں 1984ء کے اعلان کے مطابق جعفری اور زیدی فقہ کو سرکاری طور پر تسلیم نہ کرنے کا اعادہ کیا گیا۔ دوم یہ کہ ملک کے مسلمان شہری عقائد، فقہی مسائل اور اخلاقیات میں صرف مسلکِ اہلسنت والجماعت کی پیروی کر سکتے ہیں۔ اس فیصلے کو آئین کا حصہ بنانے اور تمام وفاقی وصوبائی قوانین کو اسکے مطابق بدلنے کا اعلان کیا گیا۔ سوم یہ کہ اہل سنت والجماعت کے مسلک کے علاوہ کسی اور مسلک کی تعلیمات کا پرچار غیر قانونی قرار دیا گیا۔ ملائشیا میں فتوی دینے کا اختیار صرف اس سرکاری ادارے کو حاصل ہے اور ان مفتیوں کا دیا گیا فتویٰ قانون کا حصہ بن جاتا ہے اور اس کی مخالفت پر تین سال قید یا جرمانے کی سزا ہو سکتی ہے۔

تبدیلیِ مذہب پر قدغن

ملائشیا کے آئین میں مذہب کی آزادی کے بارے میں عمومی تشریح یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنے مذہب پر آزادی سے عمل کرنے کا حق ہے۔ البتہ یہ آزادی کسی شخص کو اپنا مذہب تبدیل کرنے کا حق نہیں دیتی۔ اگر کوئی شخص اسلام کو چھوڑنا بھی چاہے تو اس کے لیے 30 مئی 2007 کو وفاقی عدالت نے فیصلہ دیا تھا کہ مسلمان افراد کو شرعی عدالت سے ایک حکم نامہ حاصل کرنا ہوگا جس میں کہا گیا ہے کہ وہ 'مرتد' ہو چکے ہیں (انہوں نے اسلام چھوڑ دیا ہے) اس سے پہلے کہ وہ اپنا قومی شناختی کارڈ تبدیل کر سکیں۔ مگر اس عمل کی عدالتی سزا بھی ہے جو دی جاتی ہے۔

برصغیر میں مذہبی آزادی کی
بنیادیں اور مسائل

برصغیر میں ہندو مسلم تاریخی تعلقات

شفیق منصور

برصغیر ایک ایسا خطہ تھا جو کہ مختلف مذاہب کی آماجگاہ کے طور پر جانا جاتا تھا۔ برصغیر کی سرزمین اس بات کی گواہ ہے کہ اس میں بہت سے مذاہب پیدا ہوئے اور کئی سے مذاہب نے ایک عہد کے بعد اپنا وجود کھو دیا۔ برصغیر میں بسنے والی اقوام میں سے مسیحی، ہندو، سکھ اور مسلمان بڑی اقوام گردانی جاتی تھیں۔ یہ اقوام تہذیبی، لسانی، معاشرتی، تاریخی اور مذہبی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں بلکہ متضاد بھی تھیں۔ اس خطے میں ایک طویل عرصے تک مسلمان حاکم بھی رہے۔اس دوران مختلف اوقات میں تنازعات نے بھی سراٹھایا اور چھوٹی جنگیں بھی ہوتی رہیں، لیکن زیادہ تر یہ عرصہ بڑے بحرانوں سے محفوظ رہا۔تاہم استعمار کی آمد کے بعد ہندومسلم تعلقات میں ایک نیا دور آگیا جو تقسیم پر منتج ہوا۔اِس مضمون میں برصغیر کے اندر ہندومسلم تعلقات کی تاریخی صورتحال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی، تہذیبی اور سیاسی کشمکش:

کسی بھی ملک و معاشرہ کی تاریخ عقیدہ و فکر سے الگ کوئی چیز نہیں بلکہ عقیدہ و فکر کے عمل و اثر ہی سے تاریخ و تہذیب وجود میں آتی ہے۔ برصغیر میں بسنے والی مختلف اقوام کے جب ہم معاشرتی روابط پر غور کرتے ہیں تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ جو چیز ان معاشرتی روابط پر سب سے زیادہ اثرانداز ہوتی نظر آتی ہے وہ مذہب ہے۔ان کے درمیان جو بھی کشمکش پائی جاتی تھی اس کی بنیاد عقیدہ و فکر کا اختلاف تھا اس لئے برصغیر میں بین المذاہب مکالمہ (Interfaith Dialogue) ہمیشہ جاری رہا۔اسی وجہ سے بعض محققین نے انیسویں صدی کو برصغیر کے حوالے سے مناظرے کی صدی قرار

دیا ہے۔[1] اگرچہ مناظراتی ادب جو انیسویں صدی میں ولی الٰہی اور وہابی تحریکوں میں اپنے عروج کو پہنچا،اس سے بہت پہلے معرض وجود میں آ چکا تھا۔[2]

برصغیر میں بسنے والی مختلف اقوام میں سے ہندو اور مسلم دو ایسی قومیں تھیں جن کا ایک دوسرے کے ساتھ صدیوں پرانا تعلق تھا۔ مسلمانوں نے خلافت کی توسیع کے دوران ہی سرزمین ہند پر پہلی مرتبہ قدم رکھا اور 712ء میں محمد بن قاسم نے ایک منظم مہم کے ذریعے سندھ فتح کیا اور اسے اموی خلافت میں شامل کر دیا۔

برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں میں مذہبی و سیاسی کشمکش ہمیشہ جاری رہی جو تاریخ کے مختلف ادوار میں کم یا زیادہ ہوتی رہی لیکن کسی نہ کسی صورت میں بہر حال قائم رہی اور بعد کے ادوار میں سکھ بھی اس میں شامل ہو گئے۔ ہندو مسلم مذاہب اور ثقافتیں تقریباً ایک ہزار سال تک ساتھ ساتھ قائم رہیں اس میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہیں لیکن جذب و منافرت کا عمل بھی بیک وقت جاری رہا۔ چنانچہ انیسویں صدی میں انگریز کی غلامی اور جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد حالات نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیبی کشمکش سیاسی کشمکش کی صورت اختیار کر گئی۔ پروفیسر عزیز احمد اس صورت حال کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"ہندو مسلم مناقشے کا ہنگامہ پرور نمونہ، جو مغلوں کے دور زوال میں شروع ہوا تھا۔ برصغیر پر برطانیہ کے پورے تسلط کے بعد ایک نئی صورت اختیار کر گیا۔ جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس کی وجہ سے دونوں قوموں کو جو مسائل در پیش ہوئے ان سے تنازعات کی نئی پیچیدہ صورتیں پیدا ہو گئیں۔ کیونکہ دونوں قوموں کو نئی حکمران طاقت کے ساتھ نہ صرف سمجھوتا کرنا تھا بلکہ ان کی زبان، اقدار اور تہذیب کو بھی سمجھنا تھا۔ اس صورتحال نے ہندو مسلم مناقشے کو پہلے باہمی اقتصادی مقابلے

---

[1] امرتسری، ثناءاللہ، مولانا، حق پرکاش بجواب ستیارتھ پرکاش، نعمانی کتب خانہ لاہور۔ 2001 "سخنے چند"، از عبدالجبار شاکر، ص:8

[2]Aziz Ahmad, studies in Islamic culture in the Indian environment, Oxford 1964- P:85.

اور بعد میں غیر ملکی حکومت کے تحت سیاسی ترقی کی جدوجہد میں تبدیل کردیا"۔[3]

بعض سیاست دانوں اور مذہبی رہنماؤں کا منفی رویہ

بدلتی ہوئی سیاسی صورتحال کے پیش نظر سیاست دانوں نے مذاہب کو اپنے ذاتی مقاصد کے لئے استعمال کرنا شروع کردیا ان حالات میں دونوں اطراف کے مذہبی رہنماؤں نے مثبت رویہ اختیار کرنے کی بجائے منفی رویہ اختیار کیا اور عدم رواداری، فرقہ واریت، تعصب اور تنگ نظری کو بڑھانے میں جلتی پر تیل کا کام کیا اور ایک دوسرے کے خلاف زہر اگلتی تحریروں اور تقریروں سے کام لیا اور مناظرانہ نوع کی کتب کے ذریعہ ایک دوسرے کی مذہبی شخصیات، مذہبی کتب اور مذہبی شعائر پر تندوتیز حملے کیے۔ یہ وہ نقطہ تھا جہاں سے سنگھٹن اور شدھی کی تحریک چلی اور اس کے داعی اور مبلغ پورے ملک میں پھیل گئے۔ اسی کے مقابل تبلیغ اسلام کا محاذ قائم ہوا اور تنظیم کی تحریک شروع ہوئی۔ مذہبی مناظروں، تقریروں اور جلسوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو گیا اور اس کے نتیجے میں برصغیر میں فسادات کی ایک آندھی چلی اور پورا ملک اس کی لپیٹ میں آگیا۔[4]

ان حالات کے پیش نظر چند اہل بصیرت افراد آگے بڑھے اور انہوں نے برصغیر کے معروضی حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی تحریر کے ذریعہ دونوں اقوام کے درمیان ہم آہنگی اور تعاون پیدا کرنے کی کوشش کی اور ایک دوسرے کے مذہب اور مذہبی شخصیات کے بارے میں لکھ کر ایک دوسرے کو قریب لانے کی کوشش کی۔

مثبت محرکات

ہندوؤں اور سکھوں کی جو کتب آپ ﷺ اور اسلام کے متعلق ملتی ہیں ان میں سے بیشتر کتب ایسی ہیں جو انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں لکھی گئیں۔ اور یہ وہ

---

[3] Aziz Ahmad, Studies in Islamic culture in the Indian environment. P:263.

[4] ندوی، ابوالحسن علی، ہندوستانی مسلمان، مجلس نشریات اسلام کراچی (س-ن) ص:176

حالات تھے جن میں بر صغیر سیاسی اور مذہبی طور پر بڑی گھمبیر صورت حال سے دو چار تھا۔ ایسے حالات میں اسلام اور آپ ﷺ کی ذات کو موضوع بحث بنانا اپنے پیچھے کئی مقاصد لئے ہوئے تھا لہذا یہاں پر ان کی نشاندہی کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ وہ کیا محرکات تھے جن کے زیر اثر برصغیر کے ہندوؤں اور سکھوں نے سیرت لٹریچر لکھنے کی ضرورت محسوس کی جو مثبت کتب آپ ﷺ سے متعلق ملتی ہیں ان میں مندرجہ ذیل مثبت محرکات کی واضح جھلک نظر آتی ہے:

1– حضور ﷺ کی حیات طیبہ کی کشش۔

2– صداقت کا اظہار۔

3– وحدت ادیان کا تصور۔

4– رواداری کا فروغ۔

5– ہندو مسلم اتحاد۔

6- ہندوؤں کی مذہبی کتب میں آپ ﷺ سے متعلق بشارتیں۔

7– حضور ﷺ کی ذات سے منسرب من گھڑت کہانیوں کی تردید۔

8– مسلمانوں کو اپنے پیغمبر کا اسوہ حسنہ اپنانے کی تلقین۔

9– مذہب کے نام پر سیاست دانوں کے استحصال سے بچنے کی تلقین۔

10– قلبی لحاظ سے مسلمان ہوتے ہوئے اسلام کا اخفاء۔

11– حضور ﷺ کی آمد اور عالم انسانیت پر اس کے اثرات کا جائزہ۔

12– مطالعہ تقابل ادیان۔

رواداری کا فروغ:

باہمی رواداری کا فروغ برصغیر کے معروضی حالات کے پیش نظر ایک بڑی اہم ضرورت تھی اسی ضرورت کے تحت لیڈران قوم اور محب وطن اصحاب نے اس جانب توجہ کی اور وہ طریق واسلوب اختیار کیے جس سے باہمی رواداری کو فروغ حاصل ہو۔ اس سلسلے میں جہاں ایک طرف آفتاب عالم سر

پی سی رائے اور لیلائے علم وبلبل سخن مسز سروجنی نائیڈو[5] جیسی ہستیوں نے اسلام اور آپ ﷺ کی خوبیوں کا اعتراف کیا تو دوسری طرف مولانا ابوالکلام آزاد[6] نے گیتا کے مطالعہ کو جیل میں اپنی راحت وتسکین قرار دیا اس کے علاوہ خواجہ کمال الدین مشہور مشنری مبلغ اسلام نے ''کرشن اوتار'' اور خواجہ حسن نظامی[7] نے ''کرشن بیتی'' جیسی کتابیں لکھ کر اس رواداری کی باہمی کوشش کو مزید تقویت بخشی۔[8] کرشن اوتار (1951) از ایم ایس جوہر، کرشن اوتار (1929) از ساحل بلگرامی، کرشن جیون (1923) از خواجہ حسن نظامی، کرشن کتھا (1941) از حسن نظامی جیسی کتابیں بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔

باہمی رواداری کے فروغ میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ ہندو اور مسلمان ہندوستان کی دو بڑی قومیں ہیں۔ ان کا مدتوں سے چولی دامن کا ساتھ ہے دونوں ایک آسمان تلے پلے ہیں دونوں کو چاہیے کہ ایک دوسرے کی عزت کریں ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوں۔ ایک دوسرے کے تہواروں میں شرکت کریں اور ایک دوسرے کے مذہبی شعائر اور عقائد کا احترام کرکے باہمی رواداری کا ثبوت دیں۔ چرن سرن ناز مانکپوری اپنی منظوم سیرت کی وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میرے والد صاحب مذہبی اور صوفی منش تھے۔ میری والدہ مذہبی رواداری اور بے تعصبی میں میرے والد صاحب سے بھی آگے تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا مذہبی رواداری کو صرف اپنائے ہی نہیں بلکہ اس سے بالاتر ہو کر ایک ایسے دین کی ابتداء کرے جس میں انسان سب برابر

---

5 سروجنی نائیڈو، (1879-1949ء) ہندوستان کی سیاسی رہنما اور شاعرہ تھیں۔ بہت اچھی مقرر بھی تھیں۔ ملاحظہ کریں: شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا۔ ص:352

6 ابوالکلام آزاد (1888—1958ء) عالم دین، شاعر، انشاپرواز اور سیاست دان تھے ترجمان القرآن ان کی مشہور تصنیف ہے۔ اسلامی انسائیکلوپیڈیا۔ ص:42

7 خواجہ حسن نظامی، (1878 — 1957ء) نے جامعہ ازہر سے تعلیم حاصل کی۔ مذہبی رواداری کے حامی تھے۔ شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا۔241

8 نظامی، محمد اسماعیل خان، مقام محمود المعروف بہ اسلام غیر مسلموں کی نظر میں، مسلم لٹریچر کمیٹی مزنگ روڈ لاہور۔1973۔ ص5

ہوں۔ چنانچہ ان دونوں کی تربیت سے میں نے دنیا کی قریب قریب چوبیس کتابیں پڑھ ڈالیں اور آخر میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تصور خدا میں اختلاف ہونے کے باوجود مذہب میں اقدار زندگی یکساں ہیں۔ جنہیں مذہبی رواداری کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے"۔[9]

وی پی شیوم اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی رواداری کے متعلق اپنے ایک اخباری بیان میں کہتے ہیں:

"اسلام نے دوسرے مذہبوں کے ساتھ بہتر رواداری برتنے کی تعلیم دی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اتفاق و امن قائم رکھنے کی زبردست تعلیم و تلقین کی ہے۔ اور ہر ایک مذہب والے کو نہ صرف اپنے مذہب کی آزادانہ پرستش کی اجازت دی بلکہ ان کو سیاسی مراعات اور ذمہ داریاں عطا فرمائیں"۔[10]

برصغیر کی مخلوط معاشرت سیاسی اور سماجی طور پر بہت مسائل کا شکار تھی اس ماحول میں جہاں ایک طرف گائے کو ذبح کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کی جاتی تھی تو دوسری طرف گائے کو مقدس مان کر اس سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ ایک دوسرے کی مذہبی عبادتگاہوں میں قدم رکھنا تو کجا ان کے قریب سے گزرنا بھی محال تھا۔ "ہندو پانی" اور "مسلم پانی" کی اصطلاحات عام استعمال ہوتی تھیں ایسے ماحول میں ہندو اور سکھ سیرت نگاروں کی طرف سے کوشش کی گئی کہ مسلمانوں کے نبی کا غیر مسلموں سے رویہ اور غیر مسلموں سے متعلق تعلیمات پیش کر کے لوگوں میں باہمی رواداری پیدا کی جائے اور انہیں ان تعلیمات کے ذریعہ ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا سبق سکھایا جائے۔ بابو کنج لال دلوالی نبی کریم ﷺ کی اس رواداری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آپ ﷺ نے غیر مذہب والوں کو خود اپنی مسجد میں قیام کرنے کے لئے فرمایا اور خاص

---

9 مانکپوری، رہبر اعظم۔ ص9

10 اخبار ہمدم لکھنؤ 8 مئی 1924۔ بحوالہ شاہان اسلام کی رواداریاں اور ہندو مصنفین، ملک فضل حسین، انجمن ترقی قادیان ضلع گورداسپور۔1939، ص10

مسجد نبویؐ میں ان کو اجازت دی کہ وہ لوگ اپنی مذہبی رسمیں بے تکلف اپنے طریقہ کار پر ادا کریں۔ ذرا ذرا سی بات پر کفر کا فتوی دینے والے مولانا صاحبان۔ خود حضور ﷺ نے عین مسجد نبویؐ میں کافروں کو کافرانہ طریقہ پر عبادت کرنے کی اجازت دی تھی۔ اسلام کتنا وسیع الاخلاق اور کیسا عالم پسند طریقہ تھا۔ اور آج کیا بن گیا ہے بہت سے واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ غیر مذہب والے صرف آپ کا وسیع اخلاق دیکھ کر گرویدہ ہوئے اور اسلام لائے"۔[11]

اسلام کی رواداری کی تاریخ سے انکار ممکن نہیں مسلم فاتحین نے مفتوحہ سندھ میں ایک ایسا نظام رائج کیا جو مقامی باشندوں کے لئے پرانے نظام کے مقابلے میں زیادہ منصفانہ اور ترقی پسندانہ تھا ۔لوگوں کو جابر حکمرانوں سے نجات مل گئی۔ ان کو مذہبی آزادی دی گئی عبادت گاہوں اور مقدس مقامات کو تحفظ دیا گیا۔ اسی پالیسی کو بعد میں برصغیر کے صوفیاء نے بھی اپنایا اور اسی پالیسی کی وجہ سے بہت سے ہندو تیزی سے اسلام کی طرف راغب ہونے لگے۔ برصغیر کے خاص حالات کے پیش نظر مسلمانوں کی اس رواداری کی تاریخ نے بھی ہندوؤں کو ایسا کرنے پر مجبور کیا۔

---

11 دلوالی، بابو گنج لال، حضرت محمد ﷺ اور اسلام، جید برقی پریس بلیماراں دہلی، 27

بھارت میں مسلم اقلیت کی صورتحال: آئینی اور انتظامی ڈھانچے کا تجزیہ

ڈاکٹر ایم کے صدیقی، پروفیسر اقبال انصاری

بھارت کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہا جاتا ہے۔1976ء میں ایک آئینی ترمیم کے بعد یہ ایک سیکولر ریاست ہے اور اس کے تحت یہ عہد کیا گیا ہے کہ اس ملک میں بسنے والی تمام قوموں اور ادیان کے ساتھ مساوی سلوک کیا جائے گا۔ لیکن ایک عرصے سے اس میں موجود مذہبی اقلیتوں کو شدید مسائل کا سامنا ہے۔ بالخصوص مسلمان اقلیت کے لیے پچھلی دو دہائیوں سے مشکلات میں اضافہ ہوا ہے۔ ریاستی سطح پہ کئی ایسے قوانین بھی بنانے کی کوشش کی گئی جس کا مقصد مسلمان اقلیت کو نشانہ بنانا تھا۔ اکثریت کی طرف سے یہ سخت گیر رویہ مسلمانوں کے مستقبل کو مزید مخدوش بناتا جارہا ہے اور ان کے بنیادی حقوق سلب کیے جارہے ہیں۔ بھارت میں مسلمانوں کو کن مسائل کا سامنا ہے اور انہیں کس طرح نچلے درجے میں دھکیلا جارہا ہے، زیرنظر مضمون میں اسی پر گفتگو کی گئی ہے۔دونوں مضمون نگار دہلی میں مقیم ہیں۔ سماجی کارکن اور دانشور ہیں۔

مسلمان سب سے پیچھے

بھارت کو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہا جاتا ہے اور اس کا دستوری تشخص بھی سیکولر کا ہے۔ وہاں بہت سی مذہبی اقلیتیں بستی ہیں۔ تاریخی طور پہ ماضی میں اقلیتوں کی صورتحال قدرے بہتر رہی ہے۔ لیکن گزشتہ دو دہائیوں سے وہاں سخت گیر عناصر اوپر آگئے ہیں جس کی وجہ سے اقلیتوں کے لیے مسائل پیدا ہورہے ہیں۔ بالخصوص مسلمان اقلیت کو بہت زیادہ مسائل کا سامنا ہے۔ عمومی طور پہ بھارت میں حکومتی اشرافیہ اقلیتوں کے تحفظ کی بات کرتی ہے، تاہم اقلیتوں کے بارے میں غالب طبقہ کے کیا عزائم ہیں انہیں واضح نہیں کیا جاتا، نہ سیاسی پالیسی کے طور پر انہیں بیان کیا جاتا ہے بلکہ خفیہ طور پر ریاستی اداروں کے ذریعہ انہیں اس انداز سے بروئے کار لایا جاتا ہے کہ وہ مقاصد خود بخود حاصل ہو جائیں۔ دستور میں قابل قدر دفعات موجود ہونے کے باوجود ریاستی مشینری اس انداز سے کام کرتی ہے کہ جس سے غالب اور اقلیت کے منقسم تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔ صورتحال پر ایک

سرسری نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ:

1– جیلوں میں مسلمان قیدیوں کی تعداد ملک میں ان کی آبادی کے تناسب سے کہیں زیادہ ہے جبکہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی سے تناسب کے لحاظ سے بہت کم ہے۔

2– دوسرے فرقوں کے مقابلے میں غربت کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہے۔

3– مسلمانوں کا پیشہ ورانہ ڈھانچہ اکثریتی طبقہ کے مقابلے میں مختلف ہے۔اس کے متعدد اسباب ہیں جن میں سرکاری سرپرستی کی کمی یا محرومی بھی شامل ہے۔دوسرے طبقات کے مقابلہ میں مسلمانوں میں دستکاریعنی خود اپنا کام کرنے والوں کا تناسب زیادہ ہے۔یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ مسلمانوں کو روزی روٹی کے مواقع فراہم کرنے میں ان کی مدد کی بجائے ریاست ان کی حریف بن جاتی ہے۔

4– تعلیمی اعتبار سے مسلمان دیگر غیر مسلم طبقات سے بہت پیچھے ہیں۔اعلی اور تکنیکی تعلیم میں مسلمان مرد اور خواتین کا تناسب بالکل غیر اہم ہے۔اس صورتحال سے نکلنے کے لئے وہ جو کچھ کرتے ہیں وہ بہت کم ہوتا ہے۔ تعلیمی اعتبار سے مسلمانوں کی اس پسماندگی کا سبب ان کے پاس وسائل کا نہ ہونا ہے۔اس مقصد کے لیے ان کے جو اوقاف ہیں، حکومت ان اوقاف کو ڈھنگ سے استعمال کرنے کے لیے کوئی اقدام نہیں کرتی۔بلکہ حکومت ان کے وسائل کو برباد کرانے اور خیانت وغبن وغیرہ کے ذریعہ بے اثر کر دیتی ہے۔ یہ بات دلچسپ ہے کہ مسلمانوں کو ان کے روزگار کی فراہمی میں مدد دینے کی بجائے ریاست ان کی حریف بن کر انہیں اقتصادی میدان سے خارج کرنے کا کام کرتی ہے۔

5– لا اینڈ آرڈر مشینری (انتظامیہ) اکثر مسلم نوجوانوں کی تاک میں رہتی ہے۔فرضی اور ناجائز طور پر انہیں پھنسایا جاتا ہے، انہیں بے پناہ اذیتیں پہنچائی جاتی ہیں، فرضی Encounter کا شکار بنایا جاتا ہے اور ان کی خواتین کو بھی بخشا نہیں جاتا ہے۔

6– ملک کے مختلف حصوں میں اکثر وبیشتر وسیع پیمانے پر تشدد بھڑک اٹھتا ہے۔آزادی کے بعد

سے اب تک مہاراشٹرا، اترپردیش، بہار وغیرہ میں تشدد کے ایسے ہزاروں واقعات پیش آئے ہیں جن میں ریاست کا ہاتھ بھی دیکھا گیا۔ خطاکار پولیس افسران کو مشکل سے ہی سزا ملتی ہے، بلکہ وہ ترقی سے فیض یاب ہوتے رہتے ہیں، متعلقہ مجرموں کو عبرت ناک سزائیں کبھی کبھار ہی دی جاتی ہیں۔

7– مسلمانوں کے خلاف ہونے والی تشدد کے انکوائری کمیشنوں کی رپورٹیں انتہائی تاخیر سے پیش کی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر بابری مسجد انہدام کی رپورٹ۔ اس سے مسلم اقلیت کے بارے میں انتظامیہ کے رویہ کا پتا چلتا ہے کہ تاخیر کا مطلب ہوتا ہے انصاف سے محروم کردینا۔

8- مسلم پرسنل لا میں اصلاح کے نام پر بار بار مداخلت سے مسلمان حیرت زدہ ہیں۔ کیونکہ یہ اقدامات تکثیری معاشرہ کی روایات کے خلاف ہیں۔ اس سے ملک کے دستور کی روح بھی مجروح ہوتی ہے۔

9– مسلمانوں میں تعدد ازدواج اور کثرت اولاد کے بارے میں مفروضہ اعداد و شمار کو لے کر بہت شور مچایا جاتا ہے۔ مسلمانوں کی آبادی میں تیزی سے اضافہ اور ہندو آبادی سے بھی زیادہ آبادی ہو جانے کے مفروضے سے اکثریت خطرہ محسوس کرتی ہے اوران کے دلوں میں منفی جذبات پرورش پاتے رہتے ہیں۔ اس حقیقت سے صرف نظر کیا جاتا ہے کہ ہندوؤں کی آبادی میں اضافہ کا تناسب مسلمانوں کی مجموعی آبادی سے بھی زیادہ ہے۔

دستوری حقوق

آزادی کے بعد ہندوستان کا ایک ایسا دستور مرتب کیا گیا جس میں بنیادی طور پر اس ملک کو سیکولر قرار دیا گیا اور یہ سیکولرازم دستور کا ایک ایسا اصولی اور اساسی حصہ قرار پایا جس کو کبھی بدلا نہیں جاسکتا۔ دستور کے ابتدائیہ میں یہ کہا گیا ہے:

"ہم ہندوستان کے عوام ہندوستان کو ایک خود مختار سوشلسٹ، سیکولر عوامی جمہوریہ کے طور پر قائم کرنے کا مقدس عہد کرتے ہیں، اور اس کے تمام شہریوں کو سماجی، معاشی اور سیاسی انصاف حاصل ہوگا۔ تمام شہریوں کو اظہار خیال اور عقیدہ، ایمان اور عبادت کی آزادی حاصل ہوگی۔ سب کو

منصب اور مواقع کی برابری حاصل ہوگی اور ان کے درمیان بھائی چارہ بڑھایا جائے گا۔ ہر فرد کی عزت کی ضمانت دی جائے گی اور ملک کے اتحاد و سالمیت کو برقرار رکھا جائے گا''۔

دستور ہند کے ابتدائیہ کے علاوہ بنیادی حقوق کے دفعات /14–15–16–19–21–25–26–27–28 میں برابری، عدم امتیاز، اظہار رائے اور مذہبی آزادی، اقلیتوں کو ان کے اپنے مذہبی و رفاہی ادارے قائم کرنے کا حق دیا گیا ہے۔ اسی طرح دفعہ /29–30 میں زبان، رسم الخط اور ثقافتی اداروں کے قیام اور اس کی حفاظت کی ضمانت دی گئی ہے اور سیکولرزم کو یہاں کی مختلف لسانی، مذہبی اور علاقائی گروہوں کی دینی، مذہبی، لسانی اور ثقافتی تنوع کی بنیاد پر ملک کی لازمی ضرورت سمجھتے ہوئے بیان کیا گیا ہے۔

اقلیت عدم تحفظ کا شکار کیوں ہوتی ہے؟

آزادی کے بعد سے اقلیت و اکثریت پر بحث ہوتی رہی ہے۔ یہاں اقلیت کی اصطلاح میں وہ تمام غیر دستاویزی گروہ شامل ہیں جو ملک کی کسی بھی ریاست میں اپنی مستقل شناخت رکھتے ہیں اور جو اپنی نسلی، مذہبی اور لسانی روایات و خصوصیات میں باقی ماندہ آبادی سے مختلف ہیں۔ ہندوستان میں عام طور پر مذہبی اقلیتوں میں مسلم، سکھ، مسیحی، پارسی، بدھ مت، جین مت وغیرہ شامل ہیں۔

اقلیتوں کے حالات پر غور کریں تو یہ معلوم ہوگا کہ کسی بھی ملک میں جہاں اقلیتیں آباد ہیں انہیں مختلف طرح کے خطرات و مشکلات درپیش ہوتے ہیں، خاص طور پر معاشی ترقی، سماجی مساوات، زندگی و املاک، سلامتی اور ثقافتی و مذہبی شناخت کے بارے میں وہ عدم تحفظ کے شکار ہوتے ہیں۔ اکثریت کی طرف سے عملی طور پر اگر انصاف میں کوتاہی ہوتی ہے تو نہ صرف مذہبی و لسانی اقلیتیں عدم تحفظ میں مبتلا ہوتی ہیں؛ بلکہ اس کے ساتھ احساس محرومی کا بھی شکار ہو جاتی ہیں اور اس طرح کے ماحول میں سماجی طور پر دھتکارے ہوئے دیگر طبقہ کے افراد بھی مذہبی اعتبار سے ایک ہونے کے باوجود اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ ہندوستان میں آج بھی مذہبی اعتبار سے ہندو ہونے کے باوجود وہ ذاتوں میں تقسیم کا شکار ہیں۔ اس لیے یہی نہیں کہا جاسکتا کہ صرف اقلیتیں ہی ناانصافی کا شکار ہوتی ہیں بلکہ عددی اکثریت کے باوجود ذات و

قبائل کی بنیاد پر بھی افراد سماجی ناانصافی کا شکار ہیں۔ اس لیے یہ لازمی نہیں ہے کہ کوئی اقلیت احساس محرومی کا ہمیشہ شکار ہو بلکہ مواقع ملنے پر وہ ترقی کی اونچی منزل پر بھی پہنچتے ہیں۔

ہندوستانی مسلمان

آزادی کے بعد دستوری تحفظ کے باوجود مسلمان آبادی پسماندگی کا شکار ہوئی، اس بارے میں مختلف کمیٹیوں اور افراد نے جو جائزے لیے ہیں وہ تشویش ظاہر کرتے ہیں۔ یہاں چند تاثرات درج کیے جاتے ہیں:

گوپال سنگھ پینل نے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے مسلمانوں کی محرومی کا ان الفاظ میں اظہار کیا ہے:

''مسلمان بطور ایک گروہ ہر معاملہ میں قومی اوسط کے لحاظ سے پسماندہ ہیں، ان کی سماجی کامیابی، ملکی معاملات میں ان کی شرکت، ان کی آمدنی کی سطح، ان کی بچت کی سطح، ان کی تعلیمی کامیابی بالعموم بہت کم ہے۔ ان کے درمیان اسکول چھوڑنے والوں کی تعداد زیادہ ہے اور کامیابی کی شرح نیچی ہے، اور یہ چیزیں بلا استثناء ہر علاقے اور ہر سطح کے لوگوں کے درمیان ہے''۔

ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی دہلی کے زیر اہتمام سید شمیم شاہ نے مسلمانوں کے ذریعہ چلائے جانے والے تعلیمی اداروں کا ایک سروے کیا تھا جس کی رپورٹ میں انہوں نے مسلمانوں کی محرومی کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے:

''ماضی قریب کے بعض سیاسی اور تاریخی واقعات کی وجہ سے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی کے تمام میدانوں میں تعلیم کی کمی اور ملکی سطح پر ہر جانب ہونے والی ترقی سے عدم واقفیت اور خود کی معاشی پستی کی وجہ سے وہ دائمی طور پر ظلم و محرومی کا شکار ہیں جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی جماعت پیچھے رہ گئی ہے۔ دراصل یہ برادری دھیرے دھیرے فائن آرٹ، سائنس و ٹیکنالوجی اور زبان و ثقافت میں ہونے والی تمام ترقیات سے محروم رکھی گئی ہے''۔

2004ء میں لندن اسکول آف اکنامکس کے مشہور ماہر معاشیات لارڈ بھیکو پارکھ نے اپنے

مطالعہ میں کہا:

"اگرچہ انہوں نے آزادی کے بعد بالخصوص 1980ء کی دہائی کے بعد ترقی کی ہے مگر وہ زندگی کے ہر دائرہ میں قومی اوسط سے بہت نیچے ہیں۔ان کے اندر جہالت اوراسکول چھوڑنے کی شرح بہت زیادہ ہے۔ ان کی بہت چھوٹی تعداد ہی کالج تک کی تعلیم پوری کر پاتی ہے۔ ان کی اوسط آمدنی ہندوؤں سے کم ہے اور معاشی طور پر خوشحال اور دولت مند مسلمانوں کی تعداد کا تناسب بہت ہی کم ہے۔ان کی معاشی طاقت کی کمی خود ان کی معاشی حیثیت سے جھلکتی ہے جس کے نتیجے میں وہ نسبتاً کم سماجی قوت رکھتے ہیں"۔

2006ء میں سچر کمیٹی (Sachar Commitee) نے اپنی رپورٹ میں یہ لکھا ہے:

"ہمارے تجزیہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف ریاستوں کے حالات میں (اور ان مسلمانوں کے حالات میں جو اپنے آپ کو او بی سی (Other Backward Class) اور دیگر طبقوں میں شمار کرتے ہیں) قابل لحاظ فرق پایا جاتا ہے، اور یہ کہ مسلم فرقہ ترقی کے عملاً تمام مظاہر میں خسارے اور محرومیوں سے دوچار ہے، در حقیقت زیر غور تمام اشاریوں کے لحاظ سے مسلمانوں کی حالت کم و بیش ایس سی، ایس ٹی (پسماندہ ترین طبقات، Scheduled Castes and Scheduled Tribes) سے کچھ بہتر مگر ہندو او بی سی، دیگر اقلیتوں اور عام ہندوؤں (بیشتر اعلی ذات والے) سے بدتر ہے۔ کثیر مسلم آبادی والی ریاست مغربی بنگال، بہار، اترپردیش اور آسام میں یہ صورت حال بطور خاص سنگین ہے، لیکن توجہ طلب بات یہ ہے کہ ان خساروں اور محرومیوں کے باوجود مسلمانوں میں نوزائدہ بچوں کی شرح اموات اور صنفی تناسب کم ہے۔ ترقیاتی خسارے کے علاوہ مسلمانوں میں بڑے پیمانے پر یہ احساس موجود ہے کہ ان کے خلاف امتیاز برتا جاتا ہے اور انہیں الگ تھلگ رکھا جا رہا ہے، اس سے مسئلہ سنگین تر ہو جاتا ہے"۔[1]

آزادی کے بعد مسلمانوں کی سماجی، معاشی، سیاسی، تعلیمی اور دینی صورتحال کے تفصیلی جائزہ

---

[1] سچر کمیٹی رپورٹ/231

اور اس پر بحث کی ضرورت ہے۔

سماجی حالت

جہاں تک سماجی صورتحال کا تعلق ہے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ سماجی طور پر ہندوستانی مسلمان کئی طرح کی مشکلات میں مبتلا ہیں۔ پہلا یہ کہ ان کے رہائشی علاقے ترقیاتی مواقع سے محروم ہیں۔ تشویشناک حد تک غربت نے اکثریت کو گھر کے لئے زمینوں سے محروم کر رکھا ہے۔ ان کے اپنے گھر کے لیے زمین پچاس فیصد کے پاس بھی نہیں ہے۔ غربت نے کئی طرح کی سماجی و معاشرتی خرابیوں کو جنم دیا ہے۔ ان کے گھروں کا ماحول دینی تعلیم کے فقدان کی وجہ سے اسلامی نہیں رہا۔ رہن سہن، تہذیب و ثقافت اور شادی بیاہ کے رسوم میں وہ مقامی معاشرہ کے اثرات قبول کرتے جا رہے ہیں۔ ان کے اندر ایک دوسرے کے حقوق کی ادائیگی، شریعت کے مطابق موروثی جائیداد کی تقسیم اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کے جذبات میں کمی کا واقع ہونا قابل توجہ ہے۔ ان میں اخلاقی خرابیاں جیسے شراب نوشی، کاروبار میں سچائی سے دوری، انصاف اور ہمدردی کی کمی صاف دکھائی دیتی ہے؛ اگرچہ بہت حد تک یہاں کے بسنے والے دیگر طبقات کے مقابلے میں اچھے اخلاق کے حامل دکھائی دیتے ہیں۔ گھریلو اعتبار سے بعض حساس علاقوں میں پینے کے صاف پانی اور صفائی کی عدم موجودگی نے صحت کے علاوہ انہیں کئی طرح کے سماجی، نفسیاتی مسائل جیسے ذہنی تناؤ، ڈپریشن وغیرہ میں مبتلا کر دیا ہے۔ بعض علاقوں میں ان کی حالت ایسی ہے جیسے جانوروں کی ہوتی ہے۔ یہ سب امور انتہائی تشویشناک ہیں۔ خاص طور پر ایسی آبادیاں جہاں یہ تھوڑی تعداد میں ہیں اور غربت میں مبتلا ہیں ان کی معاشرتی زندگی بھی ویسی ہی ہے۔ جیسی ایس سی اور ایس ٹی کی زندگی ہے۔

سماجی صورتحال کی بیشتر خرابیاں بدتر معاشی حالت کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں اور ان کی معاشی حالت مختلف میدانوں میں انتہائی تشویشناک ہے۔

معاشی حالت

مسلم معیشت کا جہاں تک تعلق ہے تو معاشرے کا یہ پہلو بہت اہمیت رکھتا ہے۔ان کی آمدنی قومی سطح کی آمدنی سے کافی کم ہے۔ وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ سرکاری اور پرائیویٹ ایجنسیاں مسلمانوں کو تعاون دیں تاکہ وہ اپنی حالت کو بہتر بنا سکیں۔شہریوں کے اقتصادی اور تجارتی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے قرضے ایک اہم ذریعہ ہو سکتے ہیں، لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے تو ملازمتوں میں ان کی حصہ داری چاہے سرکاری شعبے میں ہو یا غیر سرکاری شعبے میں بہت کم ہے۔اس طرح بینکوں سے ملنے والے قرضوں کی صورتحال کچھ زیادہ امید افزا نہیں ہے۔ مختلف رپورٹوں سے معلوم ہوتا ہے کہ صرف چار فیصد افراد کو بینک قرضوں تک رسائی ہے۔ بلکہ قابل لحاظ مسلم آبادی والے بیشتر علاقوں کو بینکوں نے منفی علاقہ قرار دے دیا ہے۔ وہاں کے رہنے والوں کو بینک قرض نہیں دیتے۔ یہی حال وزیراعظم کے پندرہ نکاتی پروگرام کے تحت قرضوں کی سہولت کا ہے، وہاں بھی مسلمان فائدہ نہیں اٹھاتے ہیں۔اسی طرح قومی اقلیتی مالیاتی کارپوریشن، نیشنل بیک ورڈ کلاس، فائنانس اینڈ ڈیولپمنٹ کارپوریشن اور دیگر مالیاتی اداروں کی طرف سے دیئے جانے والے قرضوں کا جہاں تک تعلق ہے تو یہاں بھی بالعموم مسلمانوں کو محرومی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

تعلیمی حالت

جہاں تک مسلمانوں کی عمومی تعلیم کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں مختلف رپورٹوں سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ مسلم طلبہ اور عام مسلمانوں کی خواندگی کی شرح قومی شرح خواندگی سے کم ہے۔ یہ فرق دیہی علاقوں کے مقابلہ میں شہری علاقوں میں زیادہ ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ 6 سال سے 14 سال کی درمیانی عمر والے 25 فیصد مسلم بچے یا تو کبھی اسکول جاتے ہی نہیں اور جاتے ہیں تو درمیان میں ہی تعلیم ترک کر دیتے ہیں۔ یہی حال اعلی تعلیم کا ہے۔ دیگر تمام طبقوں کے مقابلہ میں خاص طور پر شہری علاقوں کے مردوں میں گریجویشن مکمل کرنے کا امکان ایس سی ایس ٹی سے بھی کم ہوتا ہے، اور جو گریجویٹ ہوتے ہیں ان میں دیگر طبقوں کے مقابلے مسلم طبقے میں بے روزگاری کی شرح زیادہ

ہے۔ جہاں تک خواتین کی تعلیم کا تعلق ہے شہری علاقوں میں یہ فرق کافی نمایاں ہے۔ دیگر پسماندہ طبقات کے مقابلے مسلم خواتین کی شرح خواندگی کافی کم ہے۔ اس کی ایک وجہ مسلم علاقوں میں لڑکیوں کے اسکول کی عدم موجودگی ہے، کالج تو اور بھی کم ہیں، اسی لیے مسلمان طلبا و طالبات ہائر سکینڈری اور کالج کی سطح پر نسبتاً زیادہ نقصان میں ہیں۔

تحفظ اور شناخت

مسلمان مذہبی اور ثقافتی طور پر اپنی ایک الگ شناخت رکھتے ہیں۔ لباس میں عورتیں پردہ کے لیے نقاب استعمال کرتی ہیں اور مرد داڑھی رکھتے ہیں اور ٹوپی استعمال کرتے ہیں۔ مگر یہ اپنی شناخت کی وجہ سے بہت سی جگہوں پر تحفظ کے مسائل سے دوچار ہیں۔ بعض ریاستوں میں یہ شکایت ملتی ہے کہ کسی داڑھی اور ٹوپی والے کو بازاروں، ریلوے اسٹیشنوں اور عوامی جگہوں سے انکوائری کے بہانے پولیس اٹھا کر لے گئی ہے۔ اسی طرح نقاب پوش مسلم عورتوں کو شکایت ہے کہ بازاروں، ہسپتالوں اور اسکولوں میں ان کے ساتھ سخت نازیبا سلوک کیا جاتا ہے؛ یہاں تک کہ پبلک سیکٹر ٹرانسپورٹ بھی محفوظ نہیں ہے۔ اس تناظر میں مسلمانوں کے لیے بعض علاقوں کو انتہائی غیر محفوظ بنا دیا گیا ہے۔ ان کے خلاف ہر سطح پر آوازیں کسی جاتی ہیں اور انہیں شک کے دائرہ میں رکھا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کسی داڑھی والے مسلمان کو برملا آئی ایس آئی کا ایجنٹ قرار دینے میں بھی تامل نہیں ہوتا۔ دہشت گردی سے متعلق کسی بھی سانحہ کے بعد پولیس کے ذریعہ مسلم نوجوانوں کا اغوا عام بات ہے۔ مسلم خواتین کی عزت و عصمت خاص طور پر فسادات کے موقع پر بالکل غیر محفوظ ہو جاتی ہے۔

دینی حالت

ہندوستان میں مسلمانوں کی دینی حالت کو بھی کسی طرح قابل اطمینان نہیں کہا جا سکتا۔ ان کی رہائش ہندوستان کے ایسے شہری اور دیہی گاؤں اور محلوں میں ہے جہاں عام طور پر نہ مساجد ہیں، نہ مکاتب، نہ اس میں علماء و مبلغین کی آمد و رفت ہے۔ بہت سی آبادیوں میں یہ تھوڑی تعداد میں موجود ہیں وہ اپنی غربت اور جہالت کی وجہ سے دین سے ناآشنا ہیں اور ان کے ایمان کو خطرات لاحق

ہیں بعض جگہوں پر تو صرف ختنہ اور نکاح کی حد تک ہی مسلمان ہیں۔ وہ حلال و حرام پاکی و ناپاکی یا نماز، روزے سے بھی نا آشنا ہیں۔ اگر ہم جمعہ اور عیدین میں شریک ہونے کی بات کریں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ کل مسلم آبادی کے نصف حصے سے کم اس میں شریک ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے اس میں مسلمان مرد ہی شریک ہوتے ہیں، خواتین جمعہ اور عیدین سے بھی محروم ہوتی ہیں۔ پنجگانہ نمازوں میں دس ہی فیصد مردوں اور عورتوں پر مشتمل اس کی پابندی کرتے ہیں۔ رمضان کے روزے البتہ نوے فیصد سے زیادہ افراد رکھتے ہیں جس میں مرد اور خواتین دونوں شامل ہیں۔ جن لوگوں پر زکوۃ فرض ہے پورے ملک میں غالباً چالیس فیصد افراد ہی اس فریضہ کی ادائیگی پر عمل کرتے ہیں، یہی حالت دیگر احکام شریعت اور ان کی اخلاقیات کا ہے۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ جو دس فیصد افراد میں جو دینی پختگی ہے ان میں سے پانچ فیصد تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے باضابطہ دینی مدارس میں تعلیم پائی ہے۔

مسلمانوں کی دینی تعلیم

انگیزوں کے غلبے کے بعد انیسویں صدی میں برصغیر ہند کے مسلمان جن سنگین مسائل سے دوچار ہوئے تھے ان میں دینی مدارس اور تعلیم کے نظام کا خاتمہ بھی تھا۔ اس لیے علماء کے سامنے ایک بڑا مسئلہ دین اور تعلیم دین کی حفاظت و فروغ اور دینی شناخت کی بقاء کا تھا؛ چونکہ پہلے سے جن مدارس میں علماء خدمات انجام دے رہے تھے نظام حکومت بدلنے سے وہ مدارس زوال کا شکار ہو گئے یا انگریزوں نے ان علماء کو قید و بند کی صعوبتیں دے کر مدارس پر روک لگانے کی کوشش کی، مدارس کی جاگیریں اور اوقاف کو ضبط کر کے ذرائع آمدنی کو مسدود کر دیا جس کی وجہ سے بڑی تعداد میں اس ملک کے مدارس بند ہو گئے۔

اس کے بعد علماء نے محسوس کیا کہ مدارس کو عوامی شکل دی جائے اور اسے سرکاری سرپرستی سے الگ رکھا جائے۔ چنانچہ علماء نے 1857ء کے بعد دینی مدارس قائم کرنے کی تحریک شروع کی اور اس کی بنیاد عوامی چندے پر رکھی، خاص طور پر حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے 1866ء میں دارالعلوم دیوبند قائم کیا اور دیگر اکابر علماء نے اس تحریک کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا اور اس کے

ذریعہ مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش انیسویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک جاری رہی اور اکیسویں صدی میں بھی یہ تحریک جاری ہے۔ اس مدت میں مدرسے قائم کیے گئے اس کے اثرات مسلمانوں میں دوررس ہوئے اور مسلمانوں میں نسل در نسل علم دین سے وابستگی کا علماء کا منصوبہ کامیاب رہا۔ اس کی وجہ سے انیسویں اور بیسویں صدی میں یہاں کے مسلمان اپنی دینی شناخت کو برقرار رکھنے میں نہ صرف کامیاب ہوئے بلکہ اس تحریک کو دنیا کے ان دیگر ملکوں میں بھی پہنچایا جہاں کے مسلمان بے دینی کا شکار ہو گئے تھے اور جہاں کے مسلمان مدارس کی حکومتی سرپرستی کے ختم ہونے کے بعد دینی تعلیم کا نظام ختم ہونے سے مشکلات میں مبتلا ہو گئے تھے۔ علماء نے صرف مدارس ہی قائم نہیں کیے بلکہ اس کے ساتھ ان کی ذات مسلسل طور پر علم اور تعلیم کا مرجع بنی رہی، ان کا گھر لوگوں کے لیے تعلیم گاہ کا کام کرنے لگا، اور اس تعلیمی تحریک سے اسلامی معاشرہ کے ہر طبقہ نے فیض اٹھایا۔

ہندوستان میں اس وقت مسلمانوں کی دینی ضرورتیں انہی سے پوری ہوتی رہی ہیں۔ مدارس ہی سے مساجد کے امام، مکاتب کے معلم، مفتی، قاضی اور دعوت و تبلیغ کے کام کرنے والے افراد ملتے ہیں بلکہ مدارس سے صحافی، اسلامی اسٹڈیز کے اسکالر اور دنیاوی کاموں میں بھی یہاں کے افراد ملتے ہیں جیسے سفارت خانے، ریڈیو، برآمدی تجارت، امور خارجہ اور ثقافتی اداروں کے لیے اردو اور عربی کے افراد مدارس ہی سے آتے ہیں۔ بلکہ کمپیوٹر جاننے کی بنیاد پر اردو اور عربی کے کمپوزر بھی یہیں سے ملتے ہیں۔ ملک کے اندر کی دینی ضرورتیں انہی سے پوری ہوتی ہیں۔ اس تعلیم و تربیت کے نظام کو اور زیادہ مفید بنایا جا سکتا ہے۔ امکانات سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے مسلسل مشترکہ غور و فکر کی ضرورت ہے، تاکہ ان مدارس کے طلبہ اور اساتذہ کا علمی معیار اور بلند ہو اور مدارس سے ایسے فقہاء ملت تیار ہوں جو موجودہ دور کے نئے مسائل پر مجتہدانہ نگاہ ڈالیں اور شریعت اسلامی کی ابدیت کو دنیا کے سامنے علمی و عملی طور پر پیش کریں۔ اس سمت میں جو کام ہونا چاہیے اس میں بہت کمی ہے، اسی طرح ہندوستانی مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے دینی تعلیم کے اس نظام کو اور پھیلائیں اور ان تمام قصبات اور محلوں میں دینی مکاتب کے نظام کو قائم کریں تاکہ وہاں کی نئی نسل دین کی بنیادی تعلیم سے آراستہ ہو۔

بنگلہ دیش میں مذہبی آزادی اور اقلیتیں

کرن فدا

بنگلہ دیش مجموعی طور پہ ایک ابھرتی ہوئی معیشت اور پرامن ریاست ہے۔ اس کے بارے میں مذہبی تنازعات کے حوالے سے کوئی زیادہ خبریں میڈیا کی زینت نہیں بنتیں۔ سوائے اس کے کہ ابھی حالیہ چند سالوں میں کچھ ایسے انفرادی واقعات پیش آئے جن میں وہاں کی ہندو اقلیت کو نشانہ بنایا گیا۔ تاہم ریاست نے اس لہر کو روکنے کے لیے قانونی و انتظامی سطح پر کئی بڑے اقدامات کیے تاکہ تمام اقلیتوں کے تحفظ کو یقینی بنایا جاسکے۔ بنگلہ دیش کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہاں اقلیت عام طور پہ تعلیم یافتہ اور کاروباری ہے۔ اس سارے منظرنامے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ملک میں مذہبی آزادی کی صورتحال زیادہ خراب نہیں ہے۔ اس مضمون میں بنگلہ دیش کے اسی پہلو پر بات کی گئی ہے۔ مضمون نگار 'انٹرنیشنل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور' میں پراجیکٹ کوآرڈینیٹر ہیں۔

بنگلہ دیش کا ریاستی مذہب اسلام ہے۔ ملک کا آئین مذہبی آزادی کی ضمانت دیتا ہے اور قطع نظر مذہبی امتیاز کے تمام بنگلہ دیشی شہریوں کو مساوی بنیادی حقوق دیتا ہے۔ 2011ء کی مردم شماری کے مطابق مسلمان کل آبادی کا 90 فیصد، جب کہ ہندو 8.5 فیصد اور 2 فیصد کے قریب دیگر مذاہب کے لوگ ہیں۔ 2003ء کے ایک جائزے میں یہ بات سامنے آئی کہ عام شہری اپنی شناخت مذہب سے کرتے ہیں۔ بنگلہ دیش میں صرف اسلام، ہندومت، مسیحیت اور بدھ مت مذاہب پائے جاتے ہیں۔

بنگلہ دیش کا آئین اسلام کو ریاستی مذہب قرار دیتا ہے۔ اسلام اس ملک کا سب سے بڑا مذہب ہے۔ اس میں مسلمانوں کی کل آبادی 146.0 ملین ہے۔ یہ مسلم آبادی کے لحاظ سے انڈونیشیا، پاکستان اور بھارت کے بعد چوتھا بڑا ملک ہے۔ بنگلہ دیش میں مسلمان آبادی ملک کی کل آبادی کا 90.0 فیصد ہے۔ مسلمان ملک کی اہم ترین برادری ہیں اور بنگلہ دیش کے تمام آٹھوں ڈویژنوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ مسلم آبادی کی اکثریت 88 فیصد بنگالی مسلمانوں پر مشتمل ہے، لیکن 2 فیصد کی تعداد میں بہاری مسلمان اور آسامی مسلمان بھی ہیں۔ مسلمان آبادی کی اکثریت اہل سنت ہے، لیکن

ایک مختصر تعداد اہل تشیع کی بھی ہے۔ اہل تشیع شہری آبادیوں میں رہائش پذیر ہیں۔ شیعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے، حسین ابن علیؓ کی شہادت پر محرم میں اپنے مخصوص اعمال بجا لاتے ہیں۔ عید الفطر، عید الاضحی، عاشورہ، عید میلاد النبی، شب برات اور چاند رات وغیرہ کے تہوار ملک بھر میں انتہائی اہمیت رکھتے ہیں۔ سالانہ بشوا اجتماع (تبلیغی اجتماع) سب سے بڑا اجتماع ہوتا ہے۔

ہندومت

ہندومت بنگلہ دیش کا دوسرا بڑا مذہب ہے۔ بنگلہ دیش کی 2011ء کی مردم شماری کے مطابق ہندومت کل آبادی کے 8.96 فیصد عوام کا مذہب ہے۔ آبادی کے لحاظ سے، بنگلہ دیش بھارت اور نیپال کے بعد تیسرا بڑا ہندو آبادی والا ملک ہے۔ بنگلہ دیش دفتر شماریات (بی بی ایس) کے مطابق، 2015ء میں 17 ملین ہندو آبادی تھی۔ قدرتی طور پر، بنگلہ دیش میں ہندومت کی ہیئت، رسم و رواج اور عبادات پڑوسی بھارتی ریاست مغربی بنگال کے ہندومت کے مماثل ہیں۔ مغربی بنگال اور بنگلہ دیش (ایک دور میں اس کا نام مشرقی بنگال کے طور پر مشہور ہوا) 1947ء میں تقسیم ہند تک متحدہ علاقہ تھا جو بنگال کہلاتا۔ بنگلہ دیشی ہندوؤں کی اکثریت بنگالی ہندو ہے۔

بدھ مت

1,000,000 بنگلہ دیشی تھیرواد بدھ مت سے تعلق رکھتے ہیں۔ بنگلہ دیش کی کل آبادی کا 0.6 فیصد بدھ مت ہیں۔ قدیم دور میں، آج کا خطہ بنگلہ دیش ایشیا میں بدھ مت کا مرکز تھا۔ بدھ مت تہذیب، فلسفہ اور فن تعمیر بنگال سے تبت، جنوب مشرقی ایشیا اور انڈونیشیا پہنچا۔ کمبوڈیا، انڈونیشیا اور تھائی لینڈ کا بدھ فن تعمیر، بنگال کے فن تعمیر سے متاثر ہیں۔

مسیحیت

مسیحیت پرتگالی تاجروں اور مشنریوں کے ذریعے بنگلہ دیش میں سولہویں صدی عیسوی کے اخیر اور سترہویں صدی عیسوی کے آغاز میں داخل ہوئی۔ مسیحی کل آبادی کا 0.4 فیصد ہیں جن کی

اکثریت شہری علاقوں میں رہتی ہے۔ بنگالی مسیحیوں میں رومن کیتھولک اہم ہے، جب کہ باقی زیادہ تر پروٹسٹنٹ ہیں۔

الحاد

دہریت بنگلہ دیش میں عام نہیں ہے۔ 2014ء کے WIN/GIA جائزے کے مطابق، جواب دہندگان میں سے 5 فیصد افراد نے خود کو لادین ظاہر کیا۔

سماجی حیثیت

بنگلہ دیش میں ہندو اقلیت کی تعلیمی شرح مجموعی لحاظ سے سب سے اوپر ہے، اور کاروبار کے اعتبار سے بھی یہ طبقہ مضبوط سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ بدھ اور مسیحی اقلیتیں تعلیمی لحاظ سے کافی پست درجے میں ہیں اور نتیجے میں ان کی معاشی حالت بھی زیادہ اچھی نہیں ہے۔

سرکاری مذہب کی بحث

1972ء کے آئین میں بنگلہ دیش کو ایک سیکولر ملک قرار دیا گیا تھا۔ بعدازاں 1988ء میں ترمیم کر کے اسلام کو سرکاری مذہب قرار دیا گیا۔ لیکن اس کے بعد سے یہ بحث جاری ہے کہ ملک کے آئین کو سیکولر ہونا چاہیے یا سرکاری مذہبی اسلام باقی رہے۔ 2017ء میں ہائی کوٹ نے ایک درخواست بھی سماعت کے لیے منظور کی تھی جس میں خیال کیا جارہا تھا کہ آئین سے سرکاری مذہب کی شق کو ختم کر دیا جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پھر 2021 میں ایک بار پھر خود حکومت نے عندیہ دیا کہ آئین کی اس شق کو ختم کیا جائے گا تاکہ اقلیتوں کو مساوی شہری بنایا جاسکے۔ حکومت میں سیاستدانوں کی ایک بڑی تعداد یہی چاہتی ہے۔ موجودہ وزیر اطلاعات مراد حسن نے ایک تقریب کے دوران کہا تھا کہ 'میرا نہیں خیال اسلام ہمارا قومی مذہب ہے۔ ہم 1972 کا آئین واپس لائیں گے۔ ہم وزیر اعظم شیخ حسینہ کی قیادت میں پارلیمان سے قانون منظور کروائیں گے۔ جلد ہم 1972 کا سیکولر آئین اپنا لیں گے۔'

اقلیت مخالف جذبات زیادہ مضبوط نہیں

اگرچہ بنگلہ دیش میں مذہبی عنصر بھی طاقتور ہے۔ لیکن اس کے باوجود عوام میں اقلیتوں کے خلاف جذبات زیادہ طاقتور نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کئی اہم مناصب پر اقلیتی شہری موجود ہوتے ہیں۔ سریندر کمار سنہا بنگلہ دیش سپریم کورٹ کے ہندو چیف جسٹس رہے۔ 17 جنوری 2015ء کو بنگلہ دیش کے صدر نے ملک کی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدے پر انہیں مقرر کیا۔ سنہا بنگلہ دیش سپریم کورٹ کے 21ویں چیف جسٹس رہے۔

انتخاب کے دوران بنگلہ دیش میں اقلیتوں کے تحفظ کی بات ایک نمایاں مدعا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کے اس دوران اقلیتوں کی بہبود کے بڑے بڑے وعدے کیے جاتے ہیں۔ 2019ء کے عام انتخابات کے دوران حکمران جماعت عوامی لیگ نے اپنی جماعت کی طرف سے 18 غیر مسلموں کو ٹکٹ دیے تھے۔ ان میں سے پندرہ ہندو، دو بدھ اور ایک مسیحی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ سارے اقلیتی امیدوار کامیاب ہوئے۔

ہندو مخالف عنصر

البتہ حالیہ چند برسوں سے ہندو اقلیت کے خلاف بنگلہ دیش میں مظاہرے اور احتجاج بھی ہوتے رہتے ہیں۔ 2021ء میں ہندوؤں کے عالمی تہوار درگا پوجا کے موقع پر قرآن کریم کی بے حرمتی کے الزام میں ملک میں شدید فسادات پھوٹ پڑے جس میں مندروں پر حملے ہوئے اور متعدد ہندو شہری مارے گئے تھے۔ بنگلہ دیشی انسانی حقوق کی تنظیم عین الثالث کیندر (اے ایس کے) کے مطابق گزشتہ سال درگا پوجا پر ہونے والے حملوں سے پہلے بھی 100 سے زائد ہندوؤں کے گھروں پر حملے ہو چکے تھے۔ 2013 سے 2021 کے درمیان ہندوؤں پر 3,500 سے زیادہ حملے ہوئے جن میں مندروں پر 1,678 حملے اور مورتیوں کی توڑ پھوڑ شامل ہے۔ درگا پوجا فسادات کے بعد حکومت نے اقلیتوں کو مزید تحفظ دینے کے لیے قانون متعارف کرائے۔ ان میں ایک قانون گواہوں کو تحفظ دینے سے متعلق ہے تاکہ اس طرح کے واقعات میں ملوث لوگوں کو سزا دینا یقینی بنایا جاسکے۔ اس قانون کے

تحت گواہوں کو تحفظ فراہم کرنے کے انتظامات کیے گئے ہیں۔ قانون کے مطابق اگر کوئی گواہوں کے ساتھ بد تمیزی کرے گا تو اسے بھی جرم تصور کیا جائے گا اور ایسا کرنے والوں کے خلاف کارروائی کی گنجائش ہو گی۔ قانون گواہوں کی رازداری کو تحفظ دینے کا بھی انتظام کرتا ہے۔ اس قانون کے پیچھے استدلال یہ ہے کہ ملک کی سپریم کورٹ نے سال 2015 میں وزارت داخلہ اور وزارت قانون کو گواہوں کی حفاظت کے لیے اقدامات کرنے کی ہدایت کی تھی۔

ماہرین کے مطابق 1964 سے 2013 کے درمیان 11.3 ملین ہندو یا تو ملک چھوڑنے پر مجبور ہوئے یا ہجرت کر گئے۔ اس سے بعض لوگ یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ملک میں اقلیت محفوظ نہیں ہے۔ لیکن کئی لوگ اس خیال کو درست نہیں سمجھتے کہ بنگلہ دیش سے اقلیتیں ہجرت کر رہی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس ہجرت کی وجہ یہ نہیں کہ ان کے لیے سماج میں جگہ باقی نہیں بلکہ اس میں ایک بڑی تعداد تو وہ ہے جس نے اکہتر کے وقت ہجرت کی تھی۔ پھر کافی تر تعداد اسی طرح کاروبار اور روزگار کے لیے ہجرت کر رہی ہے جیسے اکثریتی آبادی سے نوجوان دوسرے ممالک جا رہے ہیں۔

1991 سے 1996 اور 2001 سے 2006 کے دوران اقلیتوں کو مسائل کا سامنا تھا اور ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے انڈیا میں نقل مکانی کی تھی۔

بھارت کی صورتحال کے بنگلہ دیش پر اثرات

2014 کے بعد سے بھارت میں مسلمانوں کے خلاف کاروائیاں بڑھی ہیں اور مسلم مخالف جذبات کو ہوا ملی ہے۔ اس کے اثرات بنگلہ دیش پر بھی پڑے ہیں اور وہاں ہندو اقلیت کے لیے مشکلات پیدا ہوئی ہیں۔ ملک کی بڑی جماعت عوامی لیگ خود کو سیکولر کہتی ہے اور بھارت کے قریب سمجھی جاتی ہے۔ تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ عوامی لیگ کی حکومت انڈیا میں نسل پرستی پر مبنی سیاست کے پھیلاؤ سے پریشان ہے۔ یہ قدرتی ہے کہ اگر (انڈیا جیسے) بڑے ہمسایہ ملک میں مذہبی انتہا پسندی بڑھتی ہے تو اس سے بنگلہ دیش پر بھی اثرات مرتب ہوں گے۔ انڈیا کا سیکولر ڈھانچہ کمزور ہوا ہے۔

نقل مکانی

ملک کی ایک انسانی حقوق کی تنظیم این او سیلاش کیندرا (اے ایس کے) کے مطابق 2013 سے اب تک اس ملک میں ہندوؤں پر 3600 سے زیادہ حملے کیے جا چکے ہیں۔ ان حملوں میں گیارہ ہندو ہلاک اور 862 افراد زخمی ہوئے تھے۔ ہندو خواتین کے خلاف جنسی تشدد کے واقعات بھی رپورٹ کیے گئے ہیں۔

ملک کی اقلیتی آبادی یہ سمجھتی ہے کہ بنگلہ دیش میں ان کے لیے وقت کے ساتھ مشکلات بڑھ رہی ہیں۔ اس کی وجہ جہاں سخت گیر عناصر ہیں تو اس کے ساتھ بھارت کا مسلمانوں کے خلاف رویہ بھی ایک بڑا سبب ہے جو دونوں برادریوں میں منافرت کو ہوا دے رہا ہے۔ اقلیتیں شیخ مجیب سے خصوصی لگاؤ رکھتی ہیں اور ان کا خیال ہے کہ وہ اقلیتوں کا خیال رکھنے والے تھے، لیکن انہیں 1975 قتل کر دیا گیا تھا۔

پاکستان میں مذہبی آزادی کا مسئلہ

پاکستان میں مذہبی آزادی کا سوال: دستوری مباحث

ظفراللہ خان

پاکستان کے وجود میں آنے اور اس کے قیام کے لیے تحریک چلانے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ بطور اقلیت مسلمانوں کو ہندو اکثریتی سماج میں مشکلات پیش آئیں گی اور انہیں مساوی حقوق سے محروم کیا جائے گا۔ اس لیے مسلمانوں نے ایک الگ مملکت کے قیام کا مطالبہ کیا تھا۔بانیانِ پاکستان نے اسی لیے پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی اقلیتوں کے تحفظ کو یقینی بنانے کے وعدے کیے اور عملی طور پہ اقلیتوں کو عہدے بھی دیے۔لیکن وقت کے ساتھ ملک میں اقلیتوں کے لیے مسائل پیداہوئے جس پر ماہرین اپنی مختلف آراء دیتے ہیں۔ اس مضمون میں پاکستان کے دستوری و قانونی مباحث کے تناظر میں اختصار کے ساتھ ایک عمدہ تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ظفراللہ خان 'پاکستان انسٹی ٹیوٹ برائے پارلیمانی خدمات'(PIPS) کے سابق سربراہ اور' قومی کمیشن برائے انسانی حقوق' کے ممبر رہے ہیں۔ آج کل وہ تھنک ٹینک ''وِژن 2047 ء''کے سربراہ ہیں۔

عصرِ حاضر میں مذہب وریاست کا تعلق

مذہب اور ریاست کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ یہ ایک قدیم سوال ہے۔ مختلف الہامی مذاہب اور ادیان میں ریاست کا کیا تصور ہے اور انسانی فکر سے تشکیل پانے والے مذاہب اور عقائد اس سوال کو کیسے ڈِیل کرتے ہیں؟ ان سوالات کے جوابات کی جستجو ہمیں 21 ویں صدی کی جدید ریاست میں مذہبی آزادی کے سوال اور جواب کی کھوج میں معاونت کر سکتی ہے۔ تاریخ اور سیاسیات کے طالب علم کی حیثیت سے میں نے مذہب اور ریاست کے سوال پر تھوڑی بہت تحقیق کی ہے۔ ابراہیمی مذاہب میں یہودیت قدیم ترین ہے اور ڈیوڈ اور گولیاتھ کی کہانی— قصہ سناتی ہے کہ کس طرح کمزور ظالم پر غالب آ سکتے ہیں۔ ڈیوڈ (داؤدؑ) کے بیٹے سلیمانؑ کے تخت کے قصے ہمیں بائبل اور قرآن مجید میں ملتے ہیں۔ گویا یہودیت میں دنیاوی حکمران کا تصور موجود تھا۔ عیسائیت کی تاریخ دیکھیں تو حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر مصلوب ہونے سے آسمان پر اٹھائے جانے کی روایات اور عقائد موجود ہیں۔ لیکن دنیا

میں مسیحیت کا چراغ سینٹ پیٹر کی نگر نگر تبلیغ کی بدولت زندہ رہا۔ مسیحیت کو پہلی دنیاوی ریاست اس وقت نصیب ہوئی جب شہنشاہ کانسٹنٹائن نے مسیحیت اپنائی۔

آخری الہامی دین، اسلام کے مکی اور مدنی ادوار میں ہمیں ہجرت حبشہ، ہجرت مدینہ، میثاق مدینہ، صلح حدیبیہ، معاہدہ نجران اور خطبہ حجتہ الوداع کی صورت میں جدید ریاست کے وہ سارے خدوخال ملتے ہیں جو مختلف العقائد افراد کے مابین رواداری، برداشت اور بقائے باہمی کے جدید ترین اصول فراہم کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثر دستاویز میں مذہبی اور نسلی قومیتوں کے وجود کا آئینی اور سماجی اقرار اور سماج کی نمو کے لئے ایک لچکدار رویہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اگر دنیاوی افکار (کم از کم ان کا الہامی اقرار موجود نہیں) سے تشکیل پاتے عقائد کی بات کریں تو ہندومت میں ریاست اور ''ڈنڈے'' کا تصور نمایاں نظر آتا ہے جس کا اظہار آج کے ہندوستان میں ہمیں ''ہندومت کی اصلیت کی تلاش میں'' جابجا ملتا ہے۔ سکھ مت میں بھگت پر زور تھا لیکن اب ہمیں اس میں سیاسی بھگت/شکتی کی سعی بھی نظر آتی ہے۔ بدھ مت بادشاہت سے سدھارتا کی جستجو کا سفر ہے۔ شہزادہ گیان کی آرزو میں تخت سے دور ہوا۔ تاہم آج بدھ مت بھی سری لنکا اور دیگر چند ممالک میں عصری سیاست میں گیان کی تلاش میں نظر آتی ہے۔ میرا محدود مطالعہ اس سے زیادہ لکھنے کی اجازت نہیں دیتا تاہم یہ اشارے اہل علم کو اس موضوع پر غور و فکر کی دعوت ضرور دیتے ہیں۔ اور میں تاریخ کے ایک ادنی طالب علم کی حیثیت سے اپنی اصلاح کے لئے دستیاب ہوں۔ تاہم اپنے ناقص مطالعہ اور فہم کی بنیاد پر اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ اسلام واحد الہامی دین ہے جو ابتداء سے ہی اپنی سوچ اور اپروچ میں کثیر الفکر ہے۔ چارٹر آف مدینہ جسے دنیا کا پہلا تحریری دستور گردانا جاتا ہے اس میں دیگر عقائد کی نشوونما اور سماجی بقاء کی بات کی گئی تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نبی مہربان ﷺ کو رحمت العالمین کہا جاتا ہے۔

قیامِ پاکستان کے پس منظر میں مذہبی آزادی

کہا جا سکتا ہے کہ قدیم ریاست فاتحین کا سب کچھ قبول کرنے اور مفتوحین کو ہر طرح سے زیر کرنے کا نام تھا۔ لیکن آج ہم جدید ریاست کے شہری ہیں۔ قومیت کے تصور کے ارد گرد جدوجہد کثیر

العقائد ہے۔ قیام پاکستان کی جد وجہد میں ہمیں مولانا ابو الکلام آزاد دوسری صف میں کھڑے نظر آتے ہیں جبکہ دلت رہنما جو گندر اناتھ منڈل پاکستان کے قیام کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں۔ مسیحی سیاست دان دیوان بہادر ایس پی سنگھا پنجاب اسمبلی کے اسپیکر کی حیثیت سے پاکستان کے حق میں ووٹ دیتے ہیں۔ان اشاروں کی مدد سے دلیل بنائی جاسکتی ہے کہ مذہبی اقلیتیں قیام پاکستان میں برابر کی شریک تھیں لہذا انہیں ''ذمی'' نہیں بنایا جاسکتا۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان ایک کثیر الفکر اور کثیر المذاہب ملک ہے جہاں شہریوں کو باہم مل جل کر رہنا ہوگا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ 10 اگست 1947ء کو پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس ہوا تو جو گندر اناتھ منڈل اس کے عبوری صدر تھے۔ قائداعظم محمد علی جناح اور دیگر رہنما اس سے بڑا پیغام نہیں دے سکتے تھے۔ 11 اگست 1947ء کی تاریخی تقریر میں بانی پاکستان نے اس بات کی واشگاف الفاظ میں وضاحت کر دی:

''مجھے معلوم ہے کہ کچھ لوگ ہندوستان کی تقسیم سے متفق نہیں ہیں اور پنجاب اور بنگال کی تقسیم سے بھی اتفاق نہیں رکھتے۔اس کے خلاف بہت کچھ کہا جا چکا ہے لیکن اب کے اسے منظور کر لیا گیا ہے۔

ہم سب کا فرض ہے کہ وفاداری کے ساتھ اس فیصلہ پر قائم رہیں اور جو معاہدہ حتمی طور پر ہو چکا ہے اور جس کے ہم سب پابند ہیں۔اس معاہدہ کا احترام کریں اور اس کے مطابق عمل کریں لیکن جیسا کہ میں نے کہا ہے، آپ حضرات کو یاد رکھنا چاہئے کہ جو عظیم انقلاب ہمارے درمیان رونما ہوا ہے تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ جہاں کہیں ایک فرقہ کے لوگ اکثریت میں ہوں اور دوسرے فرقہ کے لوگ اقلیت میں ہوں تو ان دونوں کے درمیان جس طرح کے احساسات پائے جاتے ہیں انہیں بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جو کچھ ہوا، کیا اس کے برعکس ہونا، ممکن یا قابل عمل تھا؟ تقسیم بہر حال ہونی تھی۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں آبادی کے ایسے حصے موجود ہیں، جو اس سے متفق نہ ہوں گے اور جو اسے پسند نہ کرتے ہوں گے۔ لیکن میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس مسئلے کا کوئی حل نہیں تھا اور مجھے یقین ہے کہ مستقبل کی تاریخ سے اس فیصلہ کی توثیق ہو جائے گی۔ مزید یہ کہ وقت گزرنے کے ساتھ خود ہمارے تجربوں سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ ہندوستان کے

آئینی مسئلہ کا واحد کا حل یہی تھا۔ متحدہ ہندوستان کا کوئی بھی تصور ہرگز قابل عمل نہ ہوتا اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس کا نتیجہ ہمارے لیے خوفناک تباہی کی صورت میں نکلتا۔ ممکن ہے وہ نظریہ درست ہو، ممکن ہے، وہ درست نہ ہو۔ یہ تو بعد میں ظاہر ہوگا۔ بہرحال یہ بات غیر ممکن تھی کہ اس تقسیم کے دوران، ایک یا دوسری ریاست کے اندر اقلیتوں کے معاملہ کو نظرانداز کر دیا جاتا۔ یہ سوال تو ناگزیر تھا۔ اب اس کا کوئی حل نہیں ہے، سوال یہ ہے کہ پھر ہم کیا کریں؟ پاکستان کی عظیم ریاست کو اگر ہم آسودہ، خوشحال اور ثروت مند بنانا چاہتے ہیں تو ہمیں عوام کی فلاح پر تمام تر توجہ مرکوز کرنی پڑے گی اور ان میں بھی عام لوگوں بالخصوص نادار آبادی کی فلاح مقدم ہے۔ اگر آپ نے ماضی کی تلخیوں کو فراموش کر کے اور ناگواریوں کو دفن کر کے، باہم تعاون سے کام کیا تو آپ کی کامیابی یقینی ہے اگر آپ نے ماضی کی روش بدل دی اور آپس میں مل جل کر اس جذبہ کے ساتھ کام کیا کہ آپ میں سے ہر شخص خواہ وہ کسی بھی فرقہ سے ہو، خواہ ماضی میں آپ کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کچھ بھی رہی ہو۔ اس کا رنگ، ذات یا مسلک کچھ بھی ہو، وہ شخص اول و آخر اس ریاست کا شہری ہے اور اس کے حقوق، مراعات اور فرائض برابر کے ہیں، تو یاد رکھئے کہ آپ کی ترقی کی کوئی حد و انتہا نہ ہو گی۔

میں اپنی بات اس سے زیادہ شد و مد سے نہیں کہہ سکتا۔ ہمیں اسی جذبہ کے ساتھ کام شروع کرنا چاہئے اور وقت گزرنے کے ساتھ، اکثریتی اور اقلیتی فرقے، ہندو فرقے اور مسلمان فرقے کے یہ سارے امتیاز ختم ہو جائیں گے۔ کیونکہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان میں بھی آپ کے درمیان پنجابی، پٹھان، شیعہ، سنی اور بہت سے امتیاز اور ہندوؤں میں برہمن، وشنو، کھتری، اس کے علاوہ بنگالی اور مدراسی وغیرہ کے اختلاف موجود ہیں، اور اصل میں اگر مجھ سے پوچھیں تو میں یہی کہوں گا کہ ہندوستان کے لئے آزادی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی تھی، اور اگر یہ امتیازات نہ ہوتے تو ہم لوگ مدتوں پہلے آزاد ہو گئے ہوتے۔ کوئی طاقت کسی قوم کو اور وہ بھی چالیس کروڑ باشندوں کی قوم کو اپنا غلام بنا کر نہیں رکھ سکتی۔ کوئی فرق، آپ کو فتح نہیں کر سکتا اور اگر یہ حادثہ ہو بھی چکا تھا تو کسی بھی عرصہ کے لئے اپنا تسلط برقرار نہیں رکھ سکتا تھا۔ بشرطیکہ تفرقہ کی یہ صورت

نہ ہوتی۔ لہذا اس تجربہ سے ہمیں سبق سیکھنا چاہیے۔ آپ آزاد ہیں، آپ کاملاً آزاد ہیں کہ اپنے مندروں میں جائیں۔ آپ کو پوری آزادی ہے اپنی مساجد کا رخ کریں۔ یا پاکستان کی ریاست میں جو بھی آپ کی عبادت گاہیں ہیں، ان میں آزادی سے جائیں۔ آپ کا کوئی بھی مسلک، ذات یا مذہب ہو سکتا ہے۔ ریاست کے امور سے اس کا کوئی بھی تعلق نہیں۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، تاریخ سے ظاہر ہے کہ کچھ عرصہ پہلے برطانیہ میں بھی اس ملک کے حالات، ہندوستان کے موجودہ حالات سے کہیں بدتر تھے۔ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں ایک دوسرے پر عذاب توڑتے تھے۔ حتیٰ کہ اب بھی بعض ریاستیں موجود ہیں، جہاں کسی خاص طبقہ کے خلاف امتیاز برتا جاتا ہے۔ اور اس پر پابندیاں لگائی جاتی ہیں، خدا کا شکر ہے کہ ہم نے اپنا آغاز اس دور میں نہیں کیا۔ بلکہ ہم نے ابتدائے کار اس دور سے کی ہے، جب دو فرقوں کے درمیان کوئی تخصیص اور کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جاتا۔ ایک ذات یا ایک عقیدہ اور دوسری ذات یا دوسرے عقیدہ کے لوگوں میں کوئی تفریق نہیں کی جاتی۔ ہم اپنے معاملات کا آغاز اس بنیادی اصول کے ساتھ کر رہے ہیں کہ ہم سب ایک ریاست کے شہری ہیں اور برابر کے شہری ہیں۔ برطانیہ کے باشندوں کو وقت گزرنے کے ساتھ، حالات کے حقائق کا مقابلہ کرنا پڑا اور برطانوی حکومت کی جانب سے جو ذمہ داریاں اور فرائض ان پر عائد ہوتے تھے، ان سے عہدہ برا ہونا پڑا۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے، وہ اپنی ذمہ داریاں پوری کرتے گئے۔ آج آپ بجا طور پر کہہ سکتے ہیں کہ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ اپنا جداگانہ وجود نہیں رکھتے۔ موجودہ حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص برطانیہ کا شہری ہے، برابر کا شہری ہے اور سبھی افراد ایک قوم کے ارکان ہیں۔

میرا خیال ہے کہ اس حقیقت کو ہمیں بھی بطور مثال پیش نظر رکھنا چاہیے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہندو، ہندو نہیں رہیں گے اور مسلمان مسلمان نہیں رہیں گے، میں یہ بات مذہبی معنوں میں نہیں کہہ رہا ہوں، کیونکہ یہ تو ہر فرد کے نجی عقیدہ کا معاملہ ہے۔ بلکہ ریاست کے باشندے ہونے کی بنا پر سیاسی معنوں میں۔"

میں نے جان بوجھ کر بانی پاکستان کی 11 اگست 1947ء کا یہ طویل اقتباس اہل علم و دانش کے سامنے رکھا ہے۔ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ ہندوتوا کی سیاست کے بعد جناح کا ویژن تاریخ کے کٹہرے میں

ایک سچائی ثابت ہوا۔ تاہم دکھ کی بات یہ ہے کہ جناح کے پاکستان میں بھی فکری اور سماجی زوال بے مثال ہے۔ ہم اپنی محدود سی اقلیتوں کو بھی اچھی جمہوری ڈیل اور بھرپور سماجی تحفظ نہیں دے سکے۔

پارلیمانی کلچر اور مذہبی اقلیتیں

اگر آج پاکستان میں پارلیمانی آکائیوز کا کلچر ہوتا تو ہمارے پاس ممبران کا وہ کار جسٹر بھی ہوتا جس پر 10 اگست 1947ء کو پہلے جوگیندر ناتھ منڈل اور دوسرے نمبر پر قائداعظم محمد علی جناح نے دستخط کئے۔ 12 اگست 1947ء کو بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح کی صدارت میں بنیادی حقوق اور اقلیتی امور پر پہلی پارلیمانی کمیٹی بنی۔ اس کمیٹی کے کام سے یہ سامنے آیا کہ برہمن ہندو جو کہ پاکستان نیشنل کانگریس کی نمائندگی کرتے تھے، سیکولر ریاست کی طرف مائل تھے۔ یہ تاریخ ہماری قومی تاریخ سے اسمبلی کی کاروائیوں تک غائب ہے۔ تاہم مسلم لیگ کا میلان شودر اور دلت طبقات کے حقوق کی طرف تھا۔ اس امر کا اعتراف اور اظہار ہماری پارلیمانی کاروائی میں ملتا ہے۔ یہ بات 1956ء کے دستور میں طے ہوئی کہ چھوت چھات کا خاتمہ اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بنیادی حق ہوگا۔ جب دو نومبر 1953ء کو پاکستان کا نام باقاعدہ طور پر اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا گیا تو کم و بیش وہی پارلیمانی مباحث سامنے آئے جو مارچ 1949ء میں قرارداد مقاصد پر بحث کے دوران سامنے آئے تھے۔ تاہم قرارداد مقاصد میں مذہبی اقلیتوں کو آزادانہ طور پر اپنے مذہب کی تبلیغ و ترویج کا حق دیا گیا تھا جو کہ 1985ء میں جنرل ضیاءالحق کی چھتری تلے 8 ویں ترمیم کے ذریعہ چھین لیا گیا اور یہ 2010ء میں 18 ویں آئینی ترمیم کے ذریعہ واپس آیا۔ تاہم اس وقت تک سماج میں آزادانہ تبلیغ و ترویج کی گنجائش سکڑ کر صفر تک پہنچ چکی تھی۔ لیاقت نہرو پیکٹ اگرچہ ایگزیکٹو کی سطح پر ہوا تاہم اس کے بعد ہمیں ”لا اکراہ فی الدین“ کے سرکاری اشتہار نظر آئے اور یرغمال بچے اور عورتیں رہا ہوئیں۔ قیام پاکستان کے بعد بھی مذہبی اقلیتوں کے لئے جداگانہ طریقہ کار برقرار رکھنے پر بھی سیاسی اور پارلیمان تنازعات سامنے آگئے۔ دوسری دستور ساز اسمبلی میں سی گبن کو ڈپٹی اسپیکر بننے کا اعزاز حاصل ہوا، تاہم پارلیمنٹ میں ان کی تصویر 21 ویں صدی ہی میں لگ پائی۔ شاید ہم مذہبی اقلیتوں کے سیاسی اور پارلیمانی کردار کے اعتراف سے گریزاں ہیں۔

پہلے دستور میں تو مذہبی اقلیتیں کسی نہ کسی انداز میں موجود تھیں، تاہم 1962ء کی اسمبلی میں دیگر عقائد سے تعلق رکھنے والا ایک بھی ممبر پارلیمانی اداروں میں موجود نہ تھا۔ یہ روش 1969ء تک رہی۔ 1970ء میں بالغ رائے دہی پر ہونے والے انتخابات میں مذہبی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے اشخاص کی کامیابی انتہائی محدود تھی۔ جب اپریل 1972ء میں پاکستان کی اسمبلی نے کام کرنا شروع کیا تو اس میں واحد ایک راجہ تری دیو رائے تھے جن کا تعلق بدھ مت سے تھا۔ اس موقع پر اسلام اور نظریہ پاکستان سے وفاداری پر مبنی حلف آیا تو مولانا مفتی محمود نے اس کی مخالفت کی۔ بعد ازاں اقلیتوں کے لئے مخصوص نشستیں رکھی گئیں۔ 1985ء میں غیر جماعتی انتخابات کے موقع پر مذہبی اقلیتوں کے لئے جداگانہ انتخابات کا نظام رائج ہوا اور پورا ملک ان کے لئے حلقہ انتخاب تھا۔ 1985ء میں قومی اسمبلی میں عام نشستیں 207 اور خواتین کی نشستیں 20 تھیں جو آج بڑھ کر 272 عام اور خواتین کی 60 نشستیں ہو چکی ہیں۔ جبکہ مذہبی اقلیتوں کی نشستیں 1985ء سے آج تک 10 ہی ہیں جیسا کہ ان کی آبادی میں کوئی اضافہ ہی نہیں ہوا۔ ویسے اگر 2017 کی مردم شماری کے نتائج دیکھیں تو واقعی مذہبی اقلیتوں کی تعداد پاکستان میں کم ہو رہی ہے۔

مذہبی اقلیتوں کو سیاسی آزادیاں تو قانون اور آئین کے مطابق حاصل ہیں۔ آئین پاکستان کے کم از کم 17 آرٹیکل انھیں تحفظ دیتے ہیں کہ ان کے مذہب کے خلاف ان پر ٹیکس نہیں لگ سکتا، نہ ہی انہیں ان کے مذہب کے خلاف تعلیم دی جاسکتی ہے۔ لیکن زمینی حقائق مختلف ہیں۔

مساویانہ شہریت کا تقاضا

دنیا میں 54 سے زائد ممالک کے دساتیر میں مذہب کا ذکر ہے تاہم شہریت میں مساوات کا تصور بالکل وہی ہے جو بانی پاکستان نے اپنی 11 اگست 1947ء کی تقریر میں دیا تھا۔ ملازمتوں میں اقلیتوں کے کوٹہ سے پہلے بھی دیگر عقائد کے لوگ ملازم تھے۔ مخصوص سیاسی نشستوں سے پہلے بھی دیگر عقائد سے تعلق رکھنے والے افراد سینیٹر تھے آج ہماری قومی اسمبلی میں ایک اقلیتی رکن براہ راست رکن قومی اسمبلی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اقلیتی کوٹہ کی مساوات سے آگے بڑھ کر قدم ہے۔

آج پاکستان میں 11 اگست کو اقلیتوں کے قومی دن کے طور پر منایا جاتا ہے حالانکہ اس دن یہی پاکستان کی شہریت میں مساوات کے دن کے طور پر منایا جانا چاہیے۔

پاکستان کے دستور اور آئین کے مطابق مساویانہ شہریت پر مبنی سماج کی اچھی خاصی گنجائش موجود ہے۔ تاہم سماجی سطح پر تلخیاں بڑھ چکی ہیں۔ سندھ میں ہندو عقیدہ سے تعلق رکھنے والے اچھے خاصے لوگ ہیں اور 21 ویں صدی میں وہاں ایک براہ راست قومی اسمبلی، دو براہ راست ممبران صوبائی اسمبلی اور ایک خاتون سینیٹر براہ راست موجود ہیں۔ اس کی وجہ وہاں کی سیاسی جماعت کا میلان اور اقلیتوں کی نسبتاً مضبوط معیشت ہے۔ کرسچن آبادی کو ان کے تعلیمی اداروں اور ہسپتالوں کو قومیائے جانے کے بعد اچھا خاصا دھچکا لگا۔ آج بھی ان کی زیادہ تر آزمائشیں چرچ پراپرٹی پر قبضوں کے حوالے سے ہیں۔ پاکستانی سکھوں کے لئے کرتارپور کے بعد سیاسی اور سماجی فضا نسبتاً بہتر ہے۔

پارلیمان کا کردار

پاکستانی پارلیمنٹ نے اقلیتوں کے عصری مسائل کے حوالے سے بہت کم بحث و مباحثہ کیا ہے۔ اگرچہ سپریم کورٹ آف پاکستان اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے حوالے سے کبھی ایک اہم فیصلہ دے چکی ہے جس کا باقاعدہ مانیٹرنگ کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ تاہم باوجود کوششوں کے متروکہ وقف املاک کا آج تک کوئی سربراہ مذہبی اقلیتوں سے نہیں آسکا حالانکہ یہ لیاقت نہرو کے معاہدہ کی روح تھی اور سپریم کورٹ آف پاکستان بھی اس بابت رائے دے چکی ہے۔ اس طرح اقلیتوں کے حوالے سے حقوق کمیشن ایگزیکٹو کے دائرہ عمل میں ہے اور باوجود مطالبات کے کوئی آزاد کمیشن نہیں بنایا جاسکا۔ اس طرح مذہبی اقلیتوں کو جبری تبدیلی مذہب اور تعلیمی نصاب کے حوالے سے شکایات ہیں۔ پارلیمان جبری تبدیلی مذہب کا جائزہ لینے کے لئے پارلیمانی کمیٹی بنا چکی ہے جس کے نہ دانت ہیں نہ ہاتھ پاؤں۔ اس طرح اقلیتوں کے حوالے سے قانون سازی بھی مشکلات کا شکار ہے تاہم پرسنل لاء کے حوالے سے یہ مسائل ان مذاہب کے مختلف فرقوں کے مابین فکری تنازعات کی وجہ سے ہیں۔

پارلیمنٹ اور عدلیہ کے علاوہ ایگزیکٹو میں بھی وزارت مذہبی امور کا ایک اہم ترین حصہ بین

المذاہب ہم آہنگی ہے۔

اتنا کچھ کرنے کے باوجود بھی اگر مسائل جوں کے توں ہیں تو یہ اہل فکر کے لئے سوچنے کا وقت ہے کہ وہ کیا اقدامات اٹھائے جائیں کہ ہم اپنی 3 فیصد مذہبی اقلیتوں کو اچھی سیاسی و سماجی اور معاشی ڈِیل دے سکیں۔

یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ آج کی گلوبل دنیا میں انسانی حقوق کا کوئی بھی معاملہ کسی ملک کا اندرونی یا ذاتی معاملہ نہیں۔ عالمی نظام میں کوتاہیوں پر تنقید اور پابندیوں کا کلچر موجود ہے۔ پاکستان تو قائم ہی مسلمان اقلیتوں کے حقوق کے لئے ہوا تھا، کیا وجہ ہے کہ آج ہم اپنی محدود سی مذہبی اقلیتوں کو تحفظ اور پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم نہیں کر سکتے۔

مذہبی آزادی کا مسئلہ: مسلم مذہبی تحریکات کا کردار

شمس الدین شگری

پوری دنیا میں جب مسلم تحریکات اپنا سیاسی یا مذہبی ایجنڈہ پیش کرتی ہیں تو اپنے منشور میں مذہبی آزادی کے حوالے سے بھی موقف کو واضح کرتی ہیں۔ عام طور پہ یہ دیکھا گیا ہے کہ معاصر تحریکات اسلاف کے فقہی وتاریخی لٹریچر سے استفادہ کرتے ہوئے مذہبی آزادی کے حق میں رائے دیتی ہیں۔ لیکن یہ ان تحریکات کا معاملہ ہے جو مسلح جدوجہد پر یقین نہیں رکھتیں اور ایک پرامن تحریکی سعی کرتی ہیں۔ جبکہ بعض جماعتیں ایسی بھی ہیں جو مذہبی آزادی کے حوالے سے یہ موقف نہیں اپناتیں۔ اس ضمن میں ان کے اپنے دلائل اور فکری مناہج ہیں۔ زیرنظر مضمون میں مسلم معاصر تحریکات کے لٹریچر سے مذہبی آزادی کی حدود و حیثیت کو واضح کیا گیا ہے۔ مضمون نگار نوجوان عالم اور دانشور ہیں۔ان کی کتاب 'مذہبی انتہاپسندی:اسلامی انقلاب و حکومت اور جوابی بیانیہ' شائع ہوچکی ہے جو اپنے موضوع پہ ایک اہم دستاویز ہے۔

مذہبی آزادی کا مفہوم اور تاریخ

مذہبی آزادی کا مطلب ہے اپنی آزادانہ مرضی سے کسی بھی مذہب کو اختیار کرنا، ترک کرنا، کسی بھی مذہب کی تبلیغ کرنا اور اپنے مذہبی مراسم اور اعمال کی ادائیگی کی مکمل آزادی حاصل ہونا۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے متفقہ چارٹر میں مذہبی آزادی کو ہر انسان کا پیدائشی حق تسلم کیا گیا ہے۔ آج ہم جس مذہبی آزادی سے واقف ہیں انسان یہاں تک بہت طویل سفر کے بعد پہنچا ہے۔انسان کی معلوم تاریخ میں جن مختلف تہذیبوں سے ہم واقف ہیں اور جن کے بارے میں کچھ تاریخی شواہد موجود ہیں،ان کا سرسری مطالعہ کرنے سے ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ مختلف ادوار میں انسانوں کو مختلف طریقوں سے محکوم اور غلام بنایا گیا۔انسانوں کو مختلف قسم کے جبر میں جکڑا گیا۔انہی میں سے ایک جبر مذہبی، اعتقادی اور فکری جبر بھی ہے۔ جس مذہب، مسلک، اعتقاد اور فکر والے کو جہاں غلبہ ملا اس نے اپنے سے مختلف مذہب، اعتقاد اور فکر رکھنے والوں پر جبر کیا اور لوگوں کو اپنی مرضی سے مذہب

رکھنے یا مذہب تبدیل کرنے کی اجازت نہیں دی۔ اگرچہ استثنائی طور پر مذہبی آزادی کی کچھ جھلکیاں نظر آتی ہیں مگر جبر کا دور زیادہ نظر آتا ہے۔ خاص طور پر مذہب اور عقیدہ کے باب میں۔

ہمارے مذہبی اہل علم کا یہ دعوی ہے کہ اسلام سے قبل ہر جگہ مذہبی جبر کا دور دورہ تھا۔ مکہ میں لوگوں کو عقیدہ کی تبدیلی پر جبر و تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ یہی حال روم، ایران اور انڈیا میں غالب مذہب والوں کا اپنے مخالفین کا ساتھ تھا۔ ہجرت سے قبل اہل اسلام کے لئے عدم تشدد اور محض برداشت کا حکم تھا۔ مدینہ میں جا کر مسلمانوں کو اجازت ملی کہ اب وہ اپنے دفاع کے لئے اسلحہ استعمال کرنے میں آزاد ہیں۔

کیا اسلام نے مخالفین کو مذہبی آزادی فراہم کی ہے؟

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اسلام نے اپنے مخالفین کو مذہبی آزادی دی ہے یا پھر یہاں بھی مخالفین کو مذہبی آزادی سے محروم کیا گیا ہے۔ جمہور مسلم مفکرین، متکلمین اور فقہاء کا نقطہ نظر یہی ہے کہ اسلام میں مذہبی آزادی کا نہ صرف تصور ہے بلکہ اس کی بہت زیادہ حمایت پائی جاتی ہے۔ ان حضرات کے نزدیک قرآن مجید کی بیشمار آیات اور سیرت رسول سے مذہبی آزادی کی بھرپور حمایت ہوتی ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اسلام میں معروف معنوں میں مذہبی آزادی کا تصور نہیں ہے، خاص طور پر مذہبی آزادی کا جو تصور اب پایا جاتا ہے اس کی اسلام میں گنجائش نہیں۔ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے اسلام کے تصور جہاد، جزیہ اور قتل مرتد سے استدلال کیا جاتا ہے۔

جہاد کا مقصد

اسلام کے تصور جہاد پر بیشمار اعتراضات کئے جاتے ہیں، ان میں سے ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اسلام میں جہاد کا ایک مقصد کفار کو مسلمان کرنا بھی ہے۔ جہاد پر اس قسم کے اعتراضات کو سمجھنے اور ان کے جواب کے لئے ضروری ہے کہ علت قتال کو سمجھا جائے۔ مسلم فقہاء کے ہاں علت

قتال پر بہت مفصل بحث پائی جاتی ہے۔ اسلامی جہاد سے مذہبی جبر کا تصور صرف اسی وقت ابھرتا ہے جب صرف کفر کو علت قتال مانا جائے ورنہ جہاد کے تصور سے مذہبی جبر کی تائید نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے اپنی کتاب 'فقہ الجہاد' میں اس موضوع پر بہت تفصیلی بحث کی ہے اور امام شافعی کے تصور کی کمزوری کو بیان کرتے ہوئے امام شافعی کے ماننے والوں سے درخواست کی ہے کہ وہ اس معاملے میں جمہور علماء کی رائے کو اپنائیں تاکہ جہاد سے مذہبی جبر کے تصور اور ہمیشہ حالت جنگ میں رہنے کے تصور کا خاتمہ ہو سکے۔ اسی طرح اہل تشیع کے تصور جہاد کی ایک تعبیر بھی یہی سامنے آتی ہے۔ جمہور شیعہ فقہاء کے نزدیک جہاد ابتدائی کے لئے امام معصوم کی موجودگی اور اجازت ضروری ہے۔

ان حضرات کے خیال میں مرتد کی سزا سے مذہبی جبر کے تصور کی تائید ہوتی ہے، کیوں کہ مذہبی آزادی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ہر انسان کو جس طرح مذہب اختیار کرنے کی آزادی حاصل ہے اسی طرح مذہب کو ترک کرنے کا بھی اختیار حاصل ہے۔ اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر کی شق نمبر ۱۸ میں مذہب قبول کرنے اور ترک کرنے کو انسان کا بنیادی حق تسلیم کیا گیا ہے۔

معاصر اہل علم کے ہاں ارتداد اور جزیہ

اسی لئے دور جدید کے کچھ مذہبی اہل علم نے قتل مرتد کی سزا کا یا تو بالکل انکار کیا ہے یا پھر اس کی مختلف توجیہات پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً اس سزا کو قانون اتمام حجت سے مخصوص کرنا یا پھر ارتداد کو موجودہ دور کے تصور غداری سے تشبیہ دینا۔ یعنی جس طرح ملک سے غداری کی سزا ہے اسی طرح ارتداد بھی محض مذہب ترک کرنا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد بغاوت اور غداری ہے۔ علامہ رحمت اللہ طارق، ڈاکٹر حمید اللہ، مفتی ابوزہرہ مصری، راشد الغنوشی وغیرہ کا یہی موقف ہے۔

قتلِ مرتد کے ساتھ ساتھ جزیہ کے تصور کو بھی کچھ لوگ مذہبی آزادی کے خلاف سمجھتے ہیں، یعنی کسی انسان پر ایک مخصوص ٹیکس محض اس بنیاد پر عائد کرنا کہ وہ آپ کے مذہب پر نہیں ہے۔ جزیہ پر بھی دور قدیم سے لے کر آج تک بحثیں جاری ہیں۔ جزیہ ہے کیا؟ مقدار کتنی ہے؟ کن سے لیا

جائے گا؟ کیا ہر غیر مسلم پر لاگو ہوگا یا پھر صرف اہل کتاب اور شبہ اہل کتاب پر؟ مشرکین پر لاگو ہوگا یا پھر ان کو اسلام اور موت کے علاوہ کوئی آپشن نہیں ہے؟ نیز جزیہ کوئی ابدی قانون ہے یا پھر اس کا تعلق بھی قانون اتمام حجت سے ہے؟ مسلم فقہاء اور اہل دانش کی یہ متفقہ رائے ہے کہ جزیہ سے مذہبی جبر کا کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ مذہبی آزادی کی واضح مثال ہے۔ کیوں کہ اس صورت میں غیر مسلم کو اپنے مذہب پر رہنے کی مکمل آزادی ملتی ہے۔ اور جزیہ کا مقصد محض وہی نہیں ہے جو معروف ہے۔

جمہور فقہاء کا نقطہ نظر

بہر حال اسلام کی مجموعی تعلیم اور آزادی اور حریت سے متعلقہ آیات کو سامنے رکھا جائے تو جمہور فقہاء کے نقطہ نظر کی تائید ہوتی ہے۔ سورہ البقرہ کی آیت نمبر ۲۵۶، تو اس معاملے میں بہت واضح اور دوٹوک ہے اسی لئے جن اہل علم کے خیال میں علت قتال کفر ہے ان کے نزدیک یہ آیت منسوخ ہے۔ اسی طرح اور بھی بیشمار آیات ہیں جن میں جبراً کسی کو ایمان پر لانے کو خدائی اسکیم کے خلاف قرار دیا گیا ہے۔ لیکن یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ہمارے فقہاء عظام نے قرآن و سنت سے جب ان فروعی مسائل کا استنباط کیا تھا وہ دور سیاسی غلبے کا دور تھا اس لئے اس پر دور غلبے کی نفسیات کا اثر واضح نظر آتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ وہ دور سلطنتوں اور بادشاہتوں کا دور تھا، اس لئے آج کے جمہوری اور قومی ریاستوں کے عہد میں بہت سارے فروعی نکات ایسے ہیں جن پر مذہبی جبر کا اطلاق ہو سکتا ہے اور ان نکات کو مذہبی آزادی کے مفہوم سے متصادم قرار دیا جا سکتا ہے۔ جس دور میں غیر مسلموں کے یہ حقوق بیان ہوئے ہیں اس دور کے لحاظ سے یہ حقوق ایسے ہیں جس کی نظیر کہیں اور نہیں ملتی۔

راشد الغنوشی نے اپنی کتاب 'الدیمقراطیة و حقوق الانسان فی الاسلام' میں اسلام میں مذہبی آزادی کے تصور پر تفصیلی بحث کی ہے اور یہ دعوی کیا ہے کہ جدید اور معاصر مسلم مفکرین نے سورہ البقرہ کی آیت ۲۵۶ سے یہ بات متفقہ طور پر تسلیم کر لی ہے کہ اسلام کی رو سے عقیدہ اور مذہب کی آزادی انسان کا بنیادی حق ہے۔ جن مفسرین نے آیت قتال سے اس آیت کو منسوخ ہونا مانا ہے ان کی رائے مکمل طور پر غلط ہے۔ اس مقام پر غنوشی صاحب نے تفسیر المنار، تفسیر المیزان اور

تفسیر فی ظلال القرآن کے حوالے دیے ہیں۔[1]

اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق

ہمارے قدیم فقہاء اور جدید مسلم مفکرین نے ایک اسلامی معاشرہ یا اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق پر کافی سیر حاصل بحثیں کی ہیں۔ ان کے نزدیک غیر مسلموں کو اپنے مذہب اور عقیدہ اور مذہبی احکام پر عمل کرنے کی آزادی ہو گی۔ اس آزادی پر بھی اگرچہ کچھ حدود اور قیود ہیں۔ اسی طرح غیر مسلموں کو اپنے مذہب کی نشر و اشاعت اور حق تبلیغ کی آزادی بھی محدود ہو گی۔ اسی طرح ان کے سیاسی حقوق بھی مسلمانوں کے مقابلے پر محدود ہوں گے۔ وہ ملک کے اعلی عہدوں پر فائز نہیں ہو سکتے۔

محترم یوسف قرضاوی صاحب اپنی کتاب ''اسلامی معاشرے میں غیر مسلموں کے حقوق و فرائض،، میں غیر مسلموں کے مذہبی آزادی کے تحت لکھتے ہیں:

''اسلام کی جانب سے ذمیوں کو عطا کردہ حقوق میں آزادی کا حق بھی شامل ہے۔ ذمیوں کو جو آزادیاں دی گئی ہیں ان میں سر فہرست اعتقادات و عبادات کی آزادی بھی ہے۔ کسی بھی دین و مذہب سے تعلق رکھنے والا شخص اپنے عقیدہ پر کاربند رہ سکتا ہے اور اسے اپنا دین چھوڑ کر کوئی دوسرا دین اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا نہ ہی اس پر حلقہ بگوش اسلام ہونے کے لئے دباو ڈالا جا سکتا ہے۔۔۔۔ اسلام نے ہمیشہ غیر مسلوں کی عبادت گاہوں کی حفاظت کی اور ان کے مذہبی شعائر کا خیال رکھا ہے۔ یہاں تک کہ قرآن نے جن اسباب پر قتال کی اجازت دی ہے ان میں آزادی عبادت کی حفاظت کو بھی شامل کیا ہے۔۔۔۔ اسلام غیر مسلموں سے صرف اس قدر مطالبہ کرتا ہے کہ وہ مسلمانوں اور ان کی حرمات کا خیال رکھیں۔ اس لئے اپنے مذہبی شعائر اور صلیبوں کا ممالک اسلامیہ میں مظاہرہ نہ کریں اور کسی ایسے شہر میں جہاں پہلے گرجا گر موجود نہ ہو نئے گرجا گر تعمیر نہ کریں مبادا

1 راشد الغنوشی، الدیمقراطیۃ و حقوق الانسان فی الاسلام، ص ۱۸۱، ۱۸۰

کہ مسلمانوں کے احساسات وجذبات سے بے پروائی کا تاثر پیدا ہو۔۔"[2]

مذکورہ بالا عبارت میں جس مذہبی آزادی کا ذکر ہے وہ سلطنتوں اور بادشاہتوں کے دور کے حساب سے بہت اعلی اور متاثر کن ہے مگر آج کے دور میں اور آج کے دور کے تصور مذہبی آزادی کی رو سے اس پر بہت سے اعتراضات وارد ہوتے ہیں اور مذہبی آزادی کے دور حاضر کے تصور سے متاثرین کے لئے اس میں کوئی خاص کشش نہیں ہے۔

اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حق تبلیغ سے متعلق سید ابوالاعلی مودودی مرحوم کا نقطہ نظر بھی ملاحظہ فرمائیں۔ سید صاحب، رسائل ومسائل جلد چہارم میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"جہاں تک غیر مسلموں کی تبلیغ کا معاملہ ہے اس کے بارے میں یہ خوب سمجھ لینا چاہئے کہ جب تک ہم بالکل خود کشی کے لئے ہی تیار نہ ہو جائیں ہمیں یہ حماقت نہیں کرنی چاہیے کہ اپنے ملک کے اندر ایک طاقتور اقلیت پیدا ہونے دیں جو غیر ملکی سرمایہ سے پرورش پائے اور بڑھے اور جس کی پشت پناہی بیرونی حکومتیں کر کے ہمارے لئے وہی مشکلات پیدا کریں جو ایک مدت دراز تک ترکی کے لیے عیسائی اقلیتیں پیدا کر رہی ہیں"۔[3]

اسی طرح رسائل ومسائل جلد اول میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے سید صاحب غیر مسلموں کے لیے تبلیغ کی تین شکلیں بیان کرتے ہیں: ایک یہ کہ اپنے عوام کے لیے اپنے مذہب کی تعلیم، یہ حق تمام مذاہب کو حاصل ہوگا۔ دوسری شکل یہ کہ دوسرے مذاہب والوں کے سامنے اپنے مذہب کی تبلیغ اور دیگر مذاہب سے اپنے اختلافات کو علمی حیثیت میں پیش کرنا، اس کی بھی اجازت ہوگی، مگر کسی مسلمان کو اسلامی ریاست میں اپنے دین کی تبدیلی کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس کے بعد تیسری شکل کے تحت لکھتے ہیں:

---

2 یوسف القرضاوی، اسلامی معاشرے میں غیر مسلموں کے حقوق وفرائض، ترجمہ، قیصر شہزاد، ص ۲۱تا۲۴

3 مودودی، سید ابوالاعلی، رسائل ومسائل، ج، چہارم ص ۴۶۱

"تیسری شکل یہ ہے کہ کوئی گروہ اپنے مذہب کی بنیاد پر ایک منظم تحریک ایسی اٹھائے جس کی غرض یا جس کا حال یہ ہو کہ ملک کا نظام زندگی تبدیل ہو کر اسلامی اصولوں کے بجائے اس کے اصولوں پر قائم ہو جائے۔ایسی تبلیغ کی اجازت ہم اپنے حدود اقتدار میں کسی کو نہیں دیں گے"۔ [4]

یہ جدید دور کے دو عظیم مسلم مفکرین کی رائے ہے جس سے بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ ان حضرات کے فہم اسلام کی رو سے غیر مسلموں کو کتنی مذہبی آزادی حاصل ہے اور ان کو ان کے مذہب کی وجہ سے کون سے مذہبی اور سیاسی حقوق حاصل ہوں گے۔ یہ صرف اسلامی نظام یا اسلامی ریاست سے متعلق بات نہیں ہے بلکہ تمام نظریاتی ریاستوں کی یہی حالت ہے۔ان ریاستوں میں غیر نظریاتی لوگوں اور گروہوں کو یا تو برداشت ہی نہیں کیا جاتا یا پھر ان کو نظریاتی ریاست کے طے کردہ حدود وقیود میں رہنا ہوتا ہے۔ جس میں ان لوگوں کے کافی حقوق متاثر ہوتے ہیں۔

جدید مسلم تحریکات

اس وقت دنیا میں موجود اکثر اسلامی تحریکات کا موقف وہی ہے جو ہمارے قدیم فقہی ذخیرے میں بیان ہوا ہے۔ ان کے نزدیک غیر مسلموں کو ایک اسلامی معاشرے یا ریاست میں دوسرے درجے کے شہری کی حیثیت سے رہنا ہوگا۔ دوسرے درجے کے شہری کا مطلب ہے کہ ان کو وہ تمام مذہبی اور سیاسی حقوق حاصل نہیں ہوں گے جو خود مسلمانوں کو مذہب کی وجہ سے حاصل ہوں گے۔ البتہ دیگر شہری اور انسانی حقوق ان کو ملیں گے۔ البتہ جدیدیت کے علمبردار اور قدیم تعبیرات سے اختلاف رکھنے والی تحریکات اور مفکرین کا نقطہ نظر اس حوالے سے بالکل مختلف ہے۔ ان حضرات کے نزدیک موجودہ تصور مذہبی آزادی نہ صرف اسلام سے متصادم نہیں ہے بلکہ یہ عین اسلامی ہے۔

ان اسلامی تحریکات میں سے ایک تحریک کا موقف پیش خدمت ہے جن کے نزدیک مذہبی آزادی کا وہ مفہوم ہی درست ہے جو قدیم فقہ میں موجود ہے۔ان کے نزدیک اسلام قبول کرنے کے

---

4 ایضا، ج ا، ص ۲۷۰، ۲۶۹

معاملے میں جبر سے کام نہیں لیا جائے گا۔ غیر مسلموں کو یا تو اسلام قبول کرنا ہو گا یا پھر جزیہ دے کر مسلمانوں کے ماتحت رہنا ہو گا۔ اس صورت میں بھی ان کو وہ مکمل مذہبی آزادی نہیں ملے گی جس کا تصور اقوام متحدہ کے منشور میں دیا گیا ہے اور آج کے دور میں جس کو مذہبی آزادی کے نام سے ہم جانتے ہیں۔ یہاں تحریک طالبان پاکستان کا موقف پیش خدمت ہے۔

تحریکِ طالبان پاکستان کا موقف

تحریک طالبان پاکستان کا دعوی ہے کہ وہ پاکستان سے غیر اسلامی نظام کو ختم کر کے حقیقی اسلامی نظام کے قیام کے لئے سر گرم عمل ہے، اس لئے ان کا غیر مسلموں کے مذہبی آزادی سے متعلق موقف جاننا ضروری ہے۔ تحریک طالبان پاکستان اپنا رشتہ فقہ حنفی سے جوڑتے ہیں اس لئے ان کے موقف سے اس نوع کی باقی تحرکات کے موقف کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ریاست پاکستان نے مذہبی انتہا پسندی اور فرقہ وارانہ تشدد کے سد باب کے لئے پیغام پاکستان نامی ایک متفقہ دستاویز تمام مکاتب فکر کے علماء کے فتوی پر مبنی شائع کیا ہے۔ تحریک طالبان پاکستان نے اس کا مفصل جواب بعنوان 'پیغام پاکستان شریعت کی عدالت میں' لکھا ہے۔ ۱۹۱ صفحات پر مشتمل اس کتاب کے صفحات، ۱، ۳۶، ۳۵، ۸۴، ۹۵، ۱۲۴، ۱۳۹، ۱۸۴، اور ۱۸۵ پر غیر مسلموں کے حقوق، غیر مسلموں کے لئے مذہبی آزادی، اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے منشور میں مذہبی آزادی کی شق پر بحث موجود ہے۔

کتاب کے مترجم ابو محمد عبد الرحمان حماد ص ا پر لکھتے ہیں:

"کفار کے لئے قرآنی قانون یہ تھا کہ وہ مسلمان ہو جائیں، اگر مسلمان نہیں ہوتے تو قرآن کے سایہ میں زندگی گزارنا قبول کریں ورنہ جنگ کے لئے تیار ہو جائیں"۔ [5]

ان حضرات کے نزدیک غیر مسلموں کو زندہ رہنے اور اپنے مذہب پر عمل پیرا رہنے اور محفوظ

5 شیخ خالد حقانی، پیغام پاکستان شریعت کی عدالت میں

رہنے کی ایک ہی صورت ہے کہ وہ اسلامی ریاست میں بطور ذمی رہیں۔اس صورت میں انہیں اپنے مذہب پر عمل کرنے کی آزادی ہو گی مگر مکمل مذہبی حقوق حاصل نہیں ہوں گے۔ کیوں کہ اپنے مذہب پر رہنے اور عمل کرنے کے لئے انہیں ایک خاص ٹیکس دینا ہو گا۔[جزیہ کی مکمل بحث اور اس کی جملہ تفصیلات میں قدیم فقہاء کا آپس میں اور جدید اہل علم کا آپس میں اور قدیم فقہاء سے اختلافات ہیں۔اس کا ایک ہی متعین مفہوم اور متفقہ اطلاق نہیں پایا جاتا]

اسی طرح شیخ خالد حقانی آگے چل کر اقوام متحدہ کے منشور میں درج تصور مذہبی آزادی پر بہت سخت تنقید کرتے ہوئے اسے اسلام سے متصادم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آج پاکستان جس معاہدے کے تحت وقت گزار رہا ہے اس میں اقوام متحدہ کا منشور تسلیم کرنا ہے جبکہ اس کے متعدد جانب ہیں[حقوق انسانی کا چارٹر] جو کسی بھی صورت اسلامی نہیں، بلکہ بعض انسانی حقوق صراحتا کفر ہیں، اور بعض کو تسلیم کرنے کی صورت میں مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنا اور انہیں مختلف ناموں سے تقسیم کرنا لازم آتا ہے۔اسی معاہدے کے تحت مذہبی آزادی بھی آتی ہے جو خالصتا غیر اسلامی [کفری] ہے، چونکہ اس میں ہر کسی کو کفر اختیار کرنے کی اجازت دی گئی ہے، لہذا اس معاہدے کا اعتبار نہین ۔۔۔اور ساتھ میں غیر مسلموں سے جزیہ کی وصولی پر بھی پابندی لگائی گئی ہے، چناچہ آرٹیکل ۲۱ میں ہے"۔[6]

اس مقام پر فاضل مولف نے اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے منشور سے شق ۱۸ اور شق ۲۱ کو پیش کیا ہے موصوف کے نزدیک یہ دونوں شقیں اسلامی تعلیمات سے متصادم ہیں بلکہ کفریہ دفعات ہیں۔اس کے بعد اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"حالانکہ اسلام نے کبھی بھی اسلامی ریاست میں کفار کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ اپنے دین کی طرف دعوت دیں ، بلکہ امام ابو بکر جصاص رحمہ اللہ نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ جب فرق باطلہ اپنے دین کی طرف دعوت دینا شروع کریں تو انہیں قتل کیا جائے گا، لیکن آج پاکستان

---

[6] ایضا، ص ۸۴، ۸۵

میں بین الاقوامی معاہدوں کی وجہ سے عیسائیوں اور دیگر غیر مسلموں کے چینل اور دیگر مشنری ادارے موجود ہیں"۔[7]

تحریک طالبان کے خیال میں پاکستان میں موجود غیر مسلموں کو جو آزادیاں حاصل ہیں، ان سے جو جزیہ وصول نہیں کیا جارہا، ان کو اپنے مذہب کی تبلیغ کی جو اجازت ہے، مرتد مسلمان کو سزائے موت نہیں دی جارہی تو یہ سب غیر اسلامی امور ہیں اور اس کی وجہ پاکستان کا غیر اسلامی ریاست ہونا اور اقوام متحدہ کے کفریہ منشور کو تسلیم کرنا ہے۔

اس قسم کی تنظیموں اور تحریکات کے علاوہ جو سیاسی مذہبی تنظیمیں ہیں ان میں بھی غیر مسلموں کے مسلمہ حقوق کی پامالی کے حوالے سے کسی قسم کی حساسیت نہیں پائی جاتی۔ ان کے حقوق کے لئے کہیں سے کوئی آواز بلند نہیں ہوتی۔ بلکہ جب ان میں سے کسی کا کوئی کیس سامنے آتا ہے تو ان تنظیموں کا رویہ نہایت عجیب وغریب ہو جاتا ہے۔ مسیحیوں اور ہندووں کے حوالے سے اگرچہ سب مانتے ہیں کہ غیر مسلم اقلیت ہونے کی وجہ سے ان کے حقوق ہیں مگر ان کے حقوق کی پامالی پر کوئی موثر آواز نہیں اٹھتی۔

[7] ایضا، ص ۸۵

اہل تصوف متشدد کیوں بنے؟

صاحبزادہ امانت رسول

مسلم تاریخ میں صوفیاء کرام کا یہ وصف رہا ہے کہ انہوں نے ہمیشہ خود کو معاشرتی اخلاقی اصلاح کے ساتھ جوڑے رکھا۔ حتی کہ تاریخ کے ایسے نازک ادوار میں بھی کسی بھی انقلابی یا سیاسی تحریک کا حصہ نہیں بنے اور خود کو صرف مسلمانوں کی روحانی تربیت میں مشغول رکھا۔ خصوصا برصغیر میں تو اہل تصوف کا یہ وصف زیادہ گہرائی کے ساتھ نظر آتا ہے۔ لیکن حالیہ کچھ عرصے سے پاکستان میں سلسلۂ تصوف سے تعلق رکھنے والے مکتب فکر نے ایک تحریک کا آغاز کیا جو اہل دانش کے لیے کافی حیران کن چیز تھی۔اس نئے رجحان پر بہت سے مباحث ہوئے اور آراء دی گئیں کہ اس ارتقاء کا کیا فکری پس منظر ہے اور کیا عوامل پوشیدہ ہیں۔ مضمون میں بھی اسی پہلو سے جڑے کچھ عوامل کا ذکر کیا گیا ہے۔ صاحبزادہ امانت رسول 'ادارہ فکرِ جدید' کے سربراہ ہیں۔ سماجی موضوعات پر لکھتے رہتے ہیں اور نوجوان نسل کی شعوری و فکری تربیت کے لیے ورکشاپس کا انعقاد کرتے رہتے ہیں۔

اہل تصوف کا نیا کردار

علمی اور مذہبی حلقوں میں ایک سوال کئی سالوں سے جواب کی تلاش میں ہے۔وہ سوال یہ ہے کہ صوفیاء کرام کو ماننے،اُن سے تعلق رکھنے اور اُن کی تعلیمات کا دم بھرنے والوں میں تشدد اور اپنے مطالبات منوانے کے لیے سڑکوں کو بلاک کرنا،دھرنا اور احتجاج کا رویہ کیوں اور کیسے پیدا ہوا؟

گزشتہ سالوں میں سب سے زیادہ احتجاجی مظاہرے،احتجاجی جلسے اور جلوس انہی طبقات کی طرف سے نکالے گئے۔اس سوال کا جواب ماضی قریب و بعید میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔تاریخ کے عمل یا جبر کے سامنے افراد ہی نہیں بلکہ اقوام کو بھی سر جُھکانا پڑتا ہے۔اگر ایسا نہیں تو پھر نتائج بہت بھیانک نکلتے اور سب کو اُن کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

نواز شریف کے دورِ حکومت میں پیدا ہونے والی صورت حال میں اُن عوامل کا ہاتھ خصوصی تھا جو پرویز مشرف کے خلاف پُر تشدد واقعات میں استعمال ہوئے ۔پرویز مشرف دور میں، مذہبی راہنماوں نے پنجاب میں وزیر اعلیٰ پنجاب چوہدری پرویز الٰہی کو پریشان کیے رکھا۔ مذہب کے نام پہ نکلنے والے جلوسوں سے براہ راست فائدہ مخالف سیاسی جماعت مسلم لیگ ن کو ہوا۔ایسے ماحول میں وہ افراد جو پرویز الٰہی اور پرویز مشرف حکومت کے خلاف استعمال ہوئے،انہوں نے ردّ عمل میں نواز شریف حکومت کے خلاف دھرنے دیئے اورانہی جذبات سے دیگر فیصلے بھی کیے۔یہ ماضی قریب کی وہ حقیقت اور شہادت ہے جسے جھٹلانا ناممکن ہے۔ گویا یہ تحریک در حقیقت اُن کے خلاف ایک رد عمل تھا جنھوں نے اِنہیں "پرویزین" کے خلاف اور نواز شریف کے حق میں استعمال کیا۔نواز دورِ حکومت میں مذہبی کارڈ اسی طرح ان کے خلاف استعمال ہوا جیسے پرویز مشرف کے خلاف استعمال ہوا،اسی طرح پُر تشدد مظاہرے ہوئے اور ملکی املاک کو نقصان پہنچایا گیا جیسے پرویز مشرف دور میں پہنچایا گیا،اسی طرح جانی نقصان ہوا جیسے پرویز مشرف دور میں ہوا۔ یہاں ایک قدم آگے بڑھ کر مسلم لیگی راہنماوں کی سر عام بے عزتی کی گئی جس میں نواز شریف صاحب بھی شامل ہیں اور اُن کی توہین اُس مقام پہ کی گئی جہاں بے عزتی کرنا در حقیقت کہانی کا کلائمکس تھا۔پرویز مشرف پہ شاید ختم نبوت کی شق میں ترمیم کا الزام نہ ہو لیکن یہ الزام بھی نواز شریف پہ لگایا گیا لہٰذا یہ وہ حساب کتاب تھا جو ماضی قریب سے متعلق تھا جسے اِس طرح چُکا دیا گیا۔

موّرخ جب بھی معاصر پاکستانی سیاست میں مذہبی منافرت کے استعمال اور اہل تصوف کے کردار کی تاریخ لکھے گا اس پس منظر کا ذکر ضرور کرے گا کیونکہ ان عوامل، جذبات اور عناصر کا ذکر کیے بغیر اہل تصوف میں تشدد کی سوچ اور رویوں کی حقیقی تفہیم ناممکن ہے۔

احساسِ محرومی اور احساسِ تفاخر

اگر اہل تصوف کے اس نئے کردار کا بغور تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دراصل ایسی جماعتوں اور تحریکوں کی پیش قدمی میں احساسِ محرومی اور احساسِ تفاخر، دونوں احساس اہم کردار ادا

کر رہے ہیں۔ یہ عجیب سی بات ہے کہ یہ دونوں احساس متضاد ہیں لیکن دونوں بیک وقت موجود بھی ہیں۔ یہ ایک دوسرے کو مہمیز کرتے ہیں۔ احساسِ تفاخر سے یہ سوچ پیدا ہوتی ہے کہ ہم اعلیٰ، ارفع، برتر اور بہترین ہیں۔ ہم سوادِ اعظم اور بہت بڑی اکثریت ہیں۔ پھر ساتھ ہی جب معاشرے پر اپنے پھیلاو اور کنٹرول کو دیکھتے ہیں تو احساسِ محرومی پیدا ہوتا ہے کہ ہم سے اقلیت اور کم افرادی قوت کے مالک سیاستدان بھی مضبوط ہیں اور ان کی جڑیں معاشرے میں بھی مستحکم ہیں۔ ملک کے وسائل اور اختیار کے حصہ دار بھی بنے بیٹھے ہیں۔ ایک طرف سوادِ اعظم کا احساس دوسری طرف اُس حساب سے حصہ نہ ملنے کا دکھ۔ ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ ہمارے مسلک کے ووٹوں سے سیاستدان حکمران بنتے آئے ہیں۔ ان حکمرانوں نے نفاذ اسلام کے وعدے بھی کبھی پورے نہیں کیے لہذا جب عوام بھی ہمارے، پاکستان کے خالق بھی ہم اور اکثریت بھی ہماری، تو پھر ہم کیوں نہ سیاست کریں اور اقتدار حاصل کریں۔

اس احساس محرومی میں اپنے ماضی کے اکابر سے شکوہ بھی ہے کہ انہوں نے ''سوادِ اعظم'' کو متحد کرنے کے بجائے اپنی پارٹی کی سیاست کی، مسلک و مشرب کی سیاست نہیں کی۔ گویا اس احساس میں عدم اطمینان بھی شامل ہے۔ اِس طبقے کا یہ بھی موقف ہے کہ پاکستان میں خانقاہیں اور مزارات موجود ہیں۔ علماء کرام کی بڑی تعداد موجود ہے۔ ان سے وابستہ عوام کی بھی بہت بڑی تعداد ہے۔ ان دو طبقوں (علماء و مشائخ) نے ہمیشہ عوام کو لوٹا ہے۔ انہوں نے نذرانے، چندے، زکوٰۃ اور خیرات جمع کیے، اپنا اور اپنے خاندان کا صرف سوچا ہے۔ اس احساس میں اپنے اکابر کے طرز سیاست پہ عدم اطمینان اور اس میں بغاوت کا عنصر بھی شامل ہو جاتا ہے۔ ان کے خیال کے مطابق، اگر ہم مسلک و ہم فرقہ منتشر و متفرق ہیں، کمزور اور بے مایہ ہیں تو اس میں بنیادی وجہ حقیقی قیادت کا فقدان ہے۔ ایسی قیادت جو صرف اور صرف مسلک کے مفاد کو دیکھے اور اپنا سب کچھ قربان کر دے۔ خواہ وہ اپنی ذات ہو یا بچے گھر ہو یا کاروبار۔ اس حوالے سے صحابہ کرام کے واقعات و حالات کثرت سے سنائے اور بتائے جاتے ہیں۔

توہین رسالت کا سلسلہ ڈنمارک سے شروع ہوا اور فرانس تک پہنچا۔ ڈنمارک کا واقعہ مشرف

دور میں ہوا اور فرانس کا مسئلہ نواز شریف دور میں شروع ہوا۔ جن کے جذبات کا استحصال مشرف دور میں ہوا، وہ اب نواز دور میں اس سے بڑھ کر اظہار کرنے کے حق میں تھے اور انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا۔ عمران خان صاحب کے دور اقتدار میں بھی ایسا دلخراش واقعہ ہوا۔ یہ واقعہ خاص مسلک و فرقہ کے عوام کو متحد کرنے میں اہم سنگ میل ثابت ہوا۔ جلسے، جلوس، مظاہرے اور دھرنوں نے ان کے لیے سیاست کی راہ کو بھی آسان کر دیا۔ اس بنیاد پہ ''دین کو تخت پہ لانے'' کا نعرہ بھی لگا دیا گیا۔ اس سے پہلے نظام مصطفےٰ، نفاذ اسلام، مصطفوی انقلاب کی اصطلاحات بھی متعارف کروائی گئی تھیں۔ میری طرح بہت سے لوگوں کو یقین محکم ہے کہ گزشتہ ادوار میں مختلف اصطلاحات متعارف کروانے والوں کو اپنی اصطلاحات کا کسی نہ کسی حد تک شعور و ادراک بھی تھا اور وہ اس راستے کو جانتے بھی تھے لیکن موجودہ اصطلاح متعارف کرانے والوں کے جذبات تو قابل احترام ہیں لیکن یہ کام جذبات کے ساتھ بصیرت، طریقہ کار اور Social Dynamics کے سمجھنے کا بھی ہے۔ اسلام اقتدار اور قوت نافذہ کے ذریعے آتا ہے یا اس کا چشمہ سماج میں سے پھوٹتا ہے۔ کیا ان تقاریر سے لوگوں میں کوئی تبدیلی رونما ہوئی؟ کیا معاشرہ اخلاق و کردار میں بہتر ہوا۔ ان کا خیال ہے کہ پاکستان کی اکثریت مسلمان اور عاشق رسول ہے جیسے ہم برسر اقتدار آئیں گے پاکستان کے تمام معاملات دین کے مطابق ڈھلتے چلے جائیں گے۔

موجودہ نسل کے برعکس اکابر علماء کرام کا علمی مقام اور سیاسی بصیرت کو زمانہ تسلیم کرتا ہے۔ انہیں عالمی سیاست سے بھی واقفیت تھی اور سیاست میں توسُّع کے قائل بھی تھے۔ وہاں جذبات تھے تو ذہانت و فطانت بھی تھی۔ وہاں محرومیوں اور تفاخر کا احساس بھی نہیں تھا۔ وہ بند گلی میں نہیں شاہراہ سیاست پہ سفر کرتے تھے۔ مسلکی سیاست کے اپنے مختلف فیہ پہلو ہیں لیکن وہ کسی حد تک توازن پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ سیاسی اور سماجی حرکیات سے کسی حد تک واقفیت بھی رکھتے تھے۔

تاریخی آبیاری

اگر ہم خاص مسلک سے تعلق رکھنے والے گروہ میں پھلنے پھولنے والے رویوں اور رجحانات کا جائزہ ماضی بعید میں دیکھتے ہیں تو اس بیج کی آبیاری سال ہا سال سے ہو رہی تھی لیکن پھل اپنے وقت پر

پک چکا ہے یا اُس کو کھانے کا وقت اب آیا ہے۔ گزشتہ صدی میں چند کلامی مسائل سے بحث شروع ہوئی۔ یہ بحث تکفیر سے ہوتی ہوئی برصغیر میں مسلمانوں کی تفریق و تقسیم پر منتج ہوئی۔ جس میں محبت رسول، عشق رسول اور حرمت رسول کا عنوان غالب رہا ہے ۔اِسی بحث واختلاف کے نتیجے میں، مختلف مدارس بھی وجود میں آئے۔ان مدارس میں مخالف فرقے کی باقاعدہ تکفیر، تفسیق و تضلیل کی تربیت دی جانے لگی۔ کہیں مناظرہ کے نام پہ اور کہیں علم مناظرہ کے نام پہ۔جب یہ تربیت یافتہ افراد معاشرے میں آئے تو اِن کی آواز اس لئے بھی توانا تھی کہ اِن کے ہاتھ میں ''محبت رسول''کا علم تھا۔اطاعت رسول اور اتباع رسول سے زیادہ طاقت اور قوت پہلے نعرے میں تھی۔فرقہ واریت کی وجہ سے یہ نقصان ہوا کہ محبت رسول کا بہت چرچا ہوا لیکن امت کی زندگی اطاعت رسول کی جھلک سے محروم ہوتی گئی۔صورت حال یہ ہے کہ امت کے فرد کو بتانا پڑتا ہے کہ میں بے شک ان سے سیاسی یا مذہبی اختلاف رکھتا ہوں لیکن رسول اللہ سے محبت کرتا ہوں۔

ایسا نہیں ہے کہ اس کی جڑیں صرف گزشتہ صدی میں ہیں بلکہ اس سے بھی پیچھے چلے جائیں تو ایک حوالہ ہمیں مولانا فضل حق خیر آبادی کا بھی ملتا ہے۔ جنہوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی اور اسی میں انہیں پھانسی دے دی گئی۔یہ ایسا واقعہ ہے جس کا حوالہ تقاریر میں ضرور دیا جاتا ہے۔

ہمارے ہاں خاص طور پر پاکستان کے حکمرانوں کے بارے میں یہ تاثر موجود ہے کہ ان کا اقتدار در حقیقت انگریز کے تسلط کا تسلسل ہے۔ہم نے گورے سے نجات پالی لیکن کالے انگریز سے نجات نہیں پاسکے وہ اپنی ذریت یہاں چھوڑ کر گئے۔اب یہ علیحدہ بحث ہے۔وہ کیا چھوڑ کر گئے، وہ ان کی ذریت اور اولاد ہے یا وہ کچھ اور چھوڑ کر گئے۔اس وقت یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔یہ وہ جذبہ ہے جو خود سوالات اٹھاتا اور خود ہی جواب دیتا ہے۔خود ہی سازشی تھیوری سوچتا اور خود ہی رد عمل دیتا ہے۔یہ خود ایوان اقتدار سے امیدیں وابستہ کرتا اور خود ہی مایوس ہو جاتا ہے۔یہ حکمرانوں سے متعلق اسلام مخالف نظریات کو منسوب کرتا اور خود ہی اس کے خلاف اُٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ کبھی یہ سیاستدانوں کے ہاتھ کا کھلونا اور کبھی ان کے خلاف سیسہ پلائی دیوار بن جاتا ہے۔

چند سالوں میں پاکستان کے اندر پیدا ہونے والی صورت حال کے یہ چند عوامل ہیں۔آپ جب

بھی ایسی کسی جماعت اور گروہ پہ بات کریں گے یا لکھنا چاہیں گے تو ایسے پس منظر سے کبھی نظر نہیں ہٹا سکیں گے۔ اگر صرف نظر کریں گے تو آپ پھر موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کر پائیں گے۔

تبدیلی کے مراحل

اب آیئے اس بات کی طرف کہ یہ لوگ صوفیاء کو ماننے والے ہیں۔ یا اس مسلک کا تعلق صوفیاء کرام کے ساتھ ہے۔ صوفیاء کی تعلیم صبر و برداشت ،توکل و فقر کی تعلیم ہے۔ صوفیاء کے نزدیک سب انسان برابر ہیں خواہ اس کا کوئی بھی مسلک و مشرب ہو یا وہ کسی بھی رنگ، نسل اور ذات سے تعلق رکھتا ہو۔ صوفیاء کرام کے دروازے نیک و بد، خوش خصال و بد خصال سب کے لیے ہمیشہ کھلے رہے ہیں۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ بجا ہیں لیکن اس سے پہلے خود تصوف پہ گزرنے والے تین مراحل پہ بات کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک مرحلہ صحابہ و تابعین کا زمانہ جس میں عملی زندگی میں للہیت و اخلاص کا ظہور ہوا۔ یہ اسلام کا ابتدائی اور حقیقی دور ہے۔ دوسرا مرحلہ ترک دنیا سے اعلیٰ اوصاف کا ظہور کہ اصل مرض کا سبب حب دنیا ہے لہٰذا للہیت و اخلاص کے حصول کا راستہ ترکِ دنیا ہے۔ تیسرا مرحلہ یہ آیا کہ تصوف صرف اور صرف چند خاص رسم و رواج کا نام بن کر رہ گیا۔ یہ تین مرحلے اور زمانے تاریخ تصوف میں بیان کیے جا سکتے ہیں۔

آج تصوف اور اس کے ماننے والے تیسرے دور سے گزر رہے ہیں۔ اس لیے سیاست و مسلک میں اس کی ترجیحات بدلی دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں ہمیشہ مروّجہ طرز عمل کو دیکھ کر خود کو ڈھالا جاتا ہے ۔ایسے حالات میں صرف ان رجحانات سے استفادہ کیا جاتا ہے جو جماعت کو موجودہ Scenario میں ایک جُدا مقام دلا سکے۔ صوفیاء کرام کے ہاں خواب و الہام کی اہمیت و مرتبہ ہے لہٰذا صوفیاء کرام کا دم بھرنے والوں نے خواب و الہام کی خوب تشہیر کی۔ صوفیاء کرام میں کرامات کا ایک سلسلہ ہے، کرامات سے بھی اپنے قد کو اونچا کیا جاتا ہے۔ تصوف میں مبالغہ کی حد تک زہد و تقوٰی، توکل و بے نیازی کی تعلیم ہے۔ اس کا اثر بھی مسلکی جماعت پہ پایا جاتا ہے۔ صوفیاء کرام سے تعلق کے اظہار کا ایک مضبوط ذریعہ اعراس، مزارات پہ حاضری اور ان کی یاد میں ہونے والی محافل و

مجالس میں شرکت ہے۔اور یہ سب مظاہر باقی بھی ہیں اور انہیں بھی استعمال کیا جارہا ہے۔

یہ معاملہ صرف کسی ایک جماعت کے ساتھ نہیں ہے۔ ہر جماعت اپنے مقاصد جو وہ خود طے بھی نہیں کرتی، اسے ماحول کے جبر سے طے کرنے پڑتے ہیں۔ یہ لہروں کی طرح ہیں جو اسے اپنی سمت پہ بہالے جاتے ہیں۔ان کا تعلق شخصیات سے صرف اُسی دائرے میں رہ جاتا ہے جس میں رہ کر ان کی سیاسی اور وجودی بقا ہوتی ہے۔ شاید آج بھی ایسا ہی ہے کہ اہل تصوف جو سیاسی غلغلے سے دور رہے تھے انہیں اب یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اگر احتجاجی اور سیاسی ہلچل کا حصہ نہیں بنیں گے تو اہم نہیں رہے، لہذا آج اہل تصوف سڑکوں پر کھڑے نظر آتے ہیں۔

پاکستان میں مذہبی آزادی اور اقلیتوں کے تحفظ کے قوانین

ارم خالد، مقبول انور

پاکستان میں مذہبی آزادی سے متعلق بہت سی پیچیدگیاں اور مسائل ہیں جس کا عام طور پہ اعتراف بھی کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ تمام مسائل عملی ہیں جن کے پیچھے گورننس کی اور انتظامی خرابیاں ہیں جو پورے سماج کو کسی نہ کسی طرح سے متأثر کررہی ہیں۔ لیکن ان مسائل کے اثرات اقلیتوں پر زیادہ پڑتے ہیں۔ انہیں تعلیم، روزگار اور ملازمت کے امور میں وہ حقوق نہیں ملتے جو ایک قومی ریاست میں ملنا ضروری ہیں۔ تاہم ان عملی مسائل کے باوجود اگر آئینی و قانونی سطح پہ دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ملک میں اقلیتوں اور ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک ڈھانچہ موجود ہے جس کا اطلاق پوری طرح نہیں ہوپاتا۔زیرنظر مضمون میں انہی قوانین کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ دونوں مضمون نگار سماجی کارکن ہیں اور انسانی حقوق سے متعلق مسائل پر لکھتے رہتے ہیں۔

قیام پاکستان کے پس منظر میں مذہبی آزادی اور اقلیت کا تحفظ

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے بھی قیام پاکستان سے پہلے اسلامی ریاست کا تصور پیش کرتے ہوئے اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کی مکمل یقین دہانی کرائی تھی۔ قائداعظم محمد علی جناح کو اللہ تعالیٰ نے بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ آپ انسانیت دوست سیاستدان تھے۔ آپ اس بات کو بخوبی جانتے تھے کہ ملک کو صحیح معنوں میں خوشحال، مضبوط اور پرامن بنانے کے لیے اشد ضروری ہے کہ پاکستان میں رہنے والے امن پسند شہریوں کے حقوق کی تسلی بخش انداز میں حفاظت کی جائے۔ قائد اعظم نے کئی مقامات پر پاکستان میں رہنے والے غیر مسلموں کے ساتھ بہترین سلوک اور رواداری کی اہمیت پر زور دیا۔اپریل 1941ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے مدراس اجلاس سے صدارتی تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"اقلیتوں میں اعتماد اور تحفظ کا احساس پیدا کیے بغیر کوئی حکومت بھی کامیاب نہیں ہو گی۔ اگر

کسی حکومت کی پالیسی اور پروگرام اقلیتوں کے بارے میں غیر منصفانہ نامناسب اور ظالمانہ ہوں گے تو وہ حکومت کبھی کامیابی و کامرانی سے ہمکنار نہیں ہو سکے گی۔ ہمارے ملک کی اقلیتوں کو معلوم ہو جائے گا کہ ہماری روایات ہمارا ورثہ اور اسلامی تعلیمات ان کے لیے نہ صرف مناسب اور انصاف پسندانہ ہوں گی بلکہ ان کے ساتھ فیاضانہ سلوک بھی کیا جائے گا۔"

اسی طرح 22 اپریل 1944ء کو آل انڈیا مسلم لیگ دہلی کے اجلاس میں خطبۂ صدارت دیتے ہوئے فرمایا:

"اقلیتوں کی بدرجہ اتم حفاظت ہونی چاہیئے۔ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں کے ساتھ نہ صرف عادلانہ بلکہ فیاضانہ سلوک کر کے واضح ترین ثبوت پیش کیا ہے۔"

15 نومبر 1942 کو آل انڈیا مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن جالندھر کے سالانہ اجلاس سے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"ہماری مذہبی تعلیم ہمیں یہ حکم دیتی ہے کہ مسلمان حکومت میں ہر غیر مسلم اقلیت کے ساتھ عدل وانصاف کا برتاؤ کیا جائے۔"

قائداعظم نے یکم فروری 1943ء کو اسماعیلی کالج بمبئی سے تقریر کرتے ہوئے کانگریس کے ہندو رہنماؤں سے مخاطب ہو کر کہا تھا کہ :

ہم تمہاری اقلیتوں کے ساتھ مہذب حکومتوں سے بھی زیادہ بہتر انداز میں سلوک کریں گے کیونکہ اقلیتوں کے ساتھ ایسا برتاو کرنے کا ہمیں قرآن کریم نے حکم دیا ہے۔"

24 دسمبر 1943 کو کراچی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

"ہندوستان اور پاکستان کا یہ مقدس فرض ہے کہ وہ اپنے اپنے علاقے کی اقلیتوں کے ساتھ عدل اور انصاف کا برتاؤ کریں اور ان کی حفاظت بھی کریں۔"

قیام پاکستان کے بعد وزیر اعظم لیاقت علی خان نے جو پہلی کابینہ بنائی اس میں ایک ہندو جوگندر ناتھ منڈل کو وزیر قانون بنا کر عزت سے سرفراز کیا۔ 1950ء میں شہید ملت لیاقت علی خان انڈیا گئے تو دونوں ممالک کے درمیان اقلیتوں کے تحفظ کے لیے لیاقت نہرو پیکٹ دستخط کر کے آئے۔ مسلم لیگ کے تیار کردہ 1956ء کے آئین میں اقلیتوں کے جان و مال کے تحفظ اور مذہبی احترام اور فلاح و بہبود کے لیے کئی دفعات رکھی گئیں اور اقلیتوں کو ایک مقدس امانت قرار دیا گیا۔ پاکستان کے موجودہ آئین 1973ء میں بھی اقلیتوں کو برابر کے شہری حقوق حاصل ہیں اور ان کے استحصال کو روکنے کے لیے ہر طرح کے امتیازات کا خاتمہ کیا گیا ہے۔

آئینِ پاکستان کی وہ دفعات جو اقلیتوں کو تحفظ فراہم کرتی ہیں

قراردادِ پاکستان جو پاکستان کے آئین کے لیے راہنما اصول متعین کرتی ہے، اس میں اعلان کیا گیا ہے کہ پاکستانی عوام ایک ایسا نظم قائم کرنا چاہتے ہیں ''جس میں ایسے ماحول کو فروغ دیا جائے گا کہ جہاں اقلیتیں آزادی کے ساتھ اپنے مذاہب کا اظہار کر سکیں، اس پر عمل کر سکیں اور اپنی ثقافتوں کی نشوونما کر سکیں''۔ اور ''جس میں اقلیتوں، پسماندہ اور پسے ہوئے طبقات کے جائز مفادات کے تحفظ کے لیے مناسب اقدامات کیے جائیں گے''۔

آئینِ پاکستان کے آرٹیکل 20، 21، 25، 26، 27، اور 36 بشمول اقلیتوں کے تمام شہریوں کو مکمل تحفظ اور مساوی حقوق فراہم کرتے ہیں، بغیر کسی رنگ، عقیدے، فرقے، زبان یا جنس کی تفریق کے، تاکہ وہ آزادانہ طور پہ اپنے مذاہب و ثقافتوں کی پیروی کر سکیں:[1]

دفعہ نمبر	1973ء کے آئینِ پاکستان میں متعلقہ دفعات
20	مذہب کا اظہار کرنے اور مذہبی اداروں کے انتظامی اُمور کی دیکھ بھال کی آزادی قانون، امن عامہ اور اخلاقیات کے تابع رہنے والے،

[1]Protecting Faith-Based Rights in Pakistan: An Overview of Legislative Framework, A Report by Pak Institute for Peace Studies.

	(a) ہر شہری کو اپنے مذہب کا اظہار کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کا حق حاصل ہو گا۔ اور (b) ہر مذہبی گروہ اور اس کے ہر فرقے کو اپنے مذہبی ادارے قائم کرنے، برقرار رکھنے اور انہیں چلانے کا حق حاصل ہو گا۔
21	کسی خاص مذہب کے لیے ٹیکس وصولی کے خلاف تحفظ کسی شخص کو کوئی ایسا مخصوص ٹیکس ادا کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا جس سے حاصل ہونے والی آمدنی اس کے مذہب کے علاوہ کسی اور مذہب کی تبلیغ یا اس کی دیکھ بھال پر خرچ کی جائے۔
25	شہریوں کے مابین مساوات (1) تمام شہری قانون کے سامنے برابر ہیں اور مساوی طور پہ قانونی تحفظ کے حقدار ہیں۔
26	عوامی مقامات تک رسائی کے معاملہ میں غیر امتیازی سلوک (1) عوامی تفریحی مقامات اور اجتماع کی جگہیں جو صرف مذہبی مقاصد کے لیے خاص نہیں ہیں، ان تک رسائی کے لیے کسی بھی شہری کے ساتھ نسل، مذہب، ذات، جنس، سکونت یا جائے پیدائش کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔
27	شہری خدمات میں امتیازی سلوک کے خلاف تحفظ (1) کوئی بھی شہری جو پاکستان کے اندر ملازمت کی تقرری کا اہل ہو، اس کے ساتھ نسل، مذہب، ذات، جنس، سکونت یا جائے پیدائش کی بنیاد پر تقرری کے سلسلے میں امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا: تاہم، نفاذ کے دن سے لے کر زیادہ سے زیادہ چالیس سال کے عرصہ تک کے لیے سرکاری ملازمتوں میں مناسب نمائندگی کی غرض سے کسی مخصوص طبقے کے افراد کے لیے اسامیاں مختص کی جاسکتی ہیں۔

	مزید یہ کہ، مذکورہ سروس کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے، مخصوص اسامیاں یا محکمے کسی ایک صنف کے افراد کے لیے مخصوص کیے جا سکتے ہیں، بشرطیکہ وہ اسامیاں اور محکمے ایسے فرائض خدمات کی انجام دہی پر مشتمل ہوں جو دوسری صنف کے افراد مناسب طریقے سے انجام نہ دے سکتے ہوں۔ [تاہم، پاکستان میں سروسز وخدمات کے مسئلہ میں کسی بھی طبقے یا علاقے کی کم نمائندگی کا ازالہ ان طریقوں سے کیا جاسکتا ہے جن کا تعین مجلس شوریٰ (پارلیمنٹ) کے ایکٹ سے کیا گیا ہو۔]
36	اقلیتوں کا تحفظ ریاست اقلیتوں کے جائز حقوق اور مفادات کا تحفظ کرے گی، بشمول وفاقی اور صوبائی ملازمتوں و سروسز میں ان کی مناسب نمائندگی کے۔
51	(4) شق نمبر 3 میں مذکور نشستوں کی تعداد کے علاوہ، قومی اسمبلی میں بھی دس نشستیں غیر مسلموں کے لیے مخصوص ہوں گی۔

تاہم ہمارے آئین میں بعض دفعات کو اقلیتوں کے اِن بنیادی حقوق کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ یہاں اس کا ایک جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

دفعہ نمبر	دفعات اور متعلقہ ذیلی شقیں
31	اسلامی طرز زندگی (1) پاکستان کے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اس قابل بنانے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے کہ وہ اپنی زندگیوں کو اسلام کے بنیادی اصولوں اور اساسی تصورات کے مطابق ترتیب دیں اور ایسا ماحول فراہم کیا جائے جس کے توسط سے وہ قرآن وسنت کے مطابق زندگی کے مقصد کو سمجھنے کے قابل ہو سکیں۔ (2) پاکستان کے مسلمانوں کے لیے ریاست کی کوشش ہو گی کہ :

(الف) قرآن پاک اور اسلامیات کی تعلیم کو لازمی بنایا جائے، عربی زبان سیکھنے کی حوصلہ افزائی کی جائے اور اس کے لیے سہولیات فراہم کی جائیں، اور قرآن پاک کی صحیح اور درست طباعت اور اشاعت کا بندوبست کیا جائے۔	
صدر (2) کوئی شخص بطور صدر منتخب ہونے کا اہل نہیں ہوگا جب تک کہ وہ مسلمان نہ ہو، اور پینتالیس سال سے کم عمر کا نہ ہو، اور قومی اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کا اہل نہ ہو۔	41
کابینہ (3) سپیکر اور ڈپٹی سپیکر کے انتخاب کے بعد، قومی اسمبلی دیگر کسی بھی کام سے پہلے، بغیر بحث کیے اپنے کسی مسلمان ممبر کو وزیر اعظم کے لیے منتخب کرنے کے لیے آگے بڑھے گی۔	91
اسلامی دفعات	227-231

اقلیتوں کے خلاف نفرت انگیز تقاریر کو جرم قرار دینے کے قوانین

آئینی دفعات کے علاوہ اقلیتوں کے خلاف نفرت انگیز تقاریر کے مسئلہ سے نمٹنے کے لیے کچھ مخصوص قوانین بھی وضع کیے گئے ہیں۔ یہاں پاکستان پینل کوڈ کے آرٹیکلز کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا جاتا ہے جو مذہبی منافرت کو فروغ دینے والے اقدامات کو جرم قرار دیتے اور سزا کا ذکر کرتے ہیں۔

متعلقہ دفعات	پاکستان پینل کوڈ کی دفعات
مختلف گروہوں کے درمیان دشمنی یا منافرت وغیرہ کو فروغ دینا جو بھی شخص (a) بولے گئے یا لکھے گئے الفاظ کے ذریعے، اشاروں کے ذریعے، یا کسی بھی	A-153

اور طریقے سے مذہب، نسل، سکونت، یا کمیونٹی کی بنیاد پر مختلف مذہبی، نسلی، لسانی یا علاقائی گروہوں ، ذاتوں یا برادریوں کے درمیان بدامنی، دشمنی، نفرت یا بدخواہی کے جذبات پیدا کرنے یا اُکسانے کی کوشش کرے، (b) خود ایسا اقدام کرے یا کسی دوسرے کو ایسی سرگرمیوں کے ارتکاب پر اُکسائے جن کے باعث مختلف مذہبی، لسانی، نسلی، علاقائی، طبقاتی یا کسی بھی نوع کی دیگر اکائیوں کے مابین آپسی سطح پہ بدامنی و عدم رواداری کا ماحول جنم لے اور امنِ عامہ متاثر ہو، (c) خود ایسا کرے یا کسی دوسرے فرد کو منظم کر کے اسے تربیت دے کہ وہ ایسی کوئی تحریک چلائے یا لوگوں کو اُکسائے جس سے وہ مجرمانہ سرگرمیوں کا حصہ بنیں، یا یہ امکان ہو کہ وہ بعد میں تشدد کا استعمال کر سکتے ہیں، یا ان اقدامات کے باعث مذہب، نسل، سکونت، یا کمیونٹی کی بنیاد پر مختلف مذہبی، نسلی، لسانی یا علاقائی گروہوں ، ذاتوں یا برادریوں کے درمیان بدامنی، دشمنی، نفرت یا بدخواہی کے جذبات پیدا ہوں، یا کسی گروہ کے لیے عدم تحفظ کا احساس پیدا ہو، ایسے شخص کو بمع جرمانہ قید کی سزا سنائی جائے گی جس کی مدت پانچ سال تک ہو سکتی ہے۔	
کسی بھی طبقے کے مذہب کی توہین کے ارادے سے عبادت گاہ کو نقصان پہنچانا یا اس کی بے حرمتی کرنا جو بھی شخص کسی عبادت گاہ کو مسمار کرتا ہے، نقصان پہنچاتا ہے یا اس کی بے حرمتی کرتا ہے، یا یہ کہ کوئی بھی ایسی چیز جو کسی مذہب میں مقدس تصور کی جاتی ہو، اس کا علم ہوتے ہوئے جان بوجھ کر اس چیز کے خلاف ایسا اقدام کرتا ہے جو اُس مذہب و طبقے کے ماننے والوں کے ہاں توہین سمجھی جائے، تو	295 (جسے عام طور پر توہینِ مذہب کا قانون کہا جاتا ہے)

ایسا اقدام کرنے والے شخص کو دو سال مدت تک کی سزا سنائی جاسکتی ہے، یا جرمانہ عائد کیا جاسکتا ہے، اور دونوں سزائیں ایک ساتھ بھی سنائی جاسکتی ہیں۔	
کسی طبقے کے مذہب یا مذہبی عقائد کی توہین کر کے اس کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرنے کے لیے قصداً اور بدنیتی پر مبنی اقدامات جو بھی شخص پاکستانی شہریوں کے کسی بھی طبقے کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے کے لیے دانستہ اور بدنیتی کے ساتھ، تحریر یا تقریر میں، یا کسی بھی قسم کے ظاہری فعل کے ذریعے اس طبقے کے مذہب یا مذہبی عقائد کی توہین کا مرتکب ہو، اسے دس سال کی مدت تک قید کی سزا ہوسکتی ہے، یا جرمانہ عائد کیا جاسکتا ہے، اور یا دونوں سزائیں لاگو کی جاسکتی ہیں۔	A-295
مذہبی اجتماع میں خلل ڈالنا جو بھی شخص ایسی مذہبی عبادات، یا مذہبی تقاریب کے اجتماعات میں خلل ڈالتا ہے جو قانونی طور پہ انجام دی جارہی ہوں، اسے ایک سال کی مدت تک سزا سنائی جاسکتی ہے ہوسکتی ہے، یا جرمانہ عائد کیا جاسکتا ہے، اور یا دونوں سزائیں لاگو کی جاسکتی ہیں۔	296
تدفین وغیرہ کے مقامات میں مداخلت کرنا جو بھی شخص کسی کے جذبات مجروح کرنے کی غرض سے، یا اس کے مذہب کی توہین کی نیت سے، یا اس علم کے ساتھ کہ کسی کے جذبات مجروح ہونے یا مذہبی توہین کا امکان ہے، وہ اس کی عبادت کی جگہ، مجسمہ سازی کے مقام، جنازے کی رسومات ادا کرنے کی جگہ، میت کی باقیات کو رکھنے کی جگہ کے لیے یا کسی انسانی لاش کے لیے بے حرمتی کا ارتکاب کرے، یا جنازے کی تقریب میں خلل ڈالے، ایسے شخص کو ایک سال تک کی قید کی سزا سنائی	297

	جاسکتی ہے، یا جرمانہ عائد کیا جاسکتا ہے، اور یا دونوں سزائیں لاگو کی جاسکتی ہیں۔
298	دانستہ طور پر مذہبی جذبات کو مجروح کرنے کے لیے کوئی الفاظ ادا کرنا جو شخص جان بوجھ کر کسی کے مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانے کی نیت سے کوئی لفظ ادا کرے، یا اس کی سماعت میں کوئی ایسی آواز پہنچائے، یا ایسا اشارہ کرے، یا اس کے سامنے کوئی ایسی چیز رکھے جس سے اس کی مذہبی احساسات مجروح ہوں، ایسے شخص کو ایک سال تک کی قید کی سزا سنائی جاسکتی ہے، یا جرمانہ عائد کیا جاسکتا ہے، اور یا دونوں سزائیں لاگو کی جاسکتی ہیں۔
A-298	مقدس ہستیوں کے بارے میں توہین آمیز کلمات کا استعمال جو بھی شخص بالواسطہ یا بلاسطہ تحریر یا تقریر کے ذریعے، یا کسی بھی قسم کے ظاہری فعل کے ذریعے، بہتان لگا کے، طعن کرکے، یا تنقید کرکے امہات المؤمنینؓ یا خاندانِ اہلِ بیتؓ کے مقدس ناموں کی توہین کرتا ہے، یا خلفاء راشدینؓ وصحابہؓ میں سے کسی کی اہانت کا مرتکب ہوتا ہے، اسے تین سال تک کی قید کی سزا سنائی جاسکتی ہے، یا جرمانہ عائد کیا جاسکتا ہے، اور یا دونوں سزائیں لاگو کی جاسکتی ہیں۔[2]

[2] Protecting Faith-Based Rights in Pakistan: An Overview of Legislative Framework, A Report by Pak Institute for Peace Studies.

اسلامی اور پاکستانی قانون میں مذہبی آزادی کے معیار

ڈاکٹر محمد شاہد حبیب

اسلام میں مذہبی آزادی کاعمومی تصور فکری حلقوں میں واضح اور دوٹوک ہے جبکہ عوامی و سماجی سطح پر اس بارے کافی کنفیوژن یا لاعلمی پائی جاتی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ملک میں بعض اوقات ایسے سانحے بھی رونما ہوجاتے ہیں جو افسوسناک ہوتے ہیں۔ اسی طرح پاکستانی قوانین بھی اس معاملے میں کافی شفاف ہیں کہ اقلیتیں اس ملک کی برابر شہری ہیں اور انہیں تمام حقوق ملنے چاہئیں۔ لیکن ان قوانین کا عوامی سطح پر کوئی ادراک نہیں ہے، حتی کہ تعلیمی نصاب میں بھی اس مسئلے پر کوئی رہنمائی نہیں کی جاتی۔ لہذا ہم آہنگ مزاج کی تشکیل کے لیے سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ عوامی سطح پر دینی اور ملکی مذہبی آزادی کے تحفظ کے قوانین بارے آگہی فراہم کی جائے۔ اس مضمون میں ان دونوں پہلوؤں کا اختصار کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ مضمون نگار خواجہ فرید یونیورسٹی آف انجنئیرنگ اینڈ انفارمیشن ٹیکنالوجی،رحیم یار خان میں انسٹیٹیوٹ آف ہیومینٹیز اینڈ آرٹ کے شعبہ میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔

تعارف

اصل میں ہر شخص کو فکر، ضمیر اور مذہب کی آزادی کا حق حاصل ہے۔اس حق میں مذہب یا عقیدہ تبدیل کرنے کی آزادی اور انفرادی طور پر یا معاشرے میں دوسروں کے ساتھ کھلے عام یا نجی طور سے تعلیمات، عمل، عبادت اور رسومات میں اپنے مذہب یا عقیدے کے اظہار کی آزادی شامل ہیں۔ ہر فرد مذہبی وابستگی یا کسی عقیدے سے وابستگی نہ ہونے سے قطع نظر قانون کے تحت مساوی تحفظ کا حق دار ہے۔اپنے عقیدے کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی خدا کا عطا کردہ حق ہے جو ہر ایک کو حاصل ہے۔خدا کی تلاش اور اس کے مطابق عمل کرنے بشمول اپنے ضمیر کے مطابق عمل کا انفرادی حق انسانوں کے لیے بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ حکومتیں کسی انسان سے جائز طور پر یہ حق واپس نہیں لے سکتیں۔اور اسی طرح مذہبی آزادی کا دفاع اور تحفظ ہر ملک اور عالمی برادری کی مجموعی

ذمہ داری ہے۔ اندرون ملک اور بین الممالک امن واستحکام کے لیے مذہبی آزادی لازمی حیثیت رکھتی ہے۔

مذہبی آزادی دور اثر، عالمگیر اور عمیق انسانی حق ہے جس کا دنیا بھر میں تمام لوگوں اور نیک نیت حکومتوں کو دفاع کرنا چاہیے۔ مذہبی آزادی عالمگیر اور نا قابل انتقال ہے اور ممالک کو ہر صورت اس انسانی حق کا احترام اور تحفظ کرنا چاہیے۔ جہاں کہیں مذہبی آزادی کا تحفظ ہوتا ہے وہاں اظہار، میل جول اور پر امن اجتماع جیسی آزادیاں بھی فروغ پاتی ہیں۔ مذہب پر آزادانہ عمل کو تحفظ دینے سے براہ راست مذہبی آزادی، معاشی ترقی اور قانون کی حکمرانی کو فروغ ملتا ہے۔ جہاں ایسا نہیں ہوتا وہاں باہم جنگیں، عدم استحکام اور دہشت گردی اور خون ریزی دکھائی دیتی ہے۔

مذہبی آزادی (اسلامی آئین و قوانین کے تناظر میں)

اسلام جو قدیم آسمانی مذاہب ہی کا تسلسل ہے نے بھی تمام رسولوں اور پیغمبروں خصوصاً حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفی ﷺ کے اِحترام کو ایمان کا حصہ قرار دیا ہے۔ اسلام ایک استدلالی و عقلی اور مبرہن و مدلل مذہب ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ پر جو صحیفۂ ربانی نازل ہوا، اس نے سب سے پہلے عقل انسانی کو مخاطب کیا۔ اور غور وفکر، فہم وتدبر کی دعوت دی کہ اسلام اپنی کسی بھی تعلیم کو لوگوں پر زبردستی نہیں تھوپتا ہے۔ بلکہ وہ لوگوں کو غور وفکر کا موقع فراہم کرتا ہے۔ حق و باطل کے امتیاز کو واضح کرتا ہے۔ ضلالت و گمراہی اور نجات و فلاح کے راستے سے لوگوں کو روشناس کراتا ہے پھر یہ کہ جو مذہب اپنی ترویج واشاعت کے لئے دعوت و تبلیغ، ارشاد و تلقین کا راستہ اختیار کرنے اور سوچنے سمجھنے کا لوگوں سے مطالبہ کرتا ہو، وہ بھلا کیوں کسی مذہب کے پیروکاروں کو جبر و کراہ کے ذریعہ اپنے مذہب میں داخل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اور زور زبردستی اختیار کرے گا۔ متعصبین اور معاندین اسلام اس کی اشاعت کو فتوحات اور ملکی محاربات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں اور یہ کہتے ہوئے ان کی زبان نہیں تھک رہی ہے کہ، اسلام کو بزور شمشیر پھیلایا گیا ہے، ان کا دعویٰ ہے کہ اسلام نے اپنی ذاتی خوبیوں اور محاسن سے لوگوں کو اپنا مطیع فرمان نہیں بنایا بلکہ

اپنی طاقت و قوت سے جبر و اکراہ کے ذریعہ دین اسلام کا قلادہ ان کی گردن میں ڈال دیا ہے اور اسی جبر و اکراہ نے امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ رضا و رغبت کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ لیکن ہم تعلیمات اسلام کی روشنی میں اس قسم کی مسموم ذہنیت رکھنے والوں کے باطل خیالات کو پرکھیں گے، کہ قرآنی آیات اور تعلیمات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں مذہبی آزادی کے سلسلہ میں کیا احکام و تعلیمات موجود ہیں اور اسلام کے ماننے والے ان تعلیمات پر کتنا عمل پیرا ہوئے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کو طویل معرکہ آرائیوں سے سابقہ پڑا ہے۔ ان کے یہ محاربات جارحانہ ہوں یا مدافعانہ، فتوحات کے لئے ہوں یا اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے، ان تمام محاربات و فتوحات کا مقصد اور حاصل یہ نہ تھا کہ کسی کو بزورِ شمشیر اور حکومت و اقتدار کے بل بوتے پر مسلمان بنایا جائے۔ اسلام نے تو صرف اور صرف اپنی خوبیوں اور محاسن سے عالم میں رسوخ اور مقبولیت حاصل کی ہے۔ اس نے جس تیزی کے ساتھ اقوام و ملل کے اذہان و قلوب کو مسخر کیا اس طرح کی نظیر دوسرے مذاہب میں دیکھنے کو نہیں ملتی ہے۔ یہ بات کہ اسلام میں کوئی زور و زبردستی نہیں ہے، اس کو ثابت کرنے کے لئے شریعت اسلام کے اصول، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و خصائل اخلاق حمیدہ و طریقہ تعلیم اور پھر آپ کے بعد آپ کے صحابہ کا طرز عمل یہ ساری چیزیں تاریخ میں محفوظ ہیں۔ شریعت اسلام نے بہ زور و تخویف کسی کو مسلمان بنانے کی سخت ممانعت کی ہے قرآن کی مندرجہ ذیل متعدد آیات اس بات پر شاہد عدل ہیں:

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی فمن یکفر بالطاغوت ویومن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ لا انفصام لہا واللہ سمیع علیم.[1]

ترجمہ: زبردستی نہیں ہے دین کے معاملہ میں بے شک جدا ہو چکی ہے ہدایت گمراہی سے اب جب کوئی نہ مانے گمراہ کرنے والوں کو اور یقین لائے اللہ پر تو اس نے پکڑ لیا حلقہ مضبوط جو ٹوٹنے والا نہیں اور اللہ سب کچھ جانتا اور سنتا ہے۔

---

1 سورہ البقرہ: 233

افانت تكره الناس حتى يكونوا مومنين.[2]

ترجمہ: کیا تو زبردستی کرے گا لوگوں پر کہ ہو جائیں باایمان؟۔

ولا تسبو الذين يدعون من دون الله فيسبو الله عدواً بغير علم.[3]

ترجمہ: اور تم لوگ برا نہ کہو ان کو جن کی یہ پرستش کرتے ہیں اللہ کے سوا بس وہ برا کہنے لگیں گے بربنائے دشمنی بغیر جانے۔

وما انت عليهم بجبار فذكر بالقرآن من يخاف وعيد۔[4]

ترجمہ: تو نہیں ہے ان پر زور کرنے والا سو تو سمجھا قرآن سے اس کو جو ڈرے میرے ڈرانے سے۔

نبی کریم ﷺ اور آپ کے خلفاء راشدین نے مختلف اقوام و ملل کے ساتھ جو معاہدات کیے اور ان کے ساتھ جو صلح نامے تیار کئے ان میں ہمیں اسلام کی وسعت نظری کا اندازہ اور دریادلی کا ثبوت ملتا ہے۔ ان میں چند ایک معاہدات و صلح نامے بطور امثلہ حوالہ قرطاس کرتا ہوں۔

اہل نجران کی درخواست پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انہیں صلح نامہ لکھ کر دیا تھا اس کے الفاظ یہ تھے۔

"نجران کے عیسائیوں اور ان کے ہمسایوں کے لئے پناہ اللہ کی اور محمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عہد ہے ان کے جانوں کے لئے۔ ان کے مذہب ان کی زمین، ان کے اموال، ان کے حاضر وغائب، ان کے اونٹوں ان کے قاصدوں، اور ان کے مذہبی نشانات سب کے لئے جس حالات پر وہ اب تک ہیں اسی پر بحال رہیں گے۔ ان کے حقوق میں سے کوئی حق اور نشانات میں سے کوئی نشان نہ بدلا جائے گا"۔[5]

---

[2] یونس99:

[3] الانعام108:

[4] سورہ ق:45

[5] البلاذری، احمد بن یحییٰ بن جابر الشہیر، فتوح البلدان ص۱۲۸-۱۲۷۔ ناشر: تخلیقات، لاہور، ۲۱۱

خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اہل بیت المقدس کو جو صلح نامہ لکھ کر دیا تھا اس کے الفاظ اس طرح ہیں:

"ان کو امان دی ان کی جان و مال اور ان کے کنیسوں اور صلیبوں اور ان کے تندرستوں اور بیماروں کے لئے یہ امان ایلیا کی ساری ملت کے ہے۔ عہد کیا جاتا ہے کہ ان کے کنیسوں کو مسلمانوں کا مسکن نہ بنایا جائے گا اور نہ ہی ان کو منہدم کیا جائے گا۔ نہ ان کے احاطوں اور ان کی عمارتوں میں کوئی کمی کی جائے گی۔ نہ ان کی صلیبوں اور ان کے اموال میں سے کسی چیز کو نقصان پہنچایا جائے گا ان پر دین کے معاملے میں کوئی جبر نہ کیا جائے گا اور نہ ان میں سے کسی کو ضرر پہنچایا جائے گا"۔ [6]

41ھ میں جب فتح دمشق کا واقعہ پیش آیا حضرت خالد بن ولید نے اس موقع سے جو امان نامہ لکھ کر اہل دمشق کو دیا وہ یہ تھا:

"ان کو امان دی ان کی جان و مال کے لئے اور ان کے کنیسوں اور ان کے شہر کے فصیل کے لئے ان کے مکانات میں سے نہ کوئی توڑا جائے گا اور نہ ہی مسلمانوں کا مسکن بنایا جائے گا"۔ [7]

حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جس کسی لشکر کو روانہ فرماتے اس کو یہ ہدایت دیتے تھے:

"کسی عبادت گاہ کو مت گرانا اور نہ ہی بچوں بوڑھوں اور عورتوں کو قتل کرنا تمہیں بہت سے ایسے لوگ ملیں گے جنھوں نے اپنے آپ کو گرجا گھروں میں محبوس کر رکھا ہے اور دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا۔ ان کے علاوہ تمہیں کچھ دوسرے لوگ ملیں گے جو شیطانی سوچ کے حامل ہیں جب تمہیں ایسے لوگ ملیں تو ان کی گردنیں اڑا دینا"۔ [8]

سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

---

6 طبری، ابن جریر، تاریخ طبری، ج ۴، ص ۱۵۹، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی پاکستان، ۱۳۸۱ھ۔

7 فتوح البلدان جلد 1 ص ۱۲۸-۱۲۷

8 البیہقی، السنن الکبریٰ، جلد ۹، ص: ۸۵، عبدالرزاق المصنف ۱۹۹-۵

"اسلام کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت میں وہ دنیا کے لئے اللہ کا قانون ہے۔ دوسری حیثیت میں وہ نیکی و تقویٰ کی جانب ایک دعوت اور پکار ہے۔ پہلی حیثیت کا منشاء دنیا میں امن قائم کرنا ہے اس کو ظالم و سرکش انسانوں کے ہاتھوں تباہ ہونے سے بچانا اور دنیا والوں کو اخلاق و انسانیت کے حدود کا پابند بنانا ہے۔ جس کے لئے قوت و طاقت کے استعمال کی ضرورت ہے لیکن دوسری حیثیت میں وہ قلوب کا تزکیہ کرنے والا ارواح کو پاک و صاف کرنے والا، حیوانی کثافتوں کو دور کر کے بنی آدم کو اعلیٰ درجہ کا انسان بنانے والا ہے۔ جس کے لئے تلوار کی دھار نہیں بلکہ ہدایت کا نور، دست و پا کا انقیاد نہیں بلکہ دلوں کا جھکاؤ اور جسموں کی پابندی نہیں بلکہ روحوں کی اسیری درکار ہے۔ اگر کوئی شخص سر پر تلوار چمکتی ہوئی دیکھ کر لا الٰہ الا اللہ کہہ دے مگر اس کا دل بدستور ماسوی اللہ کا بتکدہ بنا رہے تو دل کی تصدیق کے بغیر یہ زبان کا اقرار کسی کام کا نہیں اسلام کے لئے اس کی حلقہ بگوشی قطعاً بیکار ہے"۔ [9]

علامہ سید سلیمان ندوی اپنے مقالہ "ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیوں کر ہوئی" میں لکھتے ہیں: "تمام دنیا کے مذاہب میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے یہ فلسفہ دنیا میں ظاہر کیا کہ "مذہب یقین کا نام ہے اور یقین تلوار کی دھار اور نیزہ کی نوک سے نہیں پیدا کیا جا سکتا"۔ [10]

نبی رحمت کی سیرت اور ان کے اصحاب کا زمانہ خلافت سے اسلام کی وسعت نظری اور دریا دلی سے تاریخ روشن ہے۔ اپنے تو کیا غیروں نے بھی اس چیز کو تسلیم کیا ہے کہ اسلام کس طرح سے غیر مذاہب کے لوگوں کا ادب واحترام محفوظ رکھتا ہے انھیں کس طرح سے مذہبی آزادی، معاشرتی و تجارتی آزادی کی چھوٹ دیتا ہے۔ بطور مثال کچھ تحاریر پیش کرتا ہوں۔

سر ولیم میور لکھتے ہیں:

"رسول خدا نے بنی حارث اور نجران کے پادریوں کو پوری مذہبی آزادی دینے کا اقرار کیا تھا۔

---

9 مودودی، ابوالاعلیٰ، رسالہ الجہاد فی الاسلام، ص: ۱۶۵، مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور پاکستان۔

10 بحوالہ غیر مسلموں سے تعلقات اور مذہبی رواداری، مفتی سرور فاروقی، جمعیت پیام امن۔

وہ اپنے طریقے پر اپنے گرجاؤں میں جس طرح چاہیں عبادت کریں بشپ اور راہب اپنی جگہ پر بحال رہیں جب تک یہ لوگ امن وامان کے ساتھ رہیں ان کے ساتھ کچھ تعرض نہ ہوگا"۔ [11]

مؤرخ مسٹر جیسن، لکھتے ہیں:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت فراخدلی کے ساتھ اسلامی مملکت میں آباد عیسائیوں کی جان، ان کی تجارت اور ان کے مال واسباب اور مذہبی امور کی ادائیگی اور ہر قسم کے تحفظ کی ضمانت دے دی۔ اور رواداری کے اصول پر نہ صرف خلفائے راشدین ہی نے پوری سختی سے عمل کیا تھا بلکہ تمام عرب حکمراں بھی رواداری کے اس اصول پر کاربند رہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے عروج کی تاریخ رواداری، بے توجہی اور ان کے اعلیٰ قدروں کو اجاگر کرنے کی تاریخ ہے۔ اس دور کی مسلمانوں کی سلطنتیں ستم رسیدہ، یہودیوں، اور نسطوری، یعقوبی اور دوسرے عقائد رکھنے والے عیسائیوں کی پناہ گاہ تھیں اور ان کے مذہبی عقائد سے اختلاف کے باوجود مسلم ممالک میں انھیں پناہ لینے کی کھلی آزادی تھی۔ بلکہ انھیں مذہبی فرائض کی ادائیگی اور اپنی عبادت گاہوں کو تعمیر کرنے کی بھی آزادی حاصل تھی"۔ [12]

ہملٹن نامی ایک انگریز سیاح جو باشاہ عالمگیر کے زمانے میں ہندوستان آیا تھا وہ اپنے سفر نامے میں مختلف شہروں کا عینی مشاہدہ درج کرتے ہوئے شہر ٹھٹھ کے متعلق لکھتا ہے:

"حکومت کا مسلمہ مذہب اسلام ہے۔ لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان ہے، ہندوؤں کے ساتھ مذہبی رواداری پوری طرح برتی جاتی ہے۔ وہ اپنے برت رکھتے ہیں، پوجا پاٹ کرتے ہیں اور تہواروں کو اسی طرح مناتے ہیں جیسے کہ اگلے زمانے میں مناتے تھے۔ جبکہ بادشاہت ہندوؤں کی تھی"۔ [13]

---

11 میور، سر ولیم، لائف آف محمد جلد دوم ص ۲۹۹

12 باغپتی، متین طارق، اسلام اور رواداری ص: ۵۹، مرکزی مکتبہ اسلامی پبلیشرز، نئی دہلی

13 سفر نامہ ہملٹن، ج: ۱، ص: ۱۲۸-۱۲۷

مذہبی آزادی (پاکستانی آئین و قوانین کے تناظر میں)

پاکستان کے آئین میں اسلام کو ریاست کا مذہب قرار دیا گیا ہے اور ملک میں تمام قوانین کا اسلام کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ عدالتوں کی جانب سے توہین مذہب کے قوانین کا نفاذ جاری ہے جن کے تحت مختلف الزامات میں عمر قید سے موت تک سزائیں دی جاتی ہیں۔ ان الزامات میں "توہین رسالت" بھی شامل ہے۔ اور دیگر آئین و قوانین چند ایک مندرجہ ذیل ہیں۔

- ہر شہری کو آزادی اظہار کا حق بھی حاصل ہے بشرطیکہ یہ اظہار ضابطہ تعزیرات کی رو سے اسلام کی عظمت کے منافی نہ ہو۔ ضابطہ تعزیرات کے مطابق "توہین رسالت" کا مرتکب سزائے موت، قرآن کی بے حرمتی، اسے نقصان پہنچانے اور اس کی بے ادبی کا مرتکب عمر قید اور دیگر مذہبی احساسات کی توہین کرنے والا 10 سال قید کا مستوجب ہے، اسی طرح مذہبی بنیاد پر نفرت کو ہوا دینے والے کے لیے سات سال قید کی سزا تجویز کی گئی ہے۔
- آئین اور ضابطہ تعزیرات کی رو سے احمدی غیر مسلم ہیں اور خود کو مسلمان یا اسلام کے وارث نہیں کہلوا سکتے۔ ضابطہ تعزیرات انہیں اپنے مذہبی عقائد کی تبلیغ کسی کا عقیدہ تبدیل کرانے یا مسلمانوں کے مذہبی جذبات مجروح کرنے سے روکتا ہے۔ ان شرائط کی خلاف ورزی پر تین سال تک قید اور جرمانے کی سزا ہو سکتی ہے۔ ضابطہ تعزیرات کسی بھی مذہب یا اس سے تعلق رکھنے والوں کے مذہبی جذبات جان بوجھ کر اور سوچے سمجھے انداز میں مجروح کرنے کو مجرمانہ فعل قرار دیتا ہے جس کے لیے 10 برس تک قید کی سزا رکھی گئی ہے۔
- ہر مذہبی فرقے کو اپنے ادارے قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔ کوئی شخص اپنے مذہب کے علاوہ کسی اور مذہب کی تبلیغ یا اس کے اداروں کی دیکھ بھال کے لیے کسی خصوصی ٹیکس کی ادائیگی کا پابند نہیں ہے۔
- توہین مذہب اور اسلامی تعلیم جیسے معاملات پر بھی حکام وزارت سے رجوع کرتے ہیں۔ قانون کی رو سے وزارت مذہبی امور اپنے بجٹ میں نادار اقلیتوں کی معاونت، اقلیتوں کی عبادت گاہوں کی مرمت، اقلیتوں کے زیر اہتمام چھوٹے ترقیاتی منصوبوں کا اجراء، اقلیتوں کے مذہبی

تہوار منانے اور مذہبی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ کے لیے وظائف کی فراہمی کی بھی ذمہ دار ہے۔

- مدرسوں میں فرقہ وارانہ یا مذہبی بنیاد پر نفرت کی تعلیم دینا یا اس کی حوصلہ افزائی ممنوع ہے۔ قانون کہتا ہے کہ تمام مدراس کو پانچ میں سے کسی ایک وفاق (آزاد خود مختار بورڈ) کے ساتھ یا براہ راست حکومت کے پاس رجسٹرڈ ہونا چاہیے تاکہ ان کے غیر ملکی ذرائع آمدنی کا حساب رکھا جاسکے، غیر ملکی طلبہ قانونی تعلیمی ویزوں پر ہی ان مدارس میں داخلہ لے سکیں اور ان مدارس کی نگرانی ممکن ہو سکے۔ تاہم سکیورٹی تجزیہ کار اور مدرسوں میں اصلاحات کے حامیوں نے مشاہدہ کیا ہے کہ بہت سے مدرسے ایسی دستاویزی شرائط پوری کرنے میں ناکام ہیں۔
- اقلیتوں کے جائز حقوق اور مفادات کے تحفظ اور مذہبی تفریق کے بغیر تمام لوگوں کی بہبود کی ذمہ دار ہے نیز اسے فرقہ وارانہ تعصب کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیے۔
- حکومت پاسپورٹ پر مذہبی وابستگی بھی درج کرتی ہے اور قومی شناختی کارڈ کے لیے دی جانے والی درخواستوں میں بھی اس کا تذکرہ لازم ہے۔ مسلمان قرار دیے جانے کے خواہش مند لوگوں کو یہ حلف دینا لازمی ہے کہ وہ محمد کو آخری نبی تسلیم کرتے ہیں اور احمدیہ تحریک کے بانی کو جھوٹا نبی اور اس کے پیروکاروں کو غیر مسلم سمجھتے ہیں۔
- آئین کی رو سے ملک کے صدر اور وزیر اعظم کا مسلمان ہونا لازم ہے۔ تمام اعلیٰ حکام بشمول ارکان پارلیمنٹ کو حلف دینا ہوگا کہ وہ ملک کے اسلامی تشخص کا تحفظ کریں گے۔
- انسانی حقوق کی شق 10 کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصے میں ہے کہ ہر کسی کو آزادیِ اظہار کا حق حاصل ہے جس میں حکومت کی مداخلت نہیں ہوگی۔ اسی شق کے دوسرے حصے میں آزادیِ اظہار پر قدغنیں بھی لگائی گئی ہیں کہ آزادیِ اظہار کے ساتھ فرائض اور حقوق بھی شامل ہیں، اور یہ آزادی کسی جمہوری معاشرے کے قانون کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے رسومات، حالات، ضوابط کے ماتحت ہے اور اس کی آڑ میں کسی فرد یا مذہب کے جذبات مجروح نہیں کیے جاسکتے۔
- قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں مذہبی اقلیتوں کے لیے مخصوص نشستیں رکھی گئی ہیں۔ 342

ارکان پر مشتمل قومی اسمبلی میں مذہبی اقلیتوں کے لیے 10 نشستیں مخصوص ہیں۔ خیبر پختونخوا کی صوبائی اسمبلی میں مذہبی اقلیتوں کے لیے تین، پنجاب میں آٹھ، سندھ میں نو اور بلوچستان میں تین نشستیں مخصوص ہیں۔

خلاصہ کلام

ہر معاشرے میں ہر فرد کو انفرادی طور پر اس کے عقیدہ، افکار و نظریات، ضمیر، مذہب کی آزادی حاصل ہے۔ اور اسی آزادی سے ہی معاشرے میں امن و استحکام قائم ہوتا ہے۔ انسانی تاریخ میں معاشروں کے پھلنے پھولنے میں انفرادی و اجتماعی مذہبی عقیدے اور اظہار کی آزادی کا اہم کردار رہا ہے۔ ہر ایک عقیدہ اور ضمیر لوگوں کو امن، رواداری اور انصاف کے فروغ کی ترغیب دیتا ہے، یہ الگ بات ہے کہ کوئی اپنی مذہبی مقدس کتاب اور اپنے مذہب اور انسان ہونے کے ناطے اپنے ضمیر کے مطابق عمل کرتا ہے یا نہیں۔

مگر افسوس آج دنیا انسانی حقوق کے عالمگیر اعلامیے کے تصور سے کہیں دور ہے جس کے مطابق ہر فرد کو فکر، ضمیر، اور مذہب کی آزادی میسر ہے۔ آج دنیا بھر میں اس حق پر حملے ہو رہے ہیں جو بنیادی طرف سے انسان کا انفرادی حق ہے اور یہ وہ حق ہے جو انسان کو وراثت میں ملا ہوا ہے۔ آج دنیا کی قریباً 80 فیصد عالمی آبادی میں انسان کا یہ حق سختی سے محدود کر دیا گیا ہے۔ آج معاشرے میں دہشت گردی کا بازار گرم ہے۔ ہر سو پر خطر ماحول بنا ہوا ہے۔ آئے روز بے شمار لوگوں کو مذہب، عقیدے یا عقیدہ نہ رکھنے کی بنیاد پر ایذا رسانی، جبر اور امتیازی سلوک کا سامنا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے خلاف کوئی ایسا پروپیگنڈا نہیں جو دشمنوں نے نہ کیا ہو، کوئی ایسی سازش نہیں جو دشمنوں نے نہ کھیلی ہو، کوئی ایسی چال نہیں جو دشمنوں نے نہ چلی ہو۔ حتیٰ کہ اسلام اور اس کے بنیادی عقائد کے بارے میں بھی سخت سے سخت تنقید کی جا رہی ہیں۔ اکثر اوقات تو اسلام اور اس کے قوانین کے بارے میں مبینہ انداز میں مکمل جھوٹ پر مبنی مبالغہ آمیز کہانیاں بھی بیان کی گئی ہیں۔ آج غیروں سے مسلمانوں کا عقیدہ محفوظ نہیں، جان محفوظ نہیں، مال عزت شہرت محفوظ نہیں۔ لیکن مسلمان علمی مباحثے پر کبھی

اعتراض نہیں کرتے کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ عمل اسلام کے بارے میں جاری مباحثے کا حصہ ہے اور یہ سب کچھ آزادیِ اِظہارِ رائے کی حدود کے اندر ہے۔ کیونکہ دین اسلام آپس میں محبت ،امن ،اتحاد کا درس دیتا ہے۔ ، لیکن مسلمان انہیں نہ صرف برداشت کرتے ہیں بلکہ رواداری کا رویہ بھی اپنائے ہوئے ہیں۔ لیکن جب اِظہارِ رائے کی آزادی کے اس حق کا غلط طور پر استعمال کرتے ہوئے اسلام کی سب سے مقدس ترین آسمانی کتاب قرآن اور مقدس ترین ہستی صاحبِ قرآن ﷺ کی واضح طور پر توہین کی جاتی ہے تو اس سے لازمی طور پر مسلمانوں میں اِضطراب اور اِشتعال پیدا ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرے کا امن داؤ پر لگ جاتا ہے۔ اور بین الممالک قائم اتحاد ٹوٹا نظر آتا ہے۔

پاکستان میں مذہبی آزادی کا تصور اور علماء کا کردار

مجتبیٰ محمد راٹھور

پاکستان میں مذہبی آزادی کی صورتحال بارے بہت کچھ کہا جاتا ہے اور اس کی بہتری کے لیے تجاویز بھی تسلسل کے ساتھ زیربحث رہتی ہیں۔ اس ضمن میں ایک پہلو مذہبی طبقے کا بھی ہے۔ عام تأثر یہ بن گیا ہے کہ ملک میں علماء کا کردار اس پہلو میں منفی ہے۔ نہ صرف عملی تناظر میں، بلکہ علمی و اجتہادی حوالے سے بھی۔ لیکن یہ تأثر اس لیے درست نہیں ہے کہ عوام کا زیادہ تر ربط تحریکی طبقے کے ساتھ ہوتا ہے جو افراط و تفریط کا شکار رہتا ہے۔ اہل علم اور فقہاء مذہبی آزادی کے قائل ہیں اور اس کے تحفظ کا ریاست سے مطالبہ کرتے ہیں۔ پاکستان میں علماء کا ایک بڑا طبقہ اسی فکر کا قائل ہے جسے عام کرنے کی ضرورت ہے۔ زیرنظر مضمون میں اس پہلو کی اہم جزئیات پر تفصیل سے بات کی گئی ہے۔ مضمون نگار ’اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ آف سوشل سائنسز‘ کے ڈائریکٹر ہیں اور سماجی مسائل پر مختلف ریسرچ پیپرز اور کتابیں لکھ چکے ہیں۔

تعارف

عام فہم زبان میں مذہبی آزادی(Religious Freedom)سے مراد یہ ہے کہ ہر فرد کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ جس مذہب یا عقیدہ کو اختیار کرنا چاہے کر سکتا ہے۔ وہ اپنے اختیار کردہ مذہب یا عقیدہ پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ اور اشاعت میں بھی خود مختار اور آزاد ہے۔ یہ فرد کا ایک ایسا بنیادی حق ہے جو دنیا کی ہر ریاست اور ہر کونے میں تسلیم کیا جاتا ہے مگر کئی ریاستوں میں اس بنیادی حق کو سکیورٹی کے ساتھ مشروط کر دیا گیا ہے، جیسا کہ اکثر مذہبی ریاستوں میں دیکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ دور میں انسان کے مذہبی آزادی کے اس بنیادی حق کو خود مذہب کے مبلغین اور مذہب کے ماننے والوں کی طرف سے بھی کئی خطرات کا سامنا ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب کی موجودہ تعلیمات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو دینِ اسلام ہی وہ واحد دین ملتا ہے جس نے فرد کے اس بنیادی حق کو تسلیم کیا ہے۔ قرآن کریم میں مذہبی آزادی کے حوالے سے اکثر علمانے جس آیت کو سب سے زیادہ موضوع

بحث قرار دیا ہے وہ آیت مبارکہ 'لا اکراہ فی الدین'[1] ہے۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ دین میں کوئی جبر نہیں،اسلام نے ہدایت اور گمراہی کے دو الگ الگ راستے واضح کر دیے ہیں اور یہ انسان پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ کس راستے کو اختیار کرتا ہے۔اسی لیے تمام علماء اس بات پر متفق ہیں کہ کسی کو جبراً مسلمان نہیں بنایا جاسکتا، کیونکہ ایمان کا تعلق قلب سے ہے اور قلبی ایمان جبر سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ دلائل، اعلیٰ اخلاق اور مواعظ حسنہ سے دلوں میں نفوذ کرتا ہے۔

ریاستی و قانونی جبر مذہبی آزادی کے خلاف

یہ بات تو درست ہے کہ دینِ اسلام ہر گز اسلام کے قبول کرنے میں زبردستی کا قائل نہیں ہے مگر اس کے ساتھ اسلام اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ کوئی بھی شخص مذہبی آزادی کی آڑ میں دوسروں کی دل آزاری اور معاشرے کے لیے اذیت کا باعث بنے۔دین اسلام نے مذہبی آزادی کی کچھ حدود و قیود بھی متعین کر دی ہیں اور اس کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا حکم اور سزا و جزا کا ایک باقاعدہ نظام بھی قائم کیا۔دنیا میں انسانی حقوق کے باب میں آزادی کے مفہوم میں یہ بات زیادہ زیر بحث ہے کہ ریاستی قوانین کے علاوہ کسی دین یا مذہب کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ انسان کی قانونی، مذہبی یا سیاسی آزادی کو محدود کرے۔تاہم عملی طور پر اس وقت اسلامی یا ریاستی قوانین مصالح کی بناء پر آزادی کو محدود کر سکتے ہیں۔فرق صرف یہ ہے کہ دنیا کی ریاستیں انسان کی آزادی کو محدود کرنے کے لیے مادی مصالح کو ترجیح دیتی ہیں اور مذہب معنوی مصالح کو بھی مدنظر رکھتا ہے۔دنیا کی جدید ریاستیں آزادی کے بارے میں یہ حدود و قیود قوانین کی شکل میں نافذ کرتی ہیں، اس لیے کہا جاتا ہے کہ افراد کے لیے آزادی قانون کی حد تک ہے یعنی انسان وہاں تک آزاد ہے جہاں تک قانون اس کو اجازت دیتا ہے۔مذہبی آزادی کی بحث میں بھی یہ بات مسلمہ حقیقت بن چکی ہے کہ یہ آزادی اس حد تک ہے کہ جب تک دوسروں کے حقوق پامال نہ ہوں، مگر یہاں پر بھی یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ان حقوق کا تعین کون کرے گا۔ریاست یا مذہب؟

---

[1] البقرۃ:۲۵۶

مذہبی آزادی کے تناظر میں اسلام پر اعتراضات

مذہبی آزادی کی اس بحث میں ہمیں اسلام کے حوالے سے دو قسم کے اعتراضات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اول یہ کہ اسلام میں مرتد کی سزا موت کیوں ہے؟ جب کہ اسلام تو کہتا ہے کہ دین میں جبر نہیں۔ اگر کوئی اسلام کو چھوڑ کر کسی اور مذہب کو اختیار کر لیتا ہے تو اس کی سزا اسلام میں موت کیوں ہے؟ یہ سوال اہم ہے کہ کیا ارتداد یعنی اسلام قبول کرنے کے بعد دوبارہ کافر ہو جانے کی سزا مذہبی آزادی کے تصور کو ختم کر دیتی ہے اور کیا موجودہ دور میں قومی ریاست کے تصور میں اس سزا کا اطلاق ممکن ہے؟ علمائے کرام اور مفسرین اس اعتراض کا مدلل جواب دیتے ہیں۔ ان کے بقول اسلامی نقطۂ نظر میں مذہب اسلام کو چھوڑنا یعنی مرتد ہو جانا انسان کیلئے ایسی بڑی مصیبت ہے جو دنیا و آخرت ہر اعتبار سے انسان کو برباد کرنے والی ہے۔ اگر کوئی شخص اسلام سے پھر جائے یعنی مرتد ہو جائے تو پہلے اسے دوبارہ مذہب اسلام قبول کرنے کی ترغیب دی جائیگی اور حکمت و بصیرت کے ساتھ ہر ممکن کوشش کی جائیگی کہ وہ دوبارہ مذہب اسلام اختیار کر لے تاکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے دردناک عذاب سے بچ جائے۔ اگر مرتد مذہب اسلام کو دوبارہ اختیار کر لیتا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کے ساتھ کلمہ شہادت پڑھنا ہو گا لیکن اگر کوئی مرتد دوبارہ اسلام قبول کرنے کیلئے تیار نہیں تو جس طرح دنیاوی حکومت کے خلاف بغاوت کرنے والوں کو پھانسی پر لٹکایا جاتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے باغی کو بھی اسلامی حکومت قتل کرائے گی جیسا کہ ابتدائے اسلام سے آج تک مفسرین، محدثین، فقہاء و علمائے کرام نے قرآن و حدیث اور خلفائے راشدین کے اقوال و افعال کی روشنی میں فیصلہ فرمایا ہے۔

ارتداد کی سزا

فقہا کے نزدیک مرتد درحقیقت مذہب کا باغی ہوتا ہے، اور باغی کی سزا تمام مہذب ممالک کے قوانین میں قتل مقرر ہے، تاہم شریعت مطہرہ نے مرتد مرد و خاتون کی سزا میں اتنی رعایت رکھی ہے کہ مرتد اگر مرد ہو تو ابتدائی طور پر اسے تین دن تک گرفتار رکھا جائے گا، اس دوران اسلام کے حوالے سے اس کے شک و شبہات دور کرنے کی کوشش کی جائے گی، پس اگر کوشش کامیاب

ہو جائے اور مرتد اسلام قبول کرنے پر راضی ہو جائے تو اسے آزاد کر دیا جائے گا، تاہم اگر وہ اپنے ارتداد پر قائم رہتا ہے، تو تین دن بعد اسے قتل کر دیا جائے گا، اور یہی حکم مرتد خاتون کا ہے، بس فرق اتنا ہے کہ مرتد خاتون کو قتل نہیں کیا جائے گا، تاہم اسے قید رکھا جائے گا، تاوقتیکہ وہ توبہ تائب ہو کر دوبارہ اسلام میں داخل ہو جائے۔ دوسرا مرتد کو گرفتار یا قتل کا اختیار حکومت وقت کو ہے، حکومتِ وقت کے علاوہ عوام الناس میں سے کسی کو شریعت نے یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ مرتد کو بذات خود سزا دے، البتہ عوام الناس کی ذمہ داری ہے کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کی وساطت سے اس شخص کو ارتداد سے واپس لائیں۔ لیکن یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ موجودہ دور میں کوئی ایسی اسلامی ریاست نہیں جس نے اس حوالے سے کوئی قانون سازی کی ہو یا مرتد کے حوالے سے کوئی احکامات جاری کئے ہوں۔ پاکستان میں بھی جب احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا تو کسی نے یہ نہیں کہا کہ وہ مرتد ہیں انہیں قتل کیا جائے، بلکہ انہیں صرف کافر قرار دیا گیا۔ مرتد کی سزا کے قوانین کی عدم موجودگی اس لحاظ سے بھی نہیں کی جاتی کیونکہ اس وقت مسلمانوں کے اندا اتنے فرقے بن چکے ہیں جو ایک دوسرے کو ہی کافر قرار دیتے ہیں، اس صورتحال میں مرتد کا حکم کون اور کیسے لگائے گا۔

قانون توہینِ رسالت پر اعتراض

مذہبی آزادی کے حوالے سے دوسرا اعتراض توہین رسالت کے قوانین کے بارے میں آتا ہے کہ یہ قوانین مذہبی آزادی اور اظہار رائے پر پابندیاں لگاتے ہیں۔ عام طور پر اکثر مسلم ممالک میں توہین رسالت کے حوالے سے قوانین بنائے گئے ہیں۔ اس میں عمر قید سے لے کر پھانسی تک کی دفعات ہیں۔ اب جس قانون پر ریاست پاکستان پر اعتراض کیا جاتا ہے اگر اس کا جائزہ لیا جائے تو اس کی جڑیں برطانوی ہند میں ملتی ہیں اور پیو ریسرچ سینٹر کے 2019 میں کئے گئے ایک نئے تجزیے سے پتا چلتا ہے کہ دنیا بھر کے 198 میں سے 79 ممالک توہین مذہب پر پابندی کے قوانین یا پالیسیاں رکھتے تھے۔ یہ توہین رسالت کا قانون محض پاکستان اور بنگلہ دیش میں ہی نہیں بلکہ کم و بیش دنیا کے 40 فیصد ممالک میں مختلف اشکال میں موجود رہا ہے اور بیشتر میں اب بھی موجود ہے۔ مقدس ہستیوں کا یہ قانون 1927 میں اس وقت برٹش ہند میں نافذ کیا گیا جب غازی علم الدین کی شہادت کے بعد

1880 کے انڈیا ایکٹ میں ترمیم کی گئی اور اس میں 295اے کا اضافہ کیا گیا جس کے تحت کسی بھی مذہب کے بانی کی توہین قابل گرفت قرار دی گئی بعد میں اس میں ترامیم کی جاتی رہیں۔اس وقت بھی عالمی سطح پر کئی ریاستوں کے حکمرانوں مثلاً روس وغیرہ نے مسلمانوں کی تائید کرتے ہوئے اس بات پر زور دیا کہ مذاہب کی بزرگ ہستیوں کی توہین کو ایک بین الاقوامی جرم قرار دیا جائے اور اس کے لئے عالمی سطح پر قوانین بنائے جائیں۔اس لئے عالمی سطح پر اس بات پر غور کرنے کہ مذاہب کی مقدس شخصیات کی توہین مذہبی آزادی کے دائرہ کار میں ہر گز شامل نہ کی جائے۔

اسی طرح ایک اسلامی ریاست میں اسلام اپنی کسی بھی تعلیم کو لوگوں پر زبردستی نہیں تھوپتا ہے، بلکہ وہ لوگوں کو غور و فکر کا موقع فراہم کرتا ہے۔ حق و باطل کے امتیاز کو واضح کرتا ہے۔ ضلالت و گمراہی اور نجات و فلاح کے راستے سے لوگوں کو روشناس کراتا ہے۔ قرآن کریم کی بہت سی اور مختلف نصوص بھی کسی شخص کے اس عقیدے کو قبول کرنے کے حق کی تصدیق کرتی ہیں جس میں اس کا دل مطمئن ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایمان اور کفر کے درمیان بھی انتخاب کرنے کی آزادی دے رکھی ہے۔:"فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ"[2](اب جو چاہے، ایمان لے آئے، اور جو چاہے کفر اختیار کرے۔) اور خدا تعالی اپنے رسول ﷺ کو بھی یہی ہدایت دیتے ہیں کہ جب حق اور بھلائی کا راستہ واضح ہو جائے تو عقیدہ کا انتخاب کرنے کی آزادی کو اس شخص پر چھوڑ دیا جائے اور وہ فرماتے ہیں کہ :"أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ"[3](پھر کیا تم لوگوں پر زبردستی کرو گے تاکہ وہ سب مومن بن جائیں۔)

پاکستان میں مذہبی آزادی کا ریاستی تصور

پاکستان ایک اسلامی ملک ہے جس میں بلا تفریق مسلک و مذہب تمام شہریوں کو برابر کے حقوق حاصل ہیں۔ یہاں اقلیتوں کو انکے مذہب کے مطابق عبادت کرنے کی پوری آزادی ہے۔

[2] الکہف:29

[3] یونس:99

آئین کے آرٹیکل نمبر 20 کے مطابق: قانون، امن عامہ اور اخلاق کے تابع ہر شخص کو اپنے مذہب کی پیروی کرنے، اس پر عمل کرنے اس اسکی تبلیغ کرنے کا حق ہوگا اور ہر مذہبی گروہ اور اسکے ہر فرقے کو اپنے مذہبی ادارے قائم کرنے، برقرار اور انکا انتظام کرنے کا حق ہوگا۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آئین پاکستان تو ہر شہری کو مذہبی آزادی کا حق دیتا ہے مگر کیا ہم واقعی ہر شہری کو اپنے مذہب کی پیروی کرنے، اس پر عمل کرنے اور سب سے بڑھ کر اس کی تبلیغ کرنے کا حق دے سکتے ہیں؟ کیونکہ مسلمانوں کی اکثریت اس بات کی اجازت نہیں دیتی اور نہ ہی ان کی حمیت کو یہ گوارا ہوتا ہے کہ ایک غیر مسلم ان کے محلے میں کھڑا ہو کر اپنی مشرکانہ عبادت کرنے لگے یا اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے لگے۔ پاکستان میں اقلیتی مذاہب میں محض ہندو، سکھ، مسیحی، یہودی، پارسی وغیرہ ہی شامل نہیں ہیں بلکہ دوسری آئینی ترمیم کے تحت جماعت احمدیہ کو بھی ایک غیر مسلم اقلیتی مذہب قرار دیا جا چکا ہے۔ کیا مسلمان اکثریت واقعی ان اقلیتوں کو یہ حق دے سکتے ہیں کہ وہ اپنے مذہب کی کھلے عام تبلیغ کریں اور معصوم مسلمانوں کو گمراہ کر ڈالیں؟ یہ بات حقیقت ہے کہ قوانین تو بنا دیے جاتے ہیں مگر ان کے نفاذ کے رویے معاشرے میں پنپتے ہیں۔

اس وقت صورتحال یہ ہے کہ ریاست مذہبی آزادی کے ان قوانین کو نافذ کرنے کی تگ و دو میں ہے مگر معاشرے کے مجموعی رویے ان پر قدغن لگانا چاہتے ہیں۔ مثلاً ہر ایک مسلک یہ چاہتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو ان کے مسلک یا عقیدہ کے پرچار سے روکا جائے۔ اسی طرح مسلمانوں کی اکثریت غیر مسلموں کو کھلے عام تبلیغ کی اجازت نہیں دیتی۔ جس کا نتیجہ مذہبی فسادات کی صورت میں نکل آتا ہے۔ پاکستان نے ان فسادات کا سامنا کیا ہے مگر معتدل مذہبی رہنماؤں اور علماء نے ہمیشہ مذہبی آزادی، مذہبی رواداری اور ہم آہنگی کو قائم کرنے کے لئے ہمیشہ کردار ادا کیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ مختلف سماجی تنظیمیں اور ادارے بھی مذہبی آزادی اور مذہبی ہم آہنگی کے فروغ کے لئے علماء کے ساتھ مل کر کاوشیں کر رہے ہیں۔

مذہبی ہم آہنگی کی ضرورت

درحقیقت ملک کے اندر مذہبی آزادی کے تصور کو اسی وقت تقویت مل سکتی ہے کہ جب تمام مذاہب اور مسالک کے ماننے والے ایک دوسرے کے وجود کو تسلیم کریں اور مذہب اور مسالک کی اس تقسیم کو قبول کریں۔اس کی واحد صورت بین المذاہب اور بین المسالک ہم آہنگی کا قیام ہے۔اس وقت پوری دنیا میں مذہبی ہم آہنگی کو فروغ دینے کی کوششیں ہو رہی ہیں،اس کی بنیادی وجہ مذہبی انتہا پسندی کا مقابلہ کرنا اور عدم برداشت کے بڑھتے ہوئے رویوں کا سدباب کرنا ہے۔آج کے اس دور میں جب دنیا ایک گلوبل ویلیج بن چکی ہے ، بین المذاہب ہم آہنگی کو فروغ دینے کی ضرورت ہے۔مذہبی انتہا پسندی اور شدت کے اس عفریت نے ہمارے معاشرے کو اس وقت اس قدر اپنی شدید لپیٹ میں لے رکھا ہے کہ ہم میں سے ہر آدمی اپنے مذہبی عقائد و نظریات کو جبراً دوسروں پر مسلط کرنے کا خواہاں ہے جس کی وجہ سے معاشرہ بدامنی، فتنہ وفساد اور قتل وخونریزی کا شکار ہے۔دنیا امن کا گہوارہ اسی وقت بنے گی جب تمام مذاہب کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رہنا سیکھیں گے۔پاکستان میں بھی ان واقعات کی روک تھام کے لیے تمام مذاہب کے ماننے والوں کو ایک دوسرے کے ساتھ احترام اور رواداری کے ساتھ ایک ساتھ رہنے کی ضرورت ہے۔

علمائے کرام کا کردار

علماء کرام اس معاملے میں اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں کہ وہ معاشرے میں امن، برداشت، رواداری اور تمام مذاہب میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ان تمام ایسی غلط فہمیوں کو دور کریں جو کہ غیر مسلم کے ساتھ نفرت انگیز رویوں کا باعث بنتی ہیں۔اقلیتوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کیا جائے جو کہ ہمارے دین کی اہم تعلیمات میں شامل ہے اور خود سرور دوعالم ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں اس کا عملی نمونہ پیش کیا ہے، کیونکہ میثاق مدینہ اس کی ایک زندہ مثال ہے۔اسی میثاق سے کی بدولت ریاست مدینہ میں امن وامان کا قیام ممکن ہوا، ظلم وناانصافی کا دور ختم ہوا، انسانیت کی قدر کا درس دیا گیا اور یہ تصریح کی گئی کہ مذہبی آزادی کے بارے کسی فرد یا قبیلے کے حقوق کو پامال نہیں کیا

جائے گا۔ میثاق مدینہ مذہبی ہم آہنگی کی بہترین مثال ہے جو کہ دنیا میں سب سے پہلے پیغمبر اسلام رحمتِ دو عالم ﷺ نے پیش کی۔

پاکستان میں مذہبی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے حکومتی سطح پر اہم کاوشیں ہو رہی ہیں جس میں تمام مذاہب اور مسالک کے علماء اور مذہبی قائدین کو شامل کیا جا رہا ہے۔ اقلیتی اور مذہبی امور، انسانی حقوق اور دیگر اہم وزارتیں اس سلسلہ میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ پیغام پاکستان اور نیشنل ایکشن پلان جیسی دستاویز مذہبی انتہا پسندی اور دہشت گردی کو کچلنے میں معاون ثابت ہو رہی ہیں۔ علاوہ ازیں سول سوسائٹی اور دیگر مذہبی ادارے بھی مختلف مکتب فکر اور مذاہب کے درمیان ہم آہنگی کے فروغ کے لیے ملکی سطح پر فعال ہیں۔ مختلف مذہبی مکتبِ فکر اور طبقات سے وابستہ قائدین کے لیے تربیتی ورکشاپ کا انعقاد کیا جا رہا ہے جس میں شرکاء کی صلاحیت اور استعداد میں اضافہ کیا جاتا ہے جنہیں بروئے کار لا کر وہ ہم آہنگی کے فروغ اور پائیدار امن کی تشکیل میں اپنا بھرپور کردار ادا کر سکیں۔ ان نشستوں میں انہیں ایک پر اعتماد ماحول میں ایک دوسرے کے ساتھ تعلیم و ترقی اور امن و امان کے فروغ کے لیے معلومات و تجربات کے باہمی تبادلہ کا موقع فراہم کیا جاتا ہے تاکہ وہ مشترکہ اقدار اور امن و ہم آہنگی کے لیے مذہبی تعلیمات کو سمجھتے ہوئے مختلف مسالک و مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد کے درمیان حائل خلیج کو کم کرنے اور باہمی احترام اور ہم آہنگی کو بڑھانے میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ ان تربیتی نشستوں میں ان قائدین کو ایک دوسرے کو درپیش مسائل کے بارے میں جاننے اور مسائل کو حل کرنے کے نقطۂ نظر معلومات اور تجربات کے باہمی تبادلہ کا موقع ملتا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف مسالک و مذاہب کے درمیان صحت مند مکالمے کے ذریعے باہمی افہام و تفہیم کا فروغ کیا جا رہا ہے۔ بین المذاہب اور بین المسالک سیمینار، کانفرنسز، ورکشاپس، اور ایک دوسرے کی عبادت گاہوں کے دورے ہم آہنگی کو فروغ دینے اور فاصلے کم کرنے میں بہت مفید ہیں۔

جمہوریت میں ایک دوسرے کا احترام

ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام مذاہب کے ماننے والے عبادت گاہوں کو دیگر مسالک و

مذاہب کے خلاف استعمال کرنے کے بجائے ان عبادت گاہوں کو امن و آشتی اور محبت و احترام کے فروغ کے مراکز بنائیں۔ مختلف مذاہب کے روحانی پیشوا، اپنے پیروکاروں پر واضح کریں کہ دنیا کا کوئی بھی مذہب، کسی بھی مذہب سے نفرت کرنا نہیں سکھاتا۔اس کے ساتھ ساتھ معاشرے کے پسے ہوئے طبقات کی بلا تفریق مسلک و مذہب مدد کرنے کی کوششیں تیز کی جائیں تاکہ وہ غربت اور جہالت کے خاتمہ میں اپنا کردار ادا کر سکیں۔ جمہوریت میں شہریوں کو ان کے مذہبی عقائد سے قطع نظر ریاست کے رکن کی حیثیت سے مساوی درجہ فراہم کیا جاتا ہے۔ آئین کے ساتھ ساتھ بنیادی انسانی حقوق کے اعلامیے 1949 (UDHR) کے تحت پاکستان جیسے جمہوری ملک میں ریاست قانونی اور اخلاقی طور پر ذمہ دار ہے کہ تمام شہریوں کے ساتھ مساوی سلوک کرے اور آبادی کے کمزور اور غیر محفوظ طبقات کے لیے مساوی پالیسیاں اپنائے تاکہ مذہبی ہم آہنگی کے حصول کو ممکن بنایا جا سکے۔

مذہبی جماعتوں کے منشور میں اقلیتوں کے حقوق

محمد اعجاز

مذہبی سیاسی جماعتیں پاکستان کی سیاست میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں۔ وہ چونکہ زیادہ تر اسلامی نظام کی بات بھی کرتی ہیں تو عام طور پہ ان سے متعلق یہ تأثر بن گیا ہے کہ ان کا اقتدار اقلیتوں کے لیے غیرمحفوظ ہے۔حالانکہ مذہبی سیاسی جماعتوں نے اقلیتوں کے حقوق کو اپنے سیاسی منشور کا حصہ بنایا ہوا ہے اور پانچ سال صوبہ خیبرپختونخوا میں حکومت بھی کرچکی ہیں جہاں انہوں نے اقلیت کو تحفظ فراہم کیا۔ البتہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان جماعتوں کو اقلیتوں کے حوالے سے کھل کر اور زیادہ واضح انداز میں مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ زیرنظر مضمون میں اسی سے متعلق تفصیل بتائی گئی ہے۔ محمد اعجاز، امپیریل کالج آف بزنس سٹڈیز، لاہور میں تدریس کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

پاکستان میں جتنی بھی سیاسی جماعتیں ہیں، چاہے مذہبی ہوں یا غیر مذہبی، ان سب کا ایک جماعتی منشور ہوتا ہے۔ اس میں ملک کے اہم معاملات بارے جماعت کا موقف درج ہوتا ہے۔ اسی طرح سے اقلیتوں سے متعلق بھی ان کا نقطہ نظر شامل ہوتا ہے۔ چونکہ پاکستان میں کئی مذہبی سیاسی جماعتیں فعال ہیں تو ان کے ہاں بھی اس بارے موقف پیش کیا جاتا ہے۔ ذیل میں ان جماعتوں کے موقف کا خلاصہ پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اختصار کے ساتھ تجزیہ بھی کیا جائے گا۔

جمعیت علمائے پاکستان: اقلیتوں کے مذہبی اور معاشرتی معاملات میں کوئی مداخلت نہیں دی جائے گی۔ انہیں اپنے مذہب کے مطابق عمل کرنے کی آزادی ہوگی۔ البتہ کسی اسلامی اصول کے خلاف تبلیغ واشاعت کی اجازت نہ ہوگی۔[1]

جمعیت علمائے اسلام پاکستان: پاکستان کی موجودہ غیر مسلم اقلیت کو اسلام کی طرف سے عطا کردہ مذہبی آزادی، شہری حقوق اور حصول انصاف کے مواقع بلاامتیاز اور یکساں طور پر حاصل رہیں

---

1 محمد عثمان، پروفیسر، پاکستان کی سیاسی جماعتیں، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، س،ن، ص: 557

گے۔[2]

جماعت اسلامی: جماعت اسلامی اقلیتوں کو پاکستان کی آبادی کا اہم جزو سمجھتی ہے۔ ہماری حکومت اقلیتوں کو آئین کے مطابق حقوق اور مکمل تحفظ فراہم کرے گی۔اقلیتوں کے شخصی معاملات اور ان کی مذہبی اقدار اور رسوم کو ترجیح دی جائے گی۔ان کو تعلیم، روزگار اور دیگر شہری حقوق فراہم کیے جائیں گے۔ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت اور احترام کا خصوصی خیال کیا جائے گا۔ان کے ساتھ غیر منصفانہ اور غیر مناسب سلوک کا ازالہ کیا جائے گا۔اقلیتوں کے ووٹ ڈالنے اور نمائندے چننے کا آسان اور مؤثر طریقہ وضع کیا جائے گا۔

جمیعت اہل حدیث: اقلیتوں کو اسلام کے عطا کردہ جملہ شہری سماجی و سیاسی حقوق دیئے جائیں گے۔[3]

تحریک جعفریہ پاکستان: تحریک جعفریہ پاکستان کے منشور میں یہ شق شامل ہے کہ ہر شخص کو اپنے ضمیر کے مطابق عقیدہ اور مذہب کے اختیار کی آزادی ہو گی۔[4]

عوامی تحریک پاکستان: عوامی تحریک پاکستان کے منشور میں ہے کہ یہ تحریک ایسے معاشرے کی خواں ہے کہ جہاں انسانی حقوق اور ان کی سیاسی، مذہبی، ثقافتی اور سماجی آزادیوں کا پورا پورا احترام اور تحفظ ہو۔[5]

پاکستان میں مذہبی سیاسی جماعتوں کے منشور میں اقلیتوں کے حقوق پہ ہونے والا علمی تحریری کام پاکستانی مذہبی سیاسی جماعتوں کے منشور میں اقلیتوں کے حقوق کو تحریراً واضح کرنے کی بہت کم کوشش کی گئی ہے۔ذیل میں ان کی علمی کاوش کا جائزہ پیش کیا جارہا ہے۔

---

2 منشور اکل پاکستان، مرکزی جمیعت علمائے اسلام و نظام اسلام، کراچی انور حیہ، س،ن، ص:19

3 بخاری، تنویر، پاکستان میں سیاسی جماعتیں اور پریشر گروپ، ایور بک نیو بک پیلس، س،ن، ص:78

4 محمد عثمان، پروفیسر، پاکستان کی سیاسی جماعتیں، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، س،ن، ص:780

5 تحریک منہاج القرآن، پاکستان عوامی تحریک کا منشور(urdu/ 13775.8-6-2020/ ww.mining,org)۔

منشور جماعت اسلامی پاکستان: جماعت اسلامی نے اپنے منشور میں اقلیتوں کے حقوق کو بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ جماعت اسلامی پاکستان کے بانی سید ابوالاعلی مودودی اور دوسرے رہنماؤں نے بھی لٹریچر میں مختلف جگہ پہ تحریری کام کیا ہے۔ مثال کے طور پہ:

1–اسلامی ریاست:

مولانا مودودی اقلیتوں کے حوالے سے اپنی کتاب اسلامی ریاست میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ذمیوں کی دو اقسام ہیں:

- پہلی قسم جو اسلامی حکومت کا ذمہ قبول کرتے وقت کوئی معاہدہ کریں۔
- دوسرے وہ جو بغیر کسی معاہدہ کے ذمہ میں داخل ہوں۔

پہلی قسم کے ذمیوں کے ساتھ تو وہی معاملہ کیا جائے گا جو معاہدہ میں ہوا ہے اور دوسری قسم کے کے ذمی، تو ان کا ذمی ہونا ہی اس بات کو مستلزم ہے کہ ہم ان کی جان اور مال اور آبرو کی حفاظت کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ ان کے حقوق وہی ہوں گے جو مسلمانوں کے ہوں گے۔ ان کے خون کی قیمت وہی ہو گی، ان کی عبادت گاہیں محفوظ رہیں گی۔ ان کو مذہبی تعلیم کا انتظام کرنے کا حق دیا جائے گا اور اسلامی تعلیم ان پر جبراً نہیں ٹھونسی جائے گی۔ مولانا مودودی اقلیتوں کے پرسنل لاء کی وضاحت یوں کرتے ہیں:

"جہاں تک ذمیوں کے پرسنل لاء کا تعلق ہے تو وہ ان کی مذہبی آزادی کا ایک لازمی جزو ہے۔ اس لئے اسلامی حکومت ان کے قوانین کو جو ملکی قانون (Law of the land) سے نہ ٹکراتے ہوں، ان پر جاری کرے گی اور صرف ان امور میں ان کے پرسنل لاء کے نفاذ کو برداشت نہ کرے گی جن میں ان کا برا اثر دوسروں پر پڑتا ہو۔ مثال کے طور پر سودی لین دین کی اجازت نہ ہو گی"۔[6]

2–مولانا امین احسن اصلاحی اپنی کتاب اسلامی ریاست میں اقلیتوں کے حقوق کی وضاحت

---

[6] مودودی، ابوالاعلی، سید، اسلامک پبلی کیشنز، شاہ عالم مارکیٹ، لاہور جنوری 1967، ص:548

ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ:

''اسلامی قانون کے معاہد اہل ذمہ اور مفتوح اہل ذمہ (اہل عزوہ) میں جس نوعیت کا فرق کیا ہے اور جس بنا پر کیا ہے اس کو میں نے، جس حد تک غیر مسلموں سے متعلق مسائل سمجھنے میں اسے ضروری سمجھا تھا واضح کر دیا ہے۔ اس کو پیش نظر رکھ کر اب اس سوال پر غور کریں۔ پاکستان کے غیر مسلموں کا شرعی حکم کیا ہوگا؟ ان کی حیثیت معاہد اہل ذمہ کی ہوگی یا ان کو مفتوح اہل ذمہ کے حکم میں رکھا جائے گا؟ اس سوال کا جواب متعین ہو جانے کے بعد ان کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں کا فیصلہ کرنا نہایت آسان ہو جائے گا۔

میرا خیال ہے کہ اس حقیقت سے شاید ہی کوئی انکار کر سکے کہ پاکستان کے غیر مسلموں کو مفتوح اہل ذمہ قرار دینے کے لئے کوئی معمولی سی وجہ بھی موجود نہیں ہے۔ نہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے کوئی جنگ کی ہے اور نہ حکومت پاکستان کے حصہ میں آئے ہیں اور اس تقسیم کے متعلق ہر شخص جانتا ہے کہ یہ تقسیم دونوں قوموں کے ذمہ دار لیڈروں کے باہمی راضی نامہ سے ہوئی ہے، نہ کہ کسی جنگ یا فتح و تسخیر کے ذریعہ سے۔ اس وجہ سے تنہا یہی بات کرنی چاہئے کہ یہ غیر مسلم ایک باہمی راضی نامہ کے تحت ہمارے ساتھ شامل ہوئے ہیں۔

اس کے لئے کافی ہے کہ ان کو مفتوح و مغلوب رعایا کے زمرہ میں نہ رکھا جائے۔ بلکہ معاہد اہل ذمہ کے زمرہ میں رکھا جائے، لیکن یہاں یہی ایک وجہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی وجوہ ہیں جو ان کے معاملہ میں قابل لحاظ ہیں اور جن کی بنا پر ان کا معاہد ہونا بالکل متعین اور طے ہو جاتا ہے۔''

پھر اس کے بعد قانونی طور پر پاکستان میں ان کے تحفظ کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔

پاکستان میں غیر مسلموں کو خراج سے بری قرار دیتے ہیں۔ جذیہ اور ٹیکس میں بھی مشروط چھوٹ دیتے ہیں۔[7]

---

[7] اصلاحی، امین احسن، مولانا، دار التذکیر رحمن مارکیٹ، غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور سن 2006، ص: 222

مولانا مودودی اپنی کتاب الجہاد فی الاسلام میں اقلیتوں کے حقوق کے متعلق مزید لکھتے ہیں:

"امصار مسلمین میں ذمیوں کے جو معبد پہلے سے موجود ہوں ان سے تعرض نہیں کیا جا سکتا۔ اگر وہ ٹوٹ جائیں تو انہیں اسی جگہ دوبارہ بنا لینے کا حق ہے۔ لیکن نئے معبد بنانے کا حق نہیں۔ اسی طرح جو مقامات امصار مسلمین نہیں ہیں ان میں ذمیوں کو نئے معبد بنانے کی بھی عام اجازت ہے۔ اسی طرح جو مقامات "مصر" نہ رہے ہوں، یعنی امام نے ان کو ترک کر کے اقامت جمعہ واعیاد اور اقامت حدود کا سلسلہ بند کر دیا ہو ان میں بھی نئے معابد کی تعمیر اور اظہارِ شعائر جائز ہے"۔[8]

مولانا مودودی نے تفہیم القرآن میں مختلف جگہوں پہ اقلیتوں کے حقوق کی وضاحت کی ہے۔ فقہی کتب کے حوالہ جات کے ساتھ سیرت رسول ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور کے حوالہ جات بھی دیے ہیں۔

21 نومبر 2014 کو نائب امیر جماعت اسلامی حافظ محمد ادریس کا نوائے وقت میں ایک کالم بعنوان 'اسلام اور رواداری' شائع ہوا، اس کالم میں مصنف نے نبی اکرم ﷺ کی زندگی کی مثالوں سے غیر مسلموں کے ساتھ رواداری کو احسن انداز میں بیان کیا ہے۔ ساتھ ہی ضلع قصور میں مسیحی جوڑے کو زندہ جلا دینے پر ماورائے عدالت قتل کی سخت مذمت بھی کی ہے۔[9]

منشور عوامی تحریک پاکستان: جماعت کے منشور میں اقلیتوں کے حقوق کو واضح بیان کیا گیا ہے۔ 'اسلام میں اقلیتوں کے حقوق' ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی کتاب ہے۔ جو بہت عمدہ و اعلیٰ تحقیقی انداز سے لکھی ہوئی ہے۔ مصادر اسلام سے اقلیتوں کے حقوق کو بیان کیا گیا ہے۔ فقہی کتب کے حوالہ جات تفصیل سے دیے ہیں۔ کتاب میں لکھتے ہیں:

"حضور نبی اکرم ﷺ کی ان تعلیمات کی روشنی میں چودہ سو سال گزرنے کے باوجود آپ ﷺ سے لے کر ہر اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق کا تحفظ رہا۔ اقلیتوں سے حضور

---

[8] مودودی، سید، ابوالاعلیٰ، ادارہ ترجمان القرآن غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور سن 2014، ص: 284

[9] روزنامہ نوائے وقت لاہور، 21 نومبر 2014

نبی اکرم ﷺ کے حسن سلوک کا نتیجہ تھا کہ ان کا برتاؤ بھی آپ ﷺ کے ساتھ احترام پر مبنی تھا۔ ایک جنگ میں آپ ﷺ کا حلیف ایک یہودی جب مرنے لگا تو لوگوں نے اس سے پوچھا کہ تیری بڑی جائیداد ہے اس کا وارث کون ہو گا؟ تو اس یہودی نے کہا محمد رسول اکرم ﷺ میری جائیداد کے وارث ہوں گے۔ یہ اسلامی ریاست میں اقلیتوں سے حسن سلوک کا ایک غیر مسلم کی طرف سے اعتراف تھا۔ آپ ﷺ کا اہل کتاب کے علاوہ مشرکین (بت پرست اقوام) سے بھی جو برتاؤ رہا اس کی بھی تاریخ میں نظیر نہیں ملتی۔ مشرکین مکہ و طائف نے آپ ﷺ پر بے شمار مظالم ڈھائے، لیکن جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو آپ ﷺ کے ایک انصاری کمانڈر سعد بن عبادۃ نے ابو سفیان سے کہا: **الیوم یوم الملحمة**۔ "آج لڑائی کا دن ہے"۔ یعنی آج کفار سے جی بھر کر انتقام لیا جائے گا تو آپ ﷺ ناراض ہو گئے اور ان سے جھنڈا لے کر ان کے بیٹے قیس کے سپرد کر دیا اور ابو سفیان سے فرمایا: **الیوم یوم المرحمة**۔ "(آج لڑائی کا نہیں بلکہ) آج رحمت کے عام کرنے (اور معاف کر دینے) کا دن ہے"۔[10]

اسی طرح جمیعت علمائے پاکستان کے منشور میں اقلیتوں کے حقوق کی وضاحت کی گئی ہے۔[11]

اسی طرح جمیعت علمائے اسلام پاکستان کے منشور میں بھی تحریراً اقلیتوں کے حقوق کی وضاحت کی گئی ہے۔[12]

مزید برآں تمام مذہبی سیاسی جماعتوں کے نمائندے پاکستان میں اقلیتوں کے حقوق کے حوالے سے ہونے والے پروگرامات میں شرکت کر کے ان کے حقوق پہ بات کرتے رہتے ہیں۔ان کے دکھ درد میں شرکت کرتے ہیں، بعض پاکستانی مذہبی سیاسی جماعتیں اقلیتوں کا ذیلی نظم بھی رکھتی ہیں۔

---

10 طاہر القادری، ڈاکٹر، منہاج القرآن، اشاعت اول نمبر 2006

11 منشور، جمیعت علمائے پاکستان، دفتر لاہور، 1987، ص:22

12 محمد عثمان، پروفیسر، پاکستان کی سیاسی جماعتیں، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، س، ص:780

اس کے علاوہ پاکستان کے رسائل، جرائد اور اخبارات میں اقلیتوں کے تحفظ و حقوق پر مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔ برطانوی پرنس چارلس کے اپنی اہلیہ کے ساتھ دورے پہ آنے پر گورنر ہاؤس میں 2 ستمبر 2006 میں مختلف مذاہب کے نمائندگان کے ساتھ نشست کا اہتمام کیا گیا جن میں تمام مذاہب کے مندوبین نے اپنے مقالہ جات پیش کیے۔ مذہبی سیاسی جماعتوں کے نمائندوں نے اس میں شرکت کی اور اقلیتوں کے حقوق پر قرآن و سنت سے مزین مقالہ جات پیش کیے۔13

اقلیتی اُمور میں مذہبی سیاسی جماعتوں سے عدم تحفظ کیوں؟

مذہبی سیاسی جماعتیں پاکستان میں غلبہ اسلام اور تبلیغ اسلام کی ترویج کے لئے کوشاں ہونے کا دعوی کرتی ہیں۔ تاہم چونکہ پاکستان ایک جمہوری ملک ہے۔ اس لیے یہ جماعتیں جمہوریت کے ذریعے اقتدار کی خواں ہیں۔ پارٹی منشور پر اقتدار کے حصول کے بغیر کلی عمل ناممکن ہوتا ہے۔ مگر بعض دفعاتِ منشور ایسی ہوتی ہیں جن پر بغیر اقتدار کے بھی عمل ممکن ہوتا ہے ان میں وہ حقوق ہیں جو ہر انسان پر عائد ہوتے ہیں جیسے ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق۔

مذہبی سیاسی جماعتوں نے اقلیتوں کو اپنے منشور میں انہی حقوق کا تحفظ دیا ہے جن کا تحفظ اسلام نے اقلیتوں کے حقوق کے ضمن میں دیا ہے۔

عموماً مذہبی سیاسی جماعتوں سے متعلق کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں یہ جماعتیں اگر اقتدار میں آگئی تو دہشت گردی اور بدامنی بڑھے گی۔ اقلیتیں عدم تحفظ کا شکار ہو جائیں گی اور ایسے میں ان کے حقوق کی ضمانت کون دے گا۔ لیکن مشاہدہ اس کی صداقت نہیں کرتا۔ مذہبی سیاسی جماعتوں کا کردار صوبہ خیبر پختونخوا میں حکومت کے دوران واضح طور پر نظر آیا۔ پورے پانچ سالہ دورے اقتدار 2002 تا 2007 میں پانچ جماعتی سیاسی اتحاد کی حکومت میں اقلیتیں پہلے سے زیادہ پر امن رہی ہیں۔ آج بھی مذہبی سیاسی جماعتوں کے قائدین اقلیتوں کے تحفظ کے حقوق کی بات کرتے ہیں۔ بعض جماعتوں نے

---

13 ماہنامہ محدث، حسن مدنی، اکتوبر 2006 جلد: 38

باقاعدہ اقلیتوں کے حوالے سے ذیلی نظم بھی بنایا ہوا ہے۔

پاکستانی مذہبی سیاسی جماعتوں کے منشور میں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ اور غیر اسلامی ممالک کی مذہبی جماعتوں کے منشور کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو پتا چلتا ہے کہ پاکستانی مذہبی سیاسی جماعتیں زیادہ پرامن اور اقلیتوں کے حقوق کی محافظ ہیں۔اس امر کی دلیل یہ ہے کہ ان جماعتوں کا منشور اسلام کے بتائے ہوئے اصول و قوانین کے مطابق غیر مسلموں اور اقلیتوں کو جتنے حقوق عطا کرتا ہے مروج غیر مسلم مذہبی جماعتیں وہ کم ہی تسلیم کرتی ہیں مغرب میں اسلاموفوبیا اس کی بڑی مثال ہے۔

پاکستانی مذہبی سیاسی جماعتوں کے منشور میں جہاں اقلیتوں کو آزادی دی گئی ہے وہاں اقلیتوں کو اسلام کے خلاف ہرزہ رسائی سے روکا بھی گیا ہے۔ پاکستانی مذہبی سیاسی جماعتوں کے منشور اس بات کی بھی اقلیتوں کو اجازت نہیں دیتے کہ وہ قول، فعل یا تحریر سے کوئی ایسا قدم اٹھائیں یا ایسے اقدام کا حصہ بنیں جس میں اسلام اور انسانیت کے مسلمہ اصول کی خلاف ورزی ہو۔

اقلیتوں کی بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمانوں کے جذبات اور ایک دوسرے کے بنیادی حقوق کا تحفظ یقینی بنائیں۔ پاکستان میں ہندو، مسیحی، یہودی، سکھ اور دوسری اقوام تقریباً دس فیصد موجود ہیں۔انہیں ایک دوسرے کے عقائد اور مذہبی رسومات و شعائر کا خیال رکھنا ہوگا۔

اگرچہ مذہبی سیاسی جماعتوں کے منشور میں اقلیتوں کے حقوق کی بات کی گئی ہیں، پھر بھی ان کے منشور میں از سر نو اقلیتوں کے حقوق کا جائزہ لیتے ہوئے ترمیم و اضافے کے ساتھ صراحت و وضاحت کی مزید ضرورت ہے۔

قرآن و سنت کی روشنی میں قومی اور بین الاقوامی حالات کا جائزہ لیتے ہوئے، مذہبی سیاسی جماعتوں کو اپنے منشور میں کئی اہم چیزوں کو واضح کرنا چاہیئے اور اقوام عالم کو اعتماد میں لینا چاہیئے کہ ان کے اقتدار میں آنے سے اقلیتوں کے تحفظ حقوق کو تقویت ملے گا، اقوام عالم کے خدشات دور ہوں گے۔اس سے ان جماعتوں کے بارے میں شدت پسندی کا تاثر بھی کم ہو جائے گا۔

تجاویز

ا- مذہبی سیاسی جماعتیں پاکستان میں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کو اجاگر کرنے کے لیے تحریر و تقریر کے ذریعے عملی اقدامات کریں۔

ب- مختلف جگہوں پر پروگرام منعقد ہوں اور بین الاقوامی مذاہب میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کے موضوع پر سیمینار ہوں۔

ج- بین المذاہب سطح پر مذہبی رواداری، اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ جیسے عنوانات پر لیکچر ہوں۔

د- اپنے منشور کے ان حصوں کو جن میں اقلیتوں کے حقوق کی ضمانت دی گئی ہے، زیادہ واضح کریں اور کھل کر ان کو انتخابی اجتماعات کا حصہ بنائیں۔

پاکستان میں انتہاپسندی کا مسئلہ اور سول سوسائٹی کا کردار: ادارہ امن وتعلیم کا ماڈل

محمد حسین، غلام مرتضیٰ

پاکستان میں انتہاپسندی اور دہشت گردی کے عوامل اور اسباب یکطرفہ نہیں ہیں بلکہ یہ کئی مختلف شعبوں کے ساتھ جڑا ہوا مسئلہ ہے، چاہے اس کا اظہاریہ کسی ایک خاص صورت میں ہی کیوں نہ سامنے آرہا ہو۔ اس کے بعض محرکات مقامی ہیں تو کچھ ایسے بھی ہیں جو عالمی اور علاقائی پیچیدگیوں و مفادات کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ زیرنظر مضمون میں پہلے دہشت گردی کے محرکات کا مختصراً جائزہ لیا گیا ہے، اس کے بعد سماجی اثرات پر گفتگو کی گئی ہے کہ اس کے سبب معاشرہ کیسے منافرت و تقسیم کا شکار ہوگیا۔ آخر میں انتہاپسندی سے نمٹنے کے لیے سول سوسائٹی کے کردار پر بات کی گئی جس میں ادارہ امن وتعلیم کے ماڈل کے تعارف کے تحت خدمات کا جائزہ پیش کیا گیا۔محمد حسین امریکا میں مقیم ماہرِ تعلیم، مصنف اور تربیت کار ہیں۔اورغلام مرتضی ادارہ امن و تعلیم کے ڈائریکٹر ہیں۔

مذہبی آزادی کی دستوری ضمانت

اسلامی جمہوریہ پاکستان آئین پاکستان کے آرٹیکل ۲۰ کے مطابق کہتا ہے [1]: قانون، امن عامہ اور اخلاق کے تابع (الف) ہر شہری کو اپنے مذہب کی پیروی کرنے، اس پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کا حق ہوگا؛ اور (ب) ہر مذہبی گروہ اور اور اس کے ہر فرقے کو اپنے مذہبی ادارے قائم کرنے، برقرار اور ان کا انتظام کرنے کا حق ہوگا۔

آرٹیکل ۲۱ کے تحت کسی شخص کو ئی ایسا خاص محصول ادا کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا جس کی آمدنی اس کے اپنے مذہب کے علاوہ کسی اور مذہب کی تبلیغ و ترویج پر صرف کی جائے۔

---

1 اسلامی جموریہ پاکستان کا دستور۔ باب ا، بنیادی حقوق

آرٹیکل ۲۲ (۱) کے تحت کسی تعلیمی ادارے میں تعلیم پانے والے کسی شخص کو مذہبی تعلیم حاصل کرنے یا کسی مذہبی تقریب میں حصہ لینے یا مذہبی عبادت میں شرکت کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، اگر ایسی تعلیم، تقریب یا عبادت کا تعلق اس کے اپنے مذہب کے علاوہ کسی اور مذہب سے ہو۔

(۲) کسی مذہبی ادارے کے سلسلے میں محصول لگانے کی بابت استثنا یا رعایت منظور کرنے میں کسی فرقے کے خلاف کوئی امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا۔

(۳) قانون کے تابع: (الف) کسی مذہبی فرقے یا گروہ کو کسی تعلیمی ادارے میں جو کلی طور پر اس فرقے یا گروہ کے زیر اہتمام چلایا جاتا ہو، اس فرقے یا گروہ کے طلبہ کو مذہبی تعلیم دینے کی ممانعت نہ ہوگی؛ اور ب (ب) کسی شہری کو محض نسل، مذہب، ذات یا مقام پیدائش کی بنا پر کسی ایسے تعلیمی ادارے میں داخل ہونے سے محروم نہیں کیا جائے گا جسے سرکاری محاصل سے امداد ملتی ہو۔

(۴) اس آرٹیکل میں مذکور کوئی امر معاشرتی یا تعلیمی اعتبار سے پسماندہ شہریوں کی ترقی کے لیے کسی سرکاری ہیئت مجاز کی طرف سے اہتمام کرنے میں مانع ہوگا۔

پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پاکستان کا ہر شہری متنوع معاشرے میں مذہبی آزادی کے مکمل حصول کے ساتھ اپنی زندگی گزار رہا ہے جس آزادی کی ضمانت دستور پاکستان اسے دیتا ہے؟

پاکستان میں مذہبی دہشت گردی وانتہا پسندی کا مختصر جائزہ

پاک آرمی کے ترجمان ادارے "انٹر سروسز پبلک ریلیشنز" کے مطابق دہشت گردی کے خلاف جنگ کے دوران پاکستان میں مجموعی طور تقریباً 83ہزار سے زائد افراد مارے جا چکے ہیں اور کم و بیش 126ارب ڈالرز کا ملکی معیشت کو نقصان ہوا ہے۔[2] دہشت گردی اور انتہا پسندی کی اس خوف ناک لہر کی زد میں میں سکیورٹی اہل کار، عسکریت پسندی میں ملوث ہونے والے لوگ، اور بڑے

---

[2]https://gulfnews.com/world/asia/pakistan/83000-lives-lost-in-pakistans-war-on-terrorism-1.76428064

پیمانے پر عام شہری نشانہ بنے۔ شہروں علاقوں میں مذہبی اجتماعات اور جلوسوں اور بسوں میں سفر کے دوران بڑے پیمانے پر عام شہری نشانہ بنے اور سینکڑوں کی تعداد میں مختلف مسالک اور مذاہب کے مذہبی رہنما اور کارکن قتل ہوئے۔ ریاست کے مختلف ادارے، سکولز، ٹریننگ سنٹر، مذہبی مراکز و دیگر ادارے شامل ہیں۔ جس کے سبب ایک طویل عرصے تک پاکستان کو سیکیورٹی سٹیٹ کے طور پر سمجھا جاتا رہا۔

دہشت گردی کے محرکات

اس ناقابل تلافی نقصان کی وجوہات کا جائزہ لیا جائے تو بعض محرکات بین الاقوامی سیاست سے جڑے ہیں جبکہ بعض محرکات اندرونی ہیں۔ سابق سویت یونین اور متحدہ ریاست ہائے امریکہ کے درمیان سرد جنگ کا میدان پاکستان کا ہمسایہ ملک افغانستان کا بننا ہے۔ داخلی محرکات میں افغانستان اور کشمیر کے تناظر میں ستر اور اسی کی دھائی سے عسکریت پسندی کو باقاعدہ طور پر ریاستی پالیسی کے طور پر پروان چڑھایا گیا۔ افغانستان میں سابق سویت یونین کی پیشرفت کو روکنے اور اسے شکست دینے کے لیے امریکہ کی مدد سے ہماری ریاست نے مذہبی عسکریت پسندی کو بطور مؤثر ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جس کے نتیجے میں ایک طرف دنیا بھر سے عسکریت پسندوں کو افغانستان سے منسلک علاقوں میں ٹھکانے دیے جبکہ دوسری جانب پورے تعلیمی نظام و نصاب اور ذرائع ابلاغ کو اسلامائزیشن پر لگا دیا۔ بہت سے عسکری مراکز اور مدارس کھولے گئے۔ نائن الیون کی دہشت گردی کے واقعے کے بعد امریکہ کے افغانستان پر حملے کے لیے ہم نے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ایک بار پھر ہم حصہ دار بنے۔ اتفاق سے دونوں وقتوں میں افغانستان ہی میدان جنگ تھا اور دونوں دفعہ پاکستان نے امریکہ سے یہ دفاعی اشتراک کیا اور دونوں بار میں پاکستان میں آمرانہ فوجی حکومتیں تھیں۔ تقریباً نصف صدی پر محیط اس سرد و گرم جنگ کی خاطر بیرونی ایما پر کم و بیش سبھی اداروں کو ضرورت اور حد سے زیادہ اسلامائزڈ کرنے کے نتیجے میں ملک میں انتہاپسندی اور فرقہ وارانہ سوچ کو بدستور غذا ملتی رہی اور پوری ایک نسل نے اسی فضا میں پرورش پائی۔ جس کے تلخ اثرات مذہبی و مسلکی منافرت، عدم برداشت اور تشدد کے رویوں کے فروغ کی صورت میں ہم دیکھتے آرہے۔

طالبانائزشن، امتیازی قوانین، فرقہ وارنہ منافرت پر مبنی تنظیمیں، ادارے اور مراکز، مذہبی جماعتوں اور بیانیوں کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال، نصاب تعلیم میں اقلیتوں کے ساتھ امتیازی برتاؤ کی ترویج، اور حالیہ برسوں میں بلاسفیمی سے متعلق قوانین کو لے کر جنم لینے والی تحریکوں کے سیاسی وسماجی اثرات سے مذہبی انتہاپسندی کو مزید فروغ ملا۔

مذہبی آزادی کے تناظر میں دہشت گردی کے سماجی اثرات

ان پر تشدد رویوں کی ترویج کا صرف جانی ومالی نقصان نہیں ہوا بلکہ اس بیانیے سے مجموعی طور پر ہمارے معاشرے میں تفریق بڑھی۔ اب ہم اس کے اثرات روزمرہ کے عمومی معاملات میں بھی دیکھتے ہیں کہ کہیں دکانوں پر بورڈ لگا یا ہوتا ہے کہ اس دکان میں فلاں عقیدہ والا داخل نہیں ہو سکتا، فلاں کے جنازے میں شریک ہونے والوں کا نکاح ٹوٹ گیا ہے، فلاں کافر ہے اسے سلام مت کریں۔ فلاں دکان والا بدعتی ہے اس سے سامان مت خریدیں، فلاں گستاخ ہے ان کو اس محلے میں کرایہ کے لیے کوئی مکان نہ دیں، فلاں مشرک ہے اس سے بات چیت مت کریں، اسی طرح مذہبی آزادی کا راستہ بھی کئی طریقوں سے روکا جاتا ہے کہ فلاں مسلک کی عبادت گاہ اس محلے میں نہیں بن سکتی، فلاں عقیدے کے لوگ اپنے مرنے والے پیاروں کو اس قبرستان میں نہیں دفنا سکتے، فلاں عقیدے والے یہاں اپنے مذہبی رسومات و عبادات انجام نہیں دے سکتے، فلاں عقیدے کی تبلیغ یہاں ممنوع ہے، فلاں عقیدے والے بچوں کو اس سکول یا درسگاہ میں داخلہ نہیں مل سکتا۔ کہیں عبادت گاہوں اور مذہبی اجتماعات پر نشانہ وار حملے کے ذریعے لوگوں کو اپنے عقیدے پر عمل کرنے، اس کے لیے جمع ہونے اور تعلیم و تبلیغ کا اہتمام کرنے سے روکا جاتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اعلیٰ قومی جامعات، ریاستی اداروں اور اعلیٰ آئینی اداروں میں تقرریوں، ملازمت کی ترقیوں، منصوبوں کی منظوریوں، تحقیقی مقالات کی اشاعت تک اہلیت ومعیارات کے بجائے عقیدے کی بنیاد پر تعصب برتا جاتا ہے۔[3]

---

[3] https://www.tajziat.com/article/141

یوں ہمارے معاشرے میں مذہبی و مسلکی تفریق اور حساسیت مزید بڑھتی چلی گئی جو معاشرے میں مزید تقسیم در تقسیم کا باعث بنتی جا رہی ہے۔ منافرت کی تبلیغ و ترویج پہلے خطبات، تقریریوں، جلسے، جلوسوں، اخبارات، رسائل اور واک چاکنگ کی صورت میں ہوتی تھی اب انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا نے اس منافرت کو مزید پروان چڑھایا ہے اور ہماری نوجوان نسل کے معصوم ذہنوں کو آلودہ کیے جا رہی ہے۔

مذہبی آزادی کی خاطر سول سوسائٹی کا کردار

کسی بھی معاشرے میں ایسی صورتحال یہ تقاضہ کرتی ہے کہ اس معاشرے میں رہنے والے مختلف سوچ، رنگ، نسل، مذہب اور مسلک کے افراد کے درمیان سماجی ہم آہنگی کو فروغ دیا جائے تا کہ معاشرے میں موجود تفریق اور بگاڑ کو کم سے کم کیا جا سکے اور باہمی اشتراک و تعاون سے ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل کی راہ ہموار کرتے ہوئے سب اپنا اپنا کردار ادا کر سکیں۔ اسی تناظر میں اگر ہم پاکستان کی معاشرتی صورتحال کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی سول سوسائٹی متحرک اور فعال کردار ادا کرتی نظر آئی ہے اور بالخصوص گزشتہ چند دہائیوں سے تین مختلف سطح پر سماجی ہم آہنگی اور رواداری کے فروغ کے لیے کاوشیں نظر آتی رہی ہیں۔

1. پالیسی سطح پر سول سوسائٹی مختلف ریاستی اداروں کے ساتھ باہمی اشتراک سے مذہبی آزادی کے مختلف پہلوؤں اور مسائل پر آواز اٹھاتی نظر آئی تا کہ مؤثر انداز سے ایشوز پر اپنی آواز مقتدر حلقوں تک پہنچائی جا سکے۔
2. اداراتی سطح پر ہم نے دیکھا کہ گزشتہ دہائیوں میں ریاستی سطح پر مذہبی آزادی کے فروغ کے لیے کچھ ایسے فورمز یا کمیشنز کے قیام کے ساتھ ساتھ کمیونٹی میں موجود مختلف اداروں، سکول، کالج، یونیورسٹی و مدارس میں سماجی ہم آہنگی کے فروغ کے لیے وقتاً فوقتاً اقدامات اور کاوشیں نظر آتی رہی ہیں۔
3. معاشرے کی سطح پر مختلف طبقات فکر (جن میں اساتذہ، وکلاء، سیاسی قائدین، کمیونٹی قائدین،

نوجوان، سماجی کارکنان اور خواتین و دیگر) کے درمیان باہمی مکالمے اور رواداری کے فروغ کے لیے سول سوسائٹی متحرک اور فعال کردار ادا کرتی نظر آئی ہے۔

تاہم سول سوسائٹی کے اندر مذہبی حلقوں کو معاشرے کے بنیادی سٹیک ہولڈر (stakeholders) کے طور پر تسلیم کرنے میں میں ایک تقسیم رہی ہے جو آج بھی موجود ہے۔ کچھ حلقے سمجھتے ہیں کہ سوسائٹی کو مذہبی لیڈر شپ کے ساتھ مذہبی ہم آہنگی و رواداری کے فروغ کے لیے کام نہیں کرنا چاہیے تاہم کچھ سول سوسائٹی یہ سمجھتی ہیں کہ مذہبی قیادت کے ساتھ کام کرنا ناگزیر ہے۔ البتہ آج سول سوسائٹی کے مختلف ادارے کافی حد تک مذہبی قیادت اور مدارس کے ساتھ مختلف initiatives پر کام کرتے نظر آتے ہیں جو کہ ایک مثبت پیش رفت ہے۔

معاشرے کی سطح پر مذہبی آزادی سے جڑے مختلف ایشوز پر مؤثر کام مذہبی قیادت کو بنیادی stakeholders تسلیم کیے بغیر بہت مشکل ہوگا۔ اس کی وجوہات درج ذیل ہیں۔ (الف) ادارہ امن و تعلیم کے ایک سروے کے مطابق ایک عام امام یا مذہبی قائد کمیونٹی کی سطح پر ایک مؤثر رائے ساز ہے، کیونکہ وہ ہفتہ وار مقامی کمیونٹی کے کم سے کم ۳۰۰ سے ۵۰۰ افراد کے ساتھ پنجگانہ نماز و جمعہ کے ذریعے ملاقات کرتا ہے۔ (ب) مذہبی قائد یا امام معاشرے میں ایک روحانی پیشوا یا moral authority سمجھی جاتی ہے جو مذہب کا مستند نمائندہ کے طور پر جانا اور سمجھا جاتا ہے اور کمیونٹی کے عام افراد مذہبی و سماجی مسائل کے تناظر میں اسی سے رابطہ کرتے ہیں۔ (ج) ایک مذہبی قائد، امام اپنی پیشہ وارانہ ذمہ داریوں کے سبب مقامی کمیونٹی کے ساتھ سب سے زیادہ وقت گزارتا ہے۔ (د) مذہبی قائد یا امام کے کردار کو دیکھنے کا زاویہ تعین کرتا ہے کہ اس کا کردار کیا اور کتنا موثر ہے مثال کے طور پر ان کو مسائل کا سبب سمجھنے کہ بجائے مسائل کے حل کا ذریعہ سمجھا جائے۔

مذہبی آزادی کے تحفظ اور فروغ کی خاطر ادارہ امن و تعلیم کا ماڈل

اس ضمن میں ادارہ امن و تعلیم کا گزشتہ دو دہائیوں سے پاکستان کے مذہبی طبقات کے ساتھ کام غیر معمولی نظر آتا ہے۔ ادارہ امن و تعلیم (Peace and Education Foundation)

ایک غیر سرکاری، غیر منفعتی اور غیر سیاسی تنظیم ہے جس کا بنیادی مقصد مختلف اداروں کے اشتراک عمل سے تربیتی، تعلیمی اور تحقیقی نوعیت کے منصوبوں کی مدد سے افراد کی مہارتوں اور صلاحیتوں میں اضافے کے ذریعے مختلف طبقات کے مابین ہم آہنگی، پُرامن بقائے باہمی اور مکالمہ کی ثقافت کو فروغ دے کر سماجی تعمیر و ترقی میں کردار ادا کرنا ہے۔ یہ ادارہ 2009 میں کراچی میں رجسٹر ہوا اور اپنے قیام سے لے کر آج تک مندرجہ ذیل مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں ہے:

- مختلف طبقات اور مکاتبِ فکر سے وابستہ لوگوں کو ایک پر اعتماد ماحول میں ایک دوسرے کے ساتھ تعلیم و ترقی اور امن و ہم آہنگی کے فروغ کے لیے معلومات و تجربات کے باہمی تبادلہ کا موقع فراہم کرنا۔
- تعمیر امن کے لیے مذہبی طبقات کی کاوشوں کو سراہنا اور انہیں معاشرتی، قومی اور بین الاقوامی سطح پر متعارف کرانا۔
- تعلیم، ترقی اور تعمیرِ امن جیسے موضوعات پر تحقیق، تحریر اور مکالمے کا فروغ۔
- معاشرے کے مختلف طبقات اور افراد کو تعمیری اور تخلیقی انداز میں اپنے تنازعات حل کرنے میں مدد دینا۔

اس ادارے کا بنیادہ فلسفہ یہ ہے کہ مذہبی طبقات کے اندر ہی سے ایسے افراد کی کھیپ تیار کرنا جو مجموعی طور پر معاشرے میں مذہبی آزادی سے متعلق مسائل کو سمجھیں اور مذہبی حلقے کی طرف سے آنے والی رکاوٹوں کو مکالمہ، باہمی تعلقات اور دوسرے عقائد سے متعلق غلط فہمیوں کے ازالے کے ذریعے دُور کر سکیں۔ اس کے لیے ادارہ امن و تعلیم نے پانچ سطح پر مذہبی طبقات کو اپنے ساتھ شامل کر رہے ہیں۔ (۱) اداراتی ترقی (۲) بین المسالک ہم آہنگی (۳) جمہوری نظام و اقدار کا فروغ (۴) بین المذاہب مکالمہ (۵) گراس روٹ لیول پر کمیونٹی کے لیے پروگرام۔

(۱) دینی مدارس اور مذہبی جماعتوں کی قیادت کے ساتھ کام میں قومی اور بین الاقوامی تناظر میں دینی مدارس میں درکار اصلاحات کے لیے تعاون کرنا اور امن اور ہم آہنگی کے لیے مدراس کردار کو مضبوط کرنا اور اسے بڑے پیمانے پر اجاگر کرنا۔ اس مقصد کے لیے ادارہ امن و تعلیم نے دینی

مدارس کی قیادت اور حکومت کے درمیان اعتماد سازی کرتے ہوئے پل کا کردار ادا کیا اور اس سلسلے میں پالیسی مرتب کرنے میں معاونت کی۔

پاکستان میں تقریباً تیس ہزار سے زائد مکاتب و مدارس، چالیس لاکھ سے زائد طلبہ موجود ہیں مگر اساتذہ اور دیگر سٹاف کی پیشہ وارانہ تربیت کا کوئی ادارہ موجود نہیں۔ اس خلا کو مدارس کی قیادت کی مشاورت سے ادارہ امن و تعلیم نے پُر کرنے کا عزم کیا۔ اداراتی استعداد کے لیے ادارہ امن و تعلیم نے خاص طور پر اتحاد تنظیمات مدارس سے وابستہ پانچوں وفاق کے مقررہ مدرسوں میں ٹیچر ٹریننگ سینٹر قائم کیے اور ان مراکز میں آس پاس کے شہروں اور اضلاع سے اساتذہ کی پیشہ وارانہ تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف ادارہ، پاکستان کی بڑی یونیورسٹیوں کے اشتراک سے مدراس کے اساتذہ کے لیے پیشہ وارانہ تربیت کا اہتمام کرتا ہے۔ اس پروگرام کا نام "یونیورسٹی سرٹیفیکیشن" پروگرام ہے جس کی خصوصیت یہ کہ ایک ہی کلاس میں مختلف مسالک سے منسلک مدارس کے اساتذہ چھ ہفتوں کے تربیتی پروگرام میں شریک ہوتے ہیں۔ ادارہ امن و تعلیم نے اس سلسلے میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، پشاور یونیورسٹی، کراچی یونیورسٹی، کوہاٹ یونیورسٹی، ملاکنڈ یونیورسٹی، ہری پور یونیورسٹی، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد، سے اشتراک کیا ہوا ہے۔

ادارہ امن و تعلیم اور دینی مدارس کی قیادت اور دیگر نامور علمائے کرام کی مشاورت سے سیکنڈری (ثانویہ) کے لیے نصاب مرتب کیا ہے۔ "تعلیم امن اور اسلام" نام کی یہ درسی کتاب اپنی نوعیت کی اولین کتاب ہے کہ جس کے مندرجات پر سارے مسالک کا اتفاق ہے اور سبھی مسالک کے بہت سے مدارس میں بطور نصاب پڑھایا جاتا ہے۔ اس کتاب کا پشتو ترجمہ مجلس تحقیقات اسلامی نے شائع کیا ہے۔ اس کو مرتب کرنے والے ماہرین تعلیم و نصاب نے تنوع، اختلاف رائے کے آداب، امن و ہم آہنگی کے قیام و فروغ، تنازعات کے حل، مکالمہ، مذہبی آزادی، انسانی حقوق، انسداد انتہاپسندی کے موضوعات پر جدید تناظرات اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بہترین انداز میں مرتب کیا ہے۔ اس کے ماہرین نے اس کتاب کا ٹیچر گائیڈ اور تربیت اساتذہ کے لیے ٹریننگ مینول تیار کیا اور سینکڑوں اساتذہ کو اس کی تدریس کے لیے پیشہ وارانہ تربیت دی ہے۔

(۲) ادارہ امن و تعلیم نے پاکستان میں بین المسالک ہم آہنگی کے فروغ کے لیے پاکستان میں موجود مختلف اسلامی مسالک سے وابستہ علمائے کرام، قائدین اور مذہبی دانشوروں کی مشاورت سے "بین المسالک ہم آہنگی اور مفاہمت" بھی مرتب کر چکا ہے۔ نیز بین المسالک مکالمے اور ہم آہنگی کے فروغ کے لیے مختلف شہروں میں مختلف مسالک کے علماء، خطبا، مذہبی رہنماؤں اور مذہبی کارکنوں کے لیے تربیتی ورکشاپ اور ایک دوسرے کے ہاں مطالعاتی دورے منعقد کرتا ہے۔

(۳) جمہوری نظام و اقدار سے متعلق فہم میں اضافے کے لئے ادارہ امن و تعلیم نے پاکستان میں علمائے کرام و مذہبی و سیاسی قائدین اور نوجوانوں کے لئے مختلف شہروں میں تربیتی پروگرامات منعقد کیے۔ اس پروگرام کے لئے ادارہ کی جانب سے اب تک کل تین تصانیف شائع ہو چکی ہیں ان تصانیف میں "(الف) اسلام، جمہوریت اور آئین پاکستان، (ب) آئین پاکستان اور اسلامی جمہوری ریاست کے خدوخال اور (ج) جمہوریت اور جمہوری اقدار کے فروغ میں نوجوانوں کا کردار" جس میں سے پہلی تصنیف مجلس تحقیقات اسلامی کے تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ نیز اس پروگرام میں جمہوری نظام سے متعلق فہم میں اضافے کے لیے جمہوری و ثقافتی اداروں کے مطالعاتی دوروں کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے۔

(۴) پاکستان میں بین المذاہب ہم آہنگی کے فروغ کے لیے مسلم، مسیحی، ہندو، سکھ اور دیگر مذاہب سے وابستہ اداروں، مراکز اور تنظیموں کے اشتراک سے ادارہ امن و تعلیم تربیتی ورکشاپ، مکالمے کے فورمز اور مختلف مذہبی عبادت گاہوں کے مشترکہ مطالعاتی دوروں کا اہتمام کرتا ہے اور انٹر فیتھ رہنماؤں کے مابین افہام و تفہیم، مثبت تعلقات، باہمی غلط فہمیوں کا ازالہ اور مشترکہ سماجی مقاصد کے لیے باہمی تعاون اشتراک عمل کو فروغ دیا جاتا ہے۔

(۵) ادارہ امن و تعلیم اپنے تربیتی پروگراموں سے فارغ ہونے والے سرگرم شرکا کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور وہ اپنے اپنے شہروں، علاقوں اور فورمز پر مزید لوگوں کو رواداری اور ہم آہنگی کے عمل میں مزید شامل کرتے ہیں۔ استعداد کار میں اضافے، مختلف سطح پر مختلف عقیدہ و پیشہ سے تعلق رکھنے والے سرگرام مذہبی و سماجی کارکنوں، اساتذہ، رہنماؤں اور سوشل ورکرز سے تعلقات اور سیکھی ہوئی جدید مہارتوں کی بدولت وہ معاشرے میں اپنے مذہبی آزادی کے حقوق و فرائض سے آگاہ ہوتے ہیں،

جس سے مکالمے اور رواداری کی فضا پروان چڑھتی ہے۔ ادارہ امن و تعلیم جوانوں کے درمیان صحت مند مکالمے کے فروغ اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے دینی مدارس اور یونیورسٹی طلبہ کے درمیان مباحثے، سپورٹس، مشترکہ سیر و تفریح اور تربیتی ورکشاپس کا اہتمام کرتا ہے۔

ادارہ امن و تعلیم کے تحت مختلف مذہبی طبقات کے لیے مختلف نوعیت کے تربیتی پروگرامات میں عموماً مذہبی آزادی سے جڑے موضوعات و مہارتیں شامل ہیں۔ مثال کے طور پر مذہبی و مسلکی ہم آہنگی کے فروغ کے لیے بیشتر موضوعات جس میں تنوع و تکثیریت، تنقیدی و تخلیقی فکر، کمیونٹی لیڈرشپ، حل تنازعات، مذہبی ادارے بطور سماجی مرکز، شناخت اور مکالمہ شامل ہیں، تاہم مدارس کے اساتذہ کی استعدار کار میں اضافے کے لیے منتخب شدہ موضوعات جس میں خود شناسی بحیثیت استاد، تحقیقی مقالہ کی تیاری، سیکھنا، سکھانا اور ترقی کرنے کا عمل، غور و فکر کی مختلف جہتیں، سوال کرنے کی اہمیت اور مسائل کا حل، کمرہ جماعت کا انتظام، سبق کی منصوبہ بندی، تنازع کا حل اور قیامِ امن اور انسانی حقوق، تنوع اور تکثیریت شامل ہیں۔ نیز معاشرے کی سطح پر جمہوری اقدار کے فروغ کے لیے منتخب شدہ موضوعات جن میں فرد واحد کی صلاحیت اور جمہوریت، اسلام اور جمہوریت: خلافت راشدہ کے اصولِ حکمرانی اور اہم جمہوری اقدار، تنقیدی فکر، جمہوریت اور جمہوری نظام پر اشکالات کا ایک جائزہ، اسلامی جمہوریہ پاکستان کی تشکیل کا جائزہ، تاریخ پاکستان کی روشنی میں، نوجوان قیادت اور سیاسی مستقبل، جمہوری طرز فکر سے تنازعات اور سماجی مسائل کا حل اور آئین پاکستان کی روشنی میں بنیادی انسانی حقوق جیسے موضوعات موجود ہیں، تاکہ متعلق شرکائ کے کردار سے جڑے اہم ترین موضوعات پر ان کے علم و فہم میں اضافہ کیا جاسکے۔

ادارہ امن و تعلیم مذہبی، سماجی اور ثقافتی تنوع کو پاکستان کے لیے ایک کلیدی طاقت سمجھتا ہے۔ پاکستان کی اسی قوت و طاقت کو درست سمت دے کر وسیع قومی تعمیر و ترقی اور باہمی خوشحالی کے امکانات کو عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔ پاکستان میں موجود اس ثقافتی تنوع کا ادراک اور اس کو بڑے پیمانے پر سراہنا پاکستان میں مذہبی آزادی سے متعلق مسائل کو کم یا حل کر سکتا ہے۔

یہ ادارہ ایک سطح پر مذہبی قیادت اور دینی مدارس کے ساتھ مذہبی رواداری اور مدارس میں

تعلیمی اصلاحات کے حوالے سے بے شمار پروجیکٹس و سرگرمیاں کر چکا ہے تو دوسری جانب کمیونٹی کی سطح پر موجود علما، خطبأ، مذہبی و سیاسی قائد، نوجوان اور ی خواتین قیادت کے ساتھ مختلف پروگرامات کے ذریعے مذہبی و مسلکی ہم آہنگی اور جمہوری اقدار کے فروغ کے لیے کام کر رہا ہے۔اب تک ۱۶۰۰۰ سے زائد مذہبی طبقات سے جڑے ہوئے مختلف افراد اس ادارے کے تحت منعقدہ مختلف ورکشاپس کے ذریعے شامل ہو چکے ہیں۔

انتہا پسندی کے انسداد کے لیے قومی سطح پر ہونے والی کاوشوں میں ادارہ امن و تعلیم قومی اداروں کے ساتھ تعاون کرتا رہا ہے اور اس سلسلے میں اپنی مشاورتی و تربیتی فورمز کے ذریعے قومی اتفاق رائے کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے قومی لائحہ عمل "پیغام پاکستان" کی تشکیل اور اس کی ترویج میں ادارہ امن تعلیم کی معاونت شامل رہی ہے۔ بہت سے فارغ التحصیل سرگرم شرکاء نے اپنے طور پر رواداری کے نیٹ ورک بنائے ہیں اور بہت سے تنازعات اور فسادات میں انہوں نے رواداری اور ہم آہنگی کے معاملے میں قائدانہ کردیا ادا کیا ہے۔

اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ پاکستان ایک مذہبی معاشرہ ہے، یہاں کے مقامی مسائل کے لیے مقامی حل ہی کارگر ثابت ہوں گے۔ کوئی بھی بیرونی حل اس پر زور و زبردستی کے ساتھ مسلط نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی وہ کامیاب ہو گا۔ایک مذہبی معاشرے کے لحاظ سے مذہبی طبقہ یہاں کا بہت بڑا سماجی سٹیک ہولڈر ہے۔ادارہ امن و تعلیم نے اس تناظر میں سول سوسائٹی کی سطح پر ایک ایسے مؤثر طبقے کو مسائل کے حل میں شریک کرنے کا عزم کیا جسے آسانی سے بہت ہی سطحی استدلال کے ساتھ مسائل کا واحد ذمہ دار سمجھا جاتا رہا ہے۔ایک متنوع معاشرے کی حیثیت سے پاکستان میں موجود نسلی، لسانی، مذہبی و مسلکی اور ثقافتی تنوع کے تناظر میں سب طبقات کو اس کے قومی مسائل کے حل اور قومی تعمیر و ترقی کے عمل میں شامل کرنا ازحد ضروری ہے۔کسی ایک ثقافتی اکائی یا طبقے کو نظر انداز کرنے نئے مسائل کو جنم دینے کی راہ ہموار کرنا ہے۔

اقلیتیں اور توہینِ مذہب کے قوانین

توہینِ رسالت کی سزا کے قانون میں بہتری کی ضرورت

پروفیسر ڈاکٹر محمد مشتاق احمد

مسلم دنیا کے تقریباًاکثریتی ممالک میں توہینِ مذہب اور توہین۔رسالت کے قوانین موجود ہیں اور انہیں قبول کیا جاتا ہے۔ تاہم ان قوانین کی نوعیت ممالک کے اعتبار سے قدرے مختلف ہے۔ پاکستان میں توہینِ رسالت کا قانون ملک کے اندر بعض حلقوں کی جانب سے اور بین الاقوامی سطح پر اعتراض کی زد میں رہتا ہے۔ کچھ لوگ اسے مکمل ختم کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں تو کچھ اس میں بہتری لانے کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ اس مضمون میں توہینِ سالت کے قانون میں موجود مسائل اور خلا کا تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے کہ کس طرح ان وجوہات کی بنا پر قانون کا غلط استعمال ممکن ہوتا ہے۔ ڈاکٹر مشتاق احمد معروف قانون دان ہیں، آپ کا شماربین الاقوامی تعلقات اور جدید فقہی امور پر دسترس رکھنے والی پاکستان کی چند نمایاں شخصیات میں ہوتا ہے۔بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی شعبہ شریعہ اینڈ لاء کے سربراہ بھی رہے ہیں۔

یورپی یونین، ایف اے ٹی ایف اور حقوقِ انسانی کا غلغلہ

یورپی یونین کی جانب سے جی ایس پی پلس کی حیثیت واپس لینے کا معاملہ ہو، یا ایف اے ٹی ایف کے مطالبے پر وقف اور دیگر قوانین میں تبدیلی کا سوال، یہ ایک بڑی تصویر کے چند حصے ہیں۔ جب تک بڑی تصویر پر نظر نہیں ہو گی، ان جزئیات کا درست فہم حاصل نہیں ہو سکتا۔ سوویت یونین کے بکھرنے اور بالخصوص نائن الیون کے بعد کے نئے عالمی نظام میں یورپی یونین اور ایف اے ٹی ایف کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور کئی پہلوؤں سے انھوں نے اقوامِ متحدہ کی تنظیم کی جگہ لے لی ہے۔ اس نئے عالمی نظام میں کسی ملک کی شمولیت کی بنیادی شرائط میں ایک اہم شرط یہ ہے کہ وہ تہذیب کی ایک خاص سطح تک ترقی حاصل کر چکا ہو۔ اس سطح کو ناپنے کا معیار وہ جسے آسان زبان میں "انسانی حقوق" کہا جاتا ہے۔ اسی لیے یورپی یونین نے جی ایس پی پلس کی حیثیت کو انسانی حقوق کے 27 معاہدات کی توثیق کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ اسی طرح ایف اے ٹی ایف کی گرے لسٹ سے

آپ تب تک نہیں نکل سکتے جب تک ان کے مطالبات کے مطابق اپنے قانونی و معاشرتی نظام کو تبدیل نہ کر لیں۔

انسانی حقوق کے ان معاہدات کے ذریعے مغربی اقدار کو، جن کی تہہ میں رومی و یونانی بت پرستی اور مسیحی تصورات کے علاوہ جدید و مابعد جدید الحادی نظریات کار فرما ہیں، اخلاقیات کے عالمی و آفاقی معیارات کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے اور اخلاق یا حقوق کے کسی بھی متبادل تصور کو سرے سے پیش کرنے کی ہی اجازت نہیں دی جا رہی۔ چنانچہ انسانی حقوق کے ان معاہدات کی توثیق کے بعد آپ کو مجبور کیا جاتا ہے کہ آپ اپنے ملکی قوانین کو ان سے ہم آہنگ بنائیں اور اس مقصد کے لیے ان قوانین میں تبدیلیاں کریں۔ ان تبدیلیوں سے انکار کی صورت میں یورپی یونین جی ایس پی پلس حیثیت بھی واپس لے سکتی ہے اور ایف اے ٹی ایف آپ کو گرے لسٹ سے بلیک لسٹ میں بھی دھکیل سکتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کے ذریعے آپ کی اقتصادی ناکہ بندی بھی کی جا سکتی ہے اور جمہوریت کے فروغ اور انسانی حقوق کی ترویج کے لیے آپ کے ملک پر حملہ بھی کیا جا سکتا ہے۔

انسانی حقوق کے اس الحادی تصور کے مقابلے میں نہ ہی مستقل شکست خوردگی کا رویہ آپ کو نقصان سے بچا سکتا ہے، نہ ہی عذر خواہی کا رویہ کچھ مفید ثابت ہوا ہے۔ اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ انسانی حقوق اور تہذیبی و اخلاقی اقدار و معیارات کے لیے اسلامی تصور کو باقاعدہ ایک مستقل اور متبادل نظام کے طور پر پیش کیا جائے۔ یہ کام کسی ایک ملک کے تنہا کرنے کا نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے تمام مسلمان ممالک کو مل کر باہمی مشورے سے مشترکہ لائحۂ عمل بنانا ہو گا۔ توہینِ مذہب اور توہینِ رسالت کے مسائل پر پاکستان، یا مسلمانوں، کا موقف یورپی یونین یا مغرب کے اس نام نہاد آفاقی انسانی حقوق کے تصور سے یکسر مختلف ہے۔ اس حوالے سے وزارتِ خارجہ کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اپنا موقف دنیا کے سامنے مناسب انداز میں پیش کرنے کے لیے باقاعدہ لابنگ کرے۔ ملکی جامعات کا اس سلسلے میں کردار نہایت اہم ہے لیکن بدقسمتی سے اس طرف بالکل ہی توجہ نہیں دی جا رہی۔

دنیا کو اس سلسلے میں آگاہی دینے کے لیے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کے فورم کو استعمال کیا

جاسکتا ہے۔ اسی طرح جنرل اسمبلی کے ذریعے اس توہینِ مذہب اور اظہارِ رائے کی آزادی کے تعلق پر قانونی سوال کو بین الاقوامی عدالتِ انصاف میں بھی پیش کیا جاسکتا ہے۔ انفرادی سطح پر یہ سوال یورپ میں مقیم مسلمان یورپی عدالت برائے حقوقِ انسانی تک بھی لے جاسکتے ہیں۔ تاہم ان دونوں فورمز پر مقدمہ جیتنے کے لیے بہت زیادہ منصوبہ بندی، تحقیق اور محنت کی ضرورت ہوگی۔ اس ضمن میں مسلمان ممالک کی تنظیم او آئی سی کو فعال بنانے کی ضرورت ہے۔

پاکستان یا کسی بھی مسلمان ملک کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ فرانس یا کسی دوسرے یورپی ملک کے ساتھ سفارت تعلقات منقطع کرنے یا حالتِ جنگ میں چلے جانے کا فیصلہ تنہا کرے۔ پاکستان کی حکومت پر پاکستانی عوام کی حفاظت اور ان کے بہترین مفاد میں فیصلہ کرنا لازم ہے اور اگر اس وجہ سے وہ مجبوراً جنگ میں جانے سے گریز کرے تو یہی اس کے لیے مناسب طرزِ عمل ہے کیونکہ شریعت نے جہاد کے لیے استطاعت کی شرط رکھی ہے اور جہاد میں بھی خودکشی سے روکا ہے۔ البتہ جی ایس پی پلس کی حیثیت کا حصول اتنا ضروری نہیں ہے، نہ ہی یہ پاکستان کی اتنی بڑی مجبوری ہے کہ اس کے لیے پاکستان کو توہینِ مذہب کی سزا ختم کرنے کا اقدام اٹھانا پڑے۔ چنانچہ اس معاملے میں پاکستان کو بھرپور مزاحمت کرنی چاہیے۔

البتہ توہینِ مذہب کی سزا کے قانون پر اسلامی اصولوں کی روشنی میں غور و فکر کی ضرورت ہے تاکہ اس کا غلط استعمال بھی روکا جائے اور اس کے عدمِ نفاذ کی صورت بھی ختم ہو جائے۔ اس سلسلے میں خود علمائے کرام اور مذہبی طبقے کو آگے بڑھ کر فعال کردار ادا کرنا چاہیے قبل اس کے کہ معاملہ کسی اور کے ہاتھ میں چلا جائے اور پھر وہ سانپ کے گزرنے کے بعد لکیر ہی پیٹتے رہیں۔

توہینِ رسالت کے قانون پر بات کرنے والوں میں کچھ وہ ہیں جو سرے سے اس قانون کا خاتمہ چاہتے ہیں اور ان کے بالکل برعکس وہ ہیں جن کے نزدیک اس قانون میں کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اول الذکر گروہ اس مضمون کا مخاطب نہیں ہے اور ویسے بھی پاکستان میں یہ گروہ اپنی انتہائی زیادہ قلت کے سبب سے ناقابلِ توجہ ہے۔

موجودہ قانون میں مسائل

البتہ وہ لوگ جو اس قانون کو بالکل درست مانتے ہیں، ان کی خدمت میں عرض ہے کہ اصولی لحاظ سے اس قانون میں کئی مسائل ہیں:

ایک مسئلہ یہ ہے کہ اس کی رو سے مسلمان اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں کیا گیا؛

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اس قانون میں ملزم کی نیت اور ارادے کو سرے سے غیر متعلق قرار دیا گیا ہے؛

تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ اس قانون میں ملزم/مجرم کی جانب سے توبہ اور رجوع کے لیے، یا موت کے سوا کسی اور سزا کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی گئی؛

چوتھا مسئلہ یہ ہے کہ اس قانون میں، باوجود اس کے کہ اس جرم کو حدود میں شمار سمجھا گیا ہے، جرم کے ثابت کرنے کے لیے حدود کے معیارِ ثبوت کو مقرر نہیں کیا گیا، نہ ہی اسلامی قانون کے تصورِ "شبہہ" کا کچھ خیال رکھا گیا ہے حالانکہ حدود کی سزائیں "شبہہ" کی بنا پر ساقط ہو جاتی ہیں۔ (یاد رکھیے کہ شبہہ سے یہاں مراد Benefit of the Doubt نہیں بلکہ Mistake of Law کی کچھ قسمیں ہیں۔)

ان چار بنیادی مسائل کی بنا پر یہ قانون انتہائی زیادہ سخت ہو گیا ہے اور اس قانون پر عمل درآمد نہ ہونے کے لیے یہ ایک بڑا سبب ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے علمائے کرام خود اس قانون کے جائزے اور ان مسائل کے حل کے لیے مل بیٹھ کر اس قانون میں بہتری کی تجاویز سامنے لے آئیں۔ اگر وہ یہ کام نہیں کریں گے تو اس قانون کا سوءِ استعمال اس طور پر ہوتا رہے گا کہ فرقہ وارانہ اختلافات کی بنا پر ایک دوسرے کے خلاف مقدمات کی بھرمار ہو گی لیکن اس کا عدمِ استعمال اس طور پر جاری رہے گا کہ عدالت کسی کو سزا نہیں دے سکے گی۔ یوں یہ مسئلہ جوں کا توں باقی رہے گا اور جب کبھی توہینِ رسالت کے کسی ملزم کا ماورائے عدالت قتل ہو گا تو قوم اسی طرح تقسیم ہو گی، اسی

طرح چند دن بحث میں مبتلا رہے گی اور پھر کسی نئے ایشو کی طرف رخ کر لے گی۔

اس قانون کے سوءِ استعمال کو روکنے کی ایک کوشش جنرل مشرف کے دور میں ہوئی جب اس قانون کے بجائے اس پر عمل کے طریقِ کار، یعنی Procedure، میں یہ تبدیلی کی گئی کہ اس قانون کے تحت ایف آئی آر کاٹنے سے قبل ایس پی کی سطح کے افسر کی جانب سے تفتیش کو ضروری قرار دیا گیا۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ اس تبدیلی نے سوءِ استعمال کو تو نہیں روکا لیکن قانون کو غیر مؤثر ضرور کر دیا ہے۔

ہمارے نزدیک طریقِ کار کی یہ تبدیلی مسئلے کا حل نہیں ہے، بلکہ اصل حل یہ ہے کہ اس قانون میں موجود مذکورہ بالا چار مسائل دور کیے جائیں۔ اس کے بعد اس قانون کا سوءِ استعمال بڑی حد تک رک جائے گا۔

باقی رہا اس کے مؤثر نفاذ کا مسئلہ، تو اس کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ توہینِ رسالت کے مقدمات کے فیصلے کے لیے خصوصی عدالتیں ہوں جہاں صرف انھی مقدمات کی سماعت ہو تاکہ یہ گلہ دور کیا جاسکے، جو بے بنیاد بالکل بھی نہیں ہے، کہ صرف ماتحت عدالت میں ہی توہینِ رسالت کے ایک مقدمے کی سماعت میں سالہاسال لگ جاتے ہیں۔ (ملتان میں جنید حفیظ کے خلاف مقدمہ 2013ء میں دائر کیا گیا لیکن ماتحت عدالت کی جانب سے فیصلہ 2019ء میں سنایا گیا، یعنی چھے سال بعد!) سوال یہ ہے کہ اگر دہشت گردی کے مقدمات کے لیے خصوصی عدالتیں ہوسکتی ہیں، بینکوں کے تنازعات کے لیے خصوصی عدالتیں ہوسکتی ہیں، بلکہ نکاح و طلاق کے مقدمات کے لیے بھی خصوصی عدالتیں ہوسکتی ہیں، تو توہینِ رسالت کے مقدمات کے لیے خصوصی عدالتیں کیوں نہیں ہوسکتیں؟

توہین کے جھوٹے مقدمات

توہینِ رسالت کی سزا کے قانون پر ایک عام تنقید یہ بھی کی جاتی ہے کہ توہینِ رسالت کے جھوٹے الزام پر سزا نہیں ہے اور اس وجہ سے لوگ ایک دوسرے کے خلاف جھوٹے مقدمات قائم

کرتے ہیں۔ کئی لوگ یہ جذباتی تجویز بھی دیتے نظر آتے ہیں کہ توہینِ رسالت کے ملزم کے بری ہو جانے کی صورت میں اس پر الزام لگانے والے کو توہینِ رسالت کی سزا دینی چاہیے۔

یہاں پہلی بات یہ نوٹ کرنے کی ہے کہ الزام ثابت نہ کر سکنا اور الزام کا جھوٹا ثابت ہو جانا، دو الگ باتیں ہیں۔ ملزم بری ہو جانے سے الزام لگانے والے کا جھوٹا ثابت ہونا ضروری نہیں ہے، بالخصوص جہاں ملزم کو شک کا فائدہ دے کر بری کیا جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ پاکستان کے قانونی نظام کی رو سے الزام کا ثابت کرنا استغاثہ کا کام ہے، نہ کہ شکایت کنندہ کا۔ قانون کا مفروضہ یہ ہے کہ شکایت کنندہ نے تو جرم کے وقوع کی اطلاع دے کر ریاست کی مدد کی ہے۔ اب ریاستی اداروں، بالخصوص پولیس کے تفتیشی افسران، کی ذمہ داری ہے کہ وہ جرم کے متعلق ثبوت اور شواہد اکٹھے کریں اور مجرم کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں۔ اگر پولیس اس معاملے میں کام چوری یا خیانت کرتی ہے تو اس کی ذمہ داری شکایت کنندہ پر عائد نہیں ہو سکتی۔

البتہ یہ ممکن ہوتا ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے خلاف جھوٹی شکایت کرے، جھوٹا مقدمہ دائر کرے یا جھوٹے گواہ بنائے یا شواہد گھڑے۔ بہ الفاظِ دیگر، وہ انصاف کے نظام کو ظلم کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ اس کوشش کی مختلف قسموں پر اسے مختلف سزائیں دی جاسکتی ہیں اور اس کے لیے قانون میں پہلے ہی سے مناسب دفعات موجود ہیں۔

مثلاً مجموعۂ ضابطۂ فوجداری کی دفعہ 250 میں عدالت کو اختیار دیا گیا ہے کہ اگر وہ اس نتیجے پر پہنچتی ہے کہ شکایت کنندہ نے جھوٹا مقدمہ دائر کیا تھا، تو وہ ملزم کو بری کرنے کے حکم کے ساتھ شکایت کنندہ کے خلاف کارروائی کا حکم بھی دے سکتی ہے۔

پھر مجموعۂ تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 182 میں قرار دیا گیا ہے کہ پولیس یا دیگر حکام کو جرم کے متعلق جھوٹی اطلاع پہنچانے والے کو سات سال تک کی قید کی سزا سنائی جاسکتی ہے، اگر اس نے ایسے جرم کے متعلق جھوٹی اطلاع دی ہو جس کے سچا ثابت ہونے پر مجرم کو سزائے موت دی جاتی۔ چونکہ توہینِ رسالت کی سزا پاکستان میں موت ہے، اس لیے اس قانون کی رو سے اس شخص کو سات سال

تک کی قید کی سزا سنائی جاسکتی ہے جس نے کسی شخص کی جانب سے توہینِ رسالت کے ارتکاب کی جھوٹی اطلاع پولیس تک پہنچائی ہو۔

مزید دیکھیے کہ مجموعۂ تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 211 کے تحت یہی سات سال تک قید کی سزا ایسا جھوٹا مقدمہ دائر کرنے پر بھی ہے جس کے سچا ثابت ہونے پر مجرم کو سزاے موت دی جاتی۔

مزید دیکھیے کہ مجموعۂ تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 181 کے تحت جھوٹا بیانِ حلفی دینے والے کو تین سال تک قید کی سزا دی جاسکتی ہے۔

کیا یہ سزائیں توہینِ رسالت کے جھوٹے مقدمات کی روک تھام کے لیے کافی نہیں ہیں؟

ہاں، اگر عدالت میں یہ ثابت ہو جائے کہ شکایت کنندہ نے صرف جھوٹا مقدمہ ہی دائر نہیں کیا، یا صرف جھوٹی اطلاع ہی نہیں دی، یا صرف جھوٹا بیانِ حلفی ہی نہیں دیا، بلکہ اس نے ایسے الفاظ گھڑ کر، یا ثبوت گھڑ کر، ملزم کی طرف منسوب کیے ہیں جو توہینِ رسالت پر مبنی ہیں، تو اس صورت میں یقیناً کہا جاسکتا ہے کہ شکایت کنندہ نے توہینِ رسالت کا ارتکاب کیا ہے اور اس کے خلاف توہینِ رسالت کے قانون کے تحت کارروائی ہونی چاہیے۔

اس ایک صورت کے سوا، عام طور پر ایک سویپنگ سٹیٹمنٹ دینا کہ جو توہین کا الزام ثابت نہ کر سکا، اسے توہین کی سزا دی جائے، انتہائی غلط ہے۔

بعض لوگوں نے یہ حوالہ بھی دیا ہے کہ شریعت نے زنا کا الزام ثابت نہ کر سکنے والوں کے لیے قذف کی سزا مقرر کی ہے لیکن وہ دو باتیں بھول جاتے ہیں:

ایک یہ کہ زنا کے الزام کے متعلق شریعت نے عام قواعد سے الگ خصوصی حکم دیا ہے کہ جس نے زنا کا الزام لگایا اور پھر اسے چار گواہوں کے ذریعے ثابت نہ کر سکا (اور ملزم انکاری ہو)، تو الزام لگانے والے کو زنا کا جھوٹا الزام لگانے (قذف) پر اسی کوڑوں کی سزا دی جائے۔ چنانچہ یہاں صرف الزام ہی نہیں بلکہ اس کی گواہی کو بھی قذف ہی سمجھا جائے گا، جب تک چار گواہوں کی گواہی

پوری نہ ہو جائے۔ چنانچہ اگر تین گواہوں نے زنا کی گواہی دی اور چوتھا پھر گیا، یا خاموش رہا، یا اس کی گواہی زنا کے بارے میں صریح نہ ہو، تو چوتھا گواہ تو بچ جائے گا لیکن پہلے تین گواہوں کو زنا کے جھوٹے الزام پر قذف کی سزا کے طور پر اسی کوڑے مارے جائیں گے۔ البتہ اگر چار گواہ پورے ہو جائیں تو ان کی گواہی مل کر زنا کے جرم کے اثبات کے لیے کافی ہو جائے گی۔ چنانچہ زنا کے ملزم کا جرم ثابت ہو جانے پر اسے زنا کی سزا دی جائے گی اور اس کے خلاف زنا کی گواہی دینے والے گواہ قذف کی سزا سے بچ جائیں گے۔

دوسری یہ کہ شریعت نے زنا کی سزا اور اس کے جھوٹے الزام کی سزا میں فرق کیا ہے۔ زنا کی سزا غیر محصن کے لیے سو کوڑے اور محصن کے لیے رجم ہے، جبکہ زنا کے جھوٹے الزام پر اسی کوڑوں کی سزا ہے۔

آخری سوال یہ ہے کہ جب جھوٹی شکایت، جھوٹے مقدمے اور جھوٹے بیانِ حلفی پر سزائیں موجود ہیں، تو پھر لوگ جھوٹے مقدمات بنا کر بچ کیسے جاتے ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ معاملہ صرف توہینِ رسالت کے جرم کا نہیں، بلکہ دیگر جرائم کا بھی ہے۔ کیا قتل کے جھوٹے مقدمات نہیں بنائے جاتے؟ جھوٹی گواہیاں نہیں دی جاتیں؟ جھوٹی ایف آئی آرز کا اندراج نہیں کیا جاتا؟ اس سب کچھ کا سبب یہ نہیں کہ ان کو روکنے کے لیے قانون موجود نہیں، بلکہ سبب یہ ہے کہ قانون پر عمل نہیں ہوتا اور یہ ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی عمومی لاقانونیت کا نتیجہ ہے۔ اس عمومی اخلاقی فساد کی موجودگی میں یہ توقع رکھنا کہ کوئی نیا قانون بنا کر آپ جرم کے سدّباب میں کامیاب ہو جائیں گے، محض دیوانے کا خواب ہے۔

پاکستان کی مردم شماریاں اور اقلیتوں کی اصل تعداد

اسلام گل آفریدی

پاکستان میں بہت ساری اقلیتی برادریاں رہتی ہیں۔ ان میں سے کچھ کی تعداد زیادہ ہے تو بعض طبقات ایسے ہیں جن کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ ملک میں جب 2017ء میں مردم شماری کرائی گئی تو اس کے بعد اقلیتوں نے سخت تحفظات کا اظہار کیا۔انہوں نے اس مردم شماری پر کئی اعتراضات کیے۔ تمام اقلیتوں کو ایک تو یہ اعتراض ہے ان کی تعداد صحیح نہیں بتائی گئی ہے، بلکہ کم بتائی گئی۔ ان کے مطابق اس کا نقصان یہ ہوا کہ ان کی تعداد کی بنیاد پر مخصوص کیے گئے سیاسی و سماجی حقوق بھی کم ہوگئے۔ اور مردم شماری فارم میں بعض اقلیتوں کے مذہب کا خانہ شامل نہیں تھا بلکہ انہیں 'دیگر' میں شامل کیا گیا، تو انہوں نے اس پر بھی کافی بے چینی کا اظہار کیا۔اس مضمون میں پاکستان میں تاریخی اعدادوشمار کی روشنی میں اس مسئلے پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔اسلام گل آفریدی خیبر پختونخوا اور ضم شدہ قبائلی اضلاع میں قومی اور بین الاقوامی نشریاتی اداروں کے لئے تحقیقاتی صحافت کر رہے ہیں۔

2017ء میں پاکستان کی مردم شماری میں ملک کی کل آبادی اکیس کروڑ کے قریب بتائی گئی ہے جن میں میں مسلم آبادی 96.47 فی صد ہے جو 1998 کی مردم شماری میں 96.28 فیصد تھی۔اسی طرح پاکستان میں ہندو آبادی 1998 کی مردم شماری میں 1.6 فی صد سے بڑھ کر 1.73 فی صد ہو گئی ہے اور یوں پاکستان کی سب سے بڑی مذہبی اقلیت بن کر سامنے آئی ہے۔ مسیحی آبادی 1998 کی مردم شماری میں 1.59 فی صد تھی جو کم ہو کر حالیہ مردم شماری میں 1.27 فی صد ہو گئی ہے۔احمدی برادری کی آبادی 1998 کی مردم شماری میں 0.21 فی صد تھی جو کم ہو کر حالیہ مردم شماری میں 0.09 فی صد ظاہر کی گئی ہے۔اسی طرح شیڈولڈ کاسٹ (ہندوؤں) کی 1998 کی مردم شماری میں آبادی 0.25 فی صد تھی جو بڑھ کر حالیہ مردم شماری میں 0.41 فیصد ہو گئی ہے۔

دیگر اقلیتوں جن میں سکھ، کالاش، پارسی اور دیگر شامل ہیں، ان کی آبادی کو 'دیگر' کا نام دے

کر 1998 کی مردم شماری میں 0.07 تھی، اب یہ کم ہو کر 0.02 فی صد ہو گئی ہے۔

محکمہ شماریات نے اپنی رپورٹ میں مذہب کے حساب سے آبادی کو افراد کی تعداد کے بجائے صرف فیصد میں جاری کیا ہے جب کہ 1998 کی مردم شماری میں مذہب کی بنیاد پر آبادی کو تعداد میں ظاہر کیا گیا تھا۔

پاکستان مائینارٹی رائٹس کمیشن (پی ایم آر سی) کے جنرل سیکرٹری روحیل ظفر شاہی کے مطابق آخری مردم شماری کے اعداد کے مطابق ملک میں مسیحی برادی کے تعداد انیس سال پہلے مردم شماری کی نسبت کم ہونا انتہائی افسوناک ہے کیونکہ اس کے نتیجے کے طور پہ مستقبل میں سرکاری سطح پر دی جانے والی مراعات، تعلیمی و سرکاری نوکریوں میں کوٹہ، سکالرشپ اور سالانہ ترقیاتی بجٹ میں کمی آئے گی جس سے اقلیتی برداری کے پہلے سے موجودہ مسائل میں مزید اضافہ ہوگا۔ اُن کے بقول ملک میں اقلیتی برادری کی تعداد میں کمی نہیں آئی بلکہ ان کی صحیح طریقے سے مردم شماری نہیں کی گئی ہے۔ اقلیتی نوجوانوں اور خصوصاً خواتین کے حقوق کے لئے سرگرم سماجی کارکن مالا کماری کا کہنا ہے کہ محکمہ شماریات کے جانب سے اب تک اصل تعداد سامنے نہیں لائی گئی جس کی بنیاد پر پاکستان میں اقلیتی برادری کی تعداد معلوم ہو سکے۔ اُن کے بقول مردم شماری کے انتظامات میں اس بات کو یقینی بنانا چاہیے تھا کہ ملک کی کل آبادی اور تمام اقلیتی برادری کی تعداد نہ صرف صوبوں بلکہ اضلاع اور یونین کونسل کی سطح پر سامنے لائی جائے لیکن بدقسمتی سے ایسا کچھ نہیں کیا گیا ہے۔

قبائلی اضلاع سے تعلق رکھنے والے سکھ برادری کے رہنماء باباجی گورپال سنگھ نے چھٹی مردم شماری کے فارم میں سکھ مذہب کا خانہ شامل نہ کرنے کے خلاف پشاور ہائی کورٹ میں رٹ پٹیشن دائر کی تھی۔ اُن کا کہنا ہے کہ جیسے ہی چھٹی مردم شماری شروع ہوئی اور معلوم ہوا کہ فارم میں سکھ مذہب کا خانہ شامل نہیں کیا گیا ہے تو 19 جون 2017 کو پشاور ہائی کورٹ میں کیس دائر کیا، ہنگامی بنیادوں پر 21 جون کو عدالتی فیصلے میں محکمہ شماریات کو حکم جاری کر دیا گیا کہ مردم شماری کے دوسرے مرحلے کے سروے فارم میں سکھ مذہب کا خانہ شامل کیا جائے اور پہلے مرحلے میں سکھ برادری کے اعداد و شمار نادرہ سے لئے جائیں لیکن اس کے باوجود عدالتی حکم پر کوئی عمل درآمد نہیں

ہوا۔ گورپال سنگھ نے کہا کہ اس سلسلے میں سپریم کورٹ کارخ کیا اور وہاں پر سابق چیف جسٹس کی سربراہی میں بنچ نے 27 دسمبر 2018 کو اپنا فیصلہ سنایا کہ آنے والے وقت میں جب بھی ملک میں مردم شماری ہو گی تو سکھ مذہب کا خانہ لازماً شامل کیا جائے گا۔ سکھ برداری کے مطابق ملک بھر میں 55 ہزار سے زائد سکھ آباد ہیں جبکہ 35 ہزار صرف خیبر پختونخوا میں رہائش پذیر ہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق ملک میں سکھوں کی تعداد 16 ہزار ہے۔

خیبر پختونخوا میں اقلیتی برادری کی کم تعداد کی بنیاد پر سرکاری نوکریوں میں ان کیلئے مختص کوٹہ 0.5 فیصد تھا جو 2008-09 میں بڑھ کر تین اور اب پانچ فیصد ہو چکا ہے تاہم اس پر عمل درآمد کے حوالے سے کئی مسائل اب بھی موجود ہیں۔ یونیورسٹیوں میں کوٹہ دو فیصد رکھا گیا ہے، تاہم میڈیکل اور انجینئرنگ کالجز اس میں شامل نہیں ہیں اور پورے صوبے میں صرف ایک میڈیکل سیٹ اقلیتی برادری کے لئے مختص کی گئی ہے۔ روحیل ظفر شاہی کے بقول موجودہ وقت میں سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 32 لاکھ اور الیکشن کمیشن کے پاس تقریباً 16 لاکھ اقلیتی ووٹرز رجسٹرڈ ہیں جو انتہائی کم تعداد ہے۔ اُنکا کہنا ہے کہ مردم شماری کے ساتھ ووٹر رجسٹریشن بھی انتہائی ضروری ہے کیونکہ اس بنیاد پر اپنے مسائل کا حل پارلیمنٹ کے ذریعے آسان ہو جائے گا۔ خیبر پختونخوا اسمبلی میں پاکستان تحریک انصاف کے اقلیتی ممبر روی کمار بھی اس بات سے متفق ہیں کہ پانچویں اور چھٹی مردم شماری میں اقلیتی برادری کی اصل تعداد سامنے نہیں آئی جس کی وجہ سے اقلیتی برادریوں کو درپیش مسائل کے حل میں کافی مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ جب بھی مسائل کے حل کے حوالے سے کسی بھی سرکاری محکمے سے بات ہوتی ہے تو جواب میں پہلے آبادی کی بات ہوتی ہے اور اُس کی بنیاد پر وسائل کی تقسیم ہوتی ہے۔

محقق اور تجزیہ کار آصف عقیل کی ایک تحقیق کے مطابق برصغیر کی تقسیم کے بعد وجود میں آنے والے پاکستان میں غیر مسلم برادریوں کی آبادی 44 فی صد جب کہ بھارت میں مسلمانوں کی آبادی 12 فیصد تھی۔ انہوں نے کہا کہ پاکستان بننے سے قبل یہاں ہندو اور سکھ بڑی تعداد میں آباد تھے البتہ مذہبی بنیادوں پر پاکستان اور بھارت کی تقسیم کے بعد وہ ہجرت کر کے بھارت چلے گئے اور اس کے ساتھ ہی لاکھوں مسلمان بھارت سے ہجرت کر کے پاکستان آئے۔ آصف عقیل کے مطابق 1951 کی

مردم شماری کے بعد غیر مسلم اقلیتوں کی آبادی کم ہو کر 14.1 فیصد رہ گئی تھی۔ اونچی ذات کے ہندوؤں اور سکھوں کی بڑی تعداد بھارت ہجرت کر چکی تھی، جب کہ شیڈولڈ کاسٹ، مسیحی، پارسی اور دیگر کم تعداد اقلیتی برادریوں کی ہجرت کا تناسب کافی کم تھا۔ انہوں نے بتایا کہ 1961 کی مردم شماری میں غیر مسلم اقلیتوں کی آبادی مزید دو فیصد کم ہو کر 12 فیصد رہ گئی تھی، جب کہ مسلمانوں کی آبادی 88 فیصد رہی جس کی وجہ 10 برس کے دوران مذہب کی بنیاد پر ہجرت کا سلسلہ جاری رہنا تھا۔

جماعت احمدیہ پاکستان کے رہنما عامر محمود کا کہنا ہے کہ اب تک محکمہ شماریات نے ایسی کچھ معلومات نہیں دی ہیں جس سے اندازہ ہو سکے کہ سرکاری سطح پر کتنے احمدی موجود ہیں اور یا اندازہ ہو سکے کہ ان کے افراد کم ہوئے ہیں یا اس میں کوئی اضافہ ہو چکا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اس وقت پاکستان میں احمدیوں کی آبادی چار سے پانچ لاکھ کے درمیان ہے البتہ پچھلے کچھ عرصہ ملک بھر میں توہین رسالت کے الزام کی وجہ سے قاتلانہ حملوں میں اضافے کے سبب لوگ بیرونی ممالک ہجرت پر مجبور ہو چکے ہیں۔

مالا کماری کا کہنا ہے کہ اقلیتی برادری میں مردوں اور اکثریتی خواتین کے شناختی کارڈ نہیں بنے ہیں جس کی وجہ سے مردم شماری اور الیکشن کمیشن کے ساتھ کم ووٹ رجسٹرڈ ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ مستقبل میں تمام اقلیتی برادری کو ان تمام مسائل کے حل پر توجہ دینا ہوگی تا کہ آنے والے وقت میں اس طرح مسائل پیدا نہ ہو جائیں۔ باباجی گورپال سنگھ نے کہا کہ پاکستان تحریک انصاف کی حکومت نے اقلیتی برادری کے حقوق کے لئے کچھ کام کیا تھا تاہم کچھ مسائل اب بھی موجود ہیں جن کا حل انتہائی ضروری ہے۔ اُن کے بقول موجودہ وقت میں ضم قبائلی اضلاع سے ایک اور تین ممبران صوبے کے دیگر علاقوں سے صوبائی اسمبلی میں موجود ہیں تاہم نہ صرف ان کی تعداد میں اضافہ کیا جائے بلکہ ان کو دیے جانے والے فنڈ میں بھی اضافہ کیا جائے۔ 'کرسچن کورڈینیشن کونسل' کے سرگرم کارکن کاشف منیر کے مطابق اقلیتوں کی مردم شماری کو جدید طریقے سے کرنا چاہیے اور اس حصے میں مختلف پہلو کو مدنظر رکھ کر لوگوں کے اعداد و شمار جمع کئے جائیں تا کہ غلطی کی کوئی گنجائش ہی نہ رہے۔ اُنہوں نے کہا کہ نادرا کے ساتھ بھی اقلیتی برادری کے اعداد و شمار موجود ہیں جبکہ حکومت کو اس حوالے سے آگاہی مہم کے لئے بھی اقدامات کرنے چاہئیں۔

پاکستان کی اقلیتیں: تعارف اور تاریخ

شکیل انجم ساون

پاکستان میں اقلیتیں بہت ساری رہتی ہیں۔ لوگوں کو ان کے بارے میں مذہبی نسبت کے علاوہ کوئی خاص معلومات نہیں ہوتیں۔ ان کی اس خطے میں کیا تاریخ ہے، ان کی ثقافت کیا ہے اور اس سرزمین کے ساتھ وابستگی کتنی صدیوں سے ہے۔ اگر فرد کو دیگر مذاہب کی تاریخ اور ان کی معاشرت کی جزئیات بارے آگہی ہو تو اس سے قربت بڑھتی ہے اور ایک دوسرے کی فکر کو مزید جاننے کی جستجو بھی پیدا ہوتی ہے۔اس مضمون میں مصنف نے ملک کی بڑی اقلیتوں کا تعارف پیش کیا ہے اور ان کی تاریخ سے کچھ نمایاں پہلو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔شکیل انجم ساون انسانی حقوق کے کارکن اور مصنف ہیں۔

مسیحیت

مسیحیت پاکستان کا دوسرا بڑا اقلیتی مذہب ہے۔ 2017 کی مردم شماری کے مطابق پاکستان میں مسیحیوں کا تناسب آبادی کا تقریباً 1.27 فیصد لگایا گیا تھا۔ان میں سے تقریباً نصف کیتھولک اور نصف پروٹسٹنٹ ہیں۔ مشرقی آرتھوڈوکس مسیحیوں کی ایک چھوٹی سی تعداد اور مشرقی آرتھوڈوکس مسیحی بھی پاکستان میں رہتے ہیں۔

تاریخ

پاکستان کے تقریباً 75 فیصد مسیحی دیہی پنجابی مسیحی ہیں، جب کہ کچھ سندھی اور گجراتی بولتے ہیں، باقی ماندہ گوا کے مسیحی اور اینگلوانڈین شامل ہیں۔

برصغیر پاک وہند میں مسیحیت کی آمد تھامس رسول کے سبب ہوئی، جس نے مالابار کے ساحل پر مسیحیوں کی کمیونٹی قائم کی۔ سینٹ تھامس کرسچن کراسز (مار تھوما سلیوا) پورے برصغیر پاک وہند میں پائے گئے ہیں، جس میں ٹیکسلا شہر کے قریب بھی شامل ہے جو اب پاکستان کا حصہ ہے۔

1745 میں، شمالی برصغیر کی سب سے قدیم زندہ رہنے والی مسیحی برادری، بیتیہ مسیحی، بادشاہ دھوروپ سنگھ کی سرپرستی میں 'آرڈر آف فریئرز مائنر کیپوچن' کے ذریعے قائم کی گئی تھی۔ 1877 میں، ویسٹ منسٹر ایبی، لندن میں سینٹ تھامس ڈے پر، ریورنڈ تھامس ویلپی فرانسیسی کو لاہور کا پہلا اینگلیکن بشپ مقرر کیا گیا، جو چرچ آف انڈیا، برما اور سیلون کا ایک بڑا ڈاؤسیس تھا، جس میں سارا پنجاب شامل تھا۔ اس کے بعد نوآبادیاتی ہندوستان میں برطانوی راج، اور 1887 تک ایسا ہی رہا۔ اس عرصے کے دوران 1870 میں ڈیوینیٹی کالج لاہور بھی کھولا گیا۔ Rev. Thomas Patrick Hughes نے پشاور (1864-84) میں 'چرچ مشنری سوسائٹی' کے مشنری کے طور پر خدمات انجام دیں اور کتاب 'اسلام کی لغت' (1885) مرتب کی۔ وہ نوآبادیاتی ہندوستان کے مسیحی انڈین نیشنل کانگریس اور وسیع تر ہندوستانی آزادی کی تحریک میں سرگرم تھے۔ ہندوستانی مسیحیوں کی آل انڈیا کانفرنس میں اجتماعی طور پر نمائندگی کی گئی، جس نے سوراج کی وکالت کی اور ہندوستان کی تقسیم کی مخالفت کی۔

30 اکتوبر 1945 کو ہندوستانی مسیحیوں کی آل انڈیا کانفرنس نے کیتھولک یونین آف انڈیا کے ساتھ ایک مشترکہ کمیٹی تشکیل دی جس نے ایک قرارداد منظور کی جس میں کہا گیا کہ "بھارت کے مستقبل کے آئین میں مذہب کے پیشے، عمل اور تبلیغ کی ضمانت دی جائے اور یہ کہ مذہب کی تبدیلی میں کوئی شہری یا سیاسی معذوری شامل نہیں ہونی چاہیے۔" اس مشترکہ کمیٹی نے نوآبادیاتی ہندوستان میں مسیحیوں کو متحد ہونے کے قابل بنایا، اور برطانوی پارلیمانی وفد کے سامنے " کمیٹی کے اراکین نے متفقہ طور پر آزادی کے اقدام کی حمایت کی اور اظہار خیال کیا۔ مشترکہ کمیٹی کے چھ ارکان آئین ساز اسمبلی کی اقلیتی کمیٹی کے لیے منتخب کیے گئے تھے۔ 16 اپریل 1947 اور 17 اپریل 1947 کو اپنی میٹنگ میں آل انڈیا کانفرنس آف انڈین کرسچن اور کیتھولک یونین آف انڈیا کی مشترکہ کمیٹی نے 13 نکاتی میمورنڈم تیار کیا جو ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی کو بھیجا گیا جس میں مذہبی آزادی کا مطالبہ کیا گیا۔

تحریک پاکستان میں مسیحی نقطہ نظر

جب 14 اگست 1947 کو پاکستان بنا تو مسیحی برادری کی تنظیم اور سرگرمیاں یکسر بدل گئیں۔

کیتھولک یونین آف انڈیا نے اکتوبر 1947 میں بنگلور میں اپنی دوسری سالانہ جنرل میٹنگ میں سندھ اور بلوچستان میں اپنی شاخوں کو آزادی دی۔ پنجاب اور سندھ میں کچھ مسیحی 1945 کے بعد محمد علی جناح کی مسلم لیگ کی حمایت میں کافی سر گرم تھے۔ تحریک کے آخری مرحلے سے پہلے ہی، پوتھن جوزف جیسے سر کردہ ہندوستانی مسیحیوں نے بطور صحافی مسلم لیگ کے لیے گراں قدر خدمات انجام دی تھیں۔ جناح نے بارہا پاکستان کے تمام شہریوں کو مکمل برابری کی شہریت دینے کا وعدہ کیا تھا۔ پاکستان 1956 میں ایک اسلامی جمہوریہ بنا، جس نے اسلام کو قانون سازی کا ذریعہ اور قومی شناخت کا سنگ بنیاد بنایا، جبکہ تمام شہریوں کو مذہبی آزادی اور مساوی شہریت کی ضمانت دی۔ مسلمانوں اور ہندوستانی مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان تنازعہ کی وجہ سے آزادی کے بعد پاکستان اور ہندوستان کے درمیان بڑے پیمانے پر آبادی کے تبادلے میں، زیادہ تر ہندو اور تقریباً تمام سکھ ملک چھوڑ کر چلے گئے۔

پاکستان کی قومی زندگی میں مسیحیوں کا حصہ

پاکستانی پنجاب اب 2 فیصد سے زیادہ مسیحی ہے۔ مسیحیوں نے پاکستانی قومی زندگی میں بہت حصہ ڈالا ہے۔ پاکستان کے پہلے غیر مسلم چیف جسٹس سپریم کورٹ جسٹس اے آر کارنیلیس تھے۔ پاکستانی مسیحیوں نے اپنے آپ کو پاک فضائیہ میں عظیم فائٹر پائلٹ کے طور پر بھی منوایا۔ ان میں سیسل چوہدری، پیٹر اوریلی اور مروین ایل مڈل کوٹ قابل ذکر ہیں۔ مسیحیوں نے ماہرین تعلیم، ڈاکٹروں، وکیلوں اور تاجروں کے طور پر بھی اپنا حصہ ڈالا ہے۔ پاکستان کے کرکٹرز میں سے ایک یوسف یوحنا، پیدائشی مسیحی تھے، لیکن بعد میں اسلام قبول کر لیا، اسلامی نام محمد یوسف رکھا۔ برطانیہ میں، روچیسٹر کے بشپ ایمریٹس مائیکل نذیر علی ایک پاکستانی مسیحی ہیں۔

تعلقات میں شدت

صحافی پامیلا کانسٹیبل کے مطابق، 1980 اور 1990 کی دہائیوں میں پاکستان میں مسیحیوں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی "بڑھنے" لگی تھی۔ کانسٹیبل کے مطابق اس کی ایک وجہ اس دور میں

سخت گیر مذہبی عناصر کی فعالیت تھی۔ امریکہ پر 11/9 کے حملوں کے بعد بھی اقلیتی برادریوں کے لیے مسلمانوں میں شکوک بڑھے۔ 2009 میں، حملوں کے ایک سلسلے میں گوجرہ میں آٹھ مسیحی مارے گئے، جن میں چار خواتین اور ایک بچہ بھی شامل تھا۔ 2013 میں، پشاور میں ایک چرچ میں خودکش بم دھماکے میں 100 سے زائد افراد مارے گئے، اور 2015 میں لاہور کے گرجاگھروں پر ہونے والے حملوں میں 14 افراد قتل ہوئے۔ 27 مارچ 2016 کو لاہور میں ایک کھیل کے میدان پر حملہ کرنے والے ایک خودکش بمبار نے ایسٹر منانے والے مسیحیوں کو نشانہ بنایا (حالانکہ اس واقعے میں زیادہ تر متاثرین مسلمان تھے) جس سے ستر سے زیادہ لوگ مارے گئے۔

تعلیمی تناسب

پاکستان کی نیشنل کونسل فار جسٹس اینڈ پیس (NCJP) کی رپورٹ 2001 کے مطابق مسیحیوں میں خواندگی کی اوسط شرح 34 فیصد ہے۔

حقوق

گو کہ آئین پاکستان میں انہیں مساوی حقوق دیے گئے ہیں مگر سماجی رویوں کے باعث ان سے کیے جانے والے امتیازی سلوک نے نہ صرف ان کی سماجی زندگی بلکہ معاشرتی اور معاشی زندگی پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ مسیحیوں کو عام طور پہ کم درجہ سمجھا جاتا ہے اس لیے ان کے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ 100 میں سے صرف 10 فیصد خاندان ایسے ہیں جو ایک کلاس سے دوسری کلاس میں شفٹ کر جاتے ہیں مثلاً کوئی غربت سے نکل کر بہتری کی طرف آ جاتا ہے اور کوئی مڈل کلاس میں لیکن بہت ہی کم تعداد ان افراد کی ہے جو اپر مڈل کلاس میں جاتے ہیں۔ ایک بڑی تعداد ان کی ہے جو تیزی سے اوپر والی کلاس سے نیچے کی جانب منتقل ہو رہے ہیں۔

ہمارے ملک میں بسنے والی اقلیتوں کو اگر مساوی شہری بنانا درکار ہے تو ان کے لئے نوکریاں اور پیداواری سرگرمیوں میں آسانی پیدا کرنا انتہائی ضروری ہے۔ تاکہ مسیحی نوجوانوں کو اس ریاست

میں یہ احساس نہ ہو کہ دیگر مذاہب کی طرح ان کے لئے روزگار کے برابر مواقع نہیں ہیں۔انہیں معاشرے میں معزز طریقے سے رہنے اور باعزت روزگار کمانے کا مکمل حق ہے۔اس مد میں حکومت کو بھی چاہیے کہ پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ ہونے والے امتیازی سلوک کا سد باب کرتے ہوئے ایسی پالیسیاں مرتب کی جائیں تاکہ انہیں نوکری اور کاروبار کرنے کے وہ تمام وسائل میسر آسکیں جو پاکستان کی اکثریتی آبادی کو حاصل ہیں۔

مسیحیت کے علاوہ پاکستان میں تین مزید بڑے مذاہب کے ماننے والے بھی موجود ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:[1]

ہندو آبادی

ہندو آبادی پاکستان کی سب سے بڑی اقلیت

پاکستان میں ہندومت کے پیروکاروں کی تعداد کل پاکستانی آبادی کا 2.14 فیصد ہے۔ سنہ 1998ء کی مردم شماری کے مطابق اسلام کے بعد پاکستان میں ہندومت دوسرا بڑا مذہب ہے۔ سنہ 2010ء تک پاکستان میں دنیا کی پانچویں سب سے بڑی ہندو آبادی تھی اور پیو(PEW) نے پیش گوئی ہے کہ 2050ء تک پاکستان میں دنیا کی چوتھی سب سے بڑی ہندو آبادی ہو گی۔ پیو ریسرچ کے مطابق ہندو آبادی کی تعداد 5.6 ملین تک پہنچ جائے گی اور سنہ 2050ء میں ہندو پاکستان کی آبادی کا 2 فیصد ہوں گے۔ 14 اگست 1947ء کو پاکستان کی آزادی اور برطانوی ہندوستان سے علیحدگی کے بعد مغربی پاکستان کے 4.7 ملین ہندو اور سکھ بھارت ہجرت کر گئے جبکہ 6.5 ملین مسلمان بھارت سے مغربی پاکستان میں رہنے کے لیے چلے گئے۔ سنہ 1998ء کی مردم شماری کے مطابق ہندوؤں کی تعداد 2,443,614 تھی۔ ہندو پاکستان کے تمام صوبوں میں پائے جاتے ہیں مگر سندھ میں ان کی اکثریت ہے۔ یہ بہت سی زبانیں بولتے ہیں۔ مگر زیادہ تر سندھی، سرائیکی، مارواڑی اور گجراتی زبانیں بولی جاتی ہیں۔

---

[1] ہارون خان، پاکستان میں مذاہب کی موجودہ تاریخ

تاریخ:

قدیم ترین ہندو کتاب رگ وید کے متعلق عقیدہ ہے کہ وہ خطہ پنجاب (موجودہ پاکستان اور بھارت کے کچھ علاقوں) میں دریائے سندھ کے کناروں پر لگ بھگ 1500 قبل مسیح میں لکھی گئی۔ مختلف آثار قدیمہ جیسے کہ سواستک کی علامت اور یوگی شخص جو دکھنے میں پشوپتی کی تصویر معلوم ہوتی ہے، موئن جودڑو، سندھ کے لوگوں کی مہروں (seals) پر دریافت ہوئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم دور میں یہاں ہندومت کا بول بالا تھا۔ جنوبی ایشیا کے اس حصہ میں وادئ سندھ کے لوگوں کی اکثریت ہندو عقیدہ پر قائم تھی۔ ہندوستانی رزمیہ نظم مہابھارت میں سندھ سلطنت اور اس کے حکمرانوں کا اہم کردار ہے۔ ایک مشہور ہندو روایت ہے کہ پاکستانی شہر لاہور کی بنیاد سب سے پہلے لو جبکہ قصور کی بنیاد اس کے جڑواں کش نے رکھی، یہ دونوں راماین کے رام کے بیٹے تھے۔ شمال مغرب کی گندھارا سلطنت اور اس کے افسانوی لوگ بھی ہندو ادب جیسے کہ راماین اور مہابھارت کا ایک اہم حصہ ہیں۔ کئی پاکستانی شہروں کے نام (جیسے کہ پشاور اور ملتان) سنسکرت زبان سے اردو زبان میں داخل ہوئے ہیں۔

آزادی کے بعد پاکستان میں کل آبادی کے لحاظ سے ہندو آبادی کا فیصدی تناسب یہ رہا ہے:

1947ء:	12.9فیصد
1951ء:	1.3فیصد
1961ء:	1.4فیصد
1981ء:	1.5فیصد
1998ء:	1.85فیصد
2017ء:	2.14فیصد

کیا ہندوؤں کی آبادی کم ہوئی ہے؟

عام طور پہ یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ پاکستان میں ہندو آبادی وقت کے ساتھ کم ہوئی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ پاکستان بننے کے بعد پہلی مردم شماری 1951ء میں ہوئی۔ اس مردم شماری کے اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ اس وقت پاکستان میں مجموعی طور پر ہندو کمیونٹی ملک کی کل آبادی کا 12.9 فیصد تھی جس میں سے مغربی پاکستان میں 1.3 فیصد آبادی تھی۔ اور اب 2017ء میں ملک میں ہونے والی آخری مردم شماری کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ اب پاکستان میں ہندو کمیونٹی کا تناسب 2.14 فیصد ہے یعنی 1951ء کے مقابلے میں آج پاکستان میں ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہے۔ علاوہ ازیں، کئی غیر جانبدار اداروں کی رپورٹیں بتاتی ہیں کہ پاکستان میں جس اقلیتی مذہب کی آبادی سب سے زیادہ بڑھ رہی ہے وہ ہندو دھرم ہے۔

سکھ آبادی

امریکا کے اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی 2006ء کی تحقیق کے مطابق پاکستان میں سکھوں کی گنتی 20,000 ہے جبکہ نئے شماریاتی اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں سکھوں کی تعداد 30 ہزار کے لگ بھگ ہے۔ آخری مردم شماری کے فارم میں مسلمان، ہندوؤں، مسیحی اور احمدیوں کے لئے مذہب کا خانہ شامل کیا گیا تھا تاہم سکھ، کیلاش، بہائی اور فارسی برادری کو دیگر کا خانہ مختص کیا گیا تھا اس بنیاد پر موجودہ وقت میں دیگر خانے کے اعداد و شمار سامنے آئے ہیں جو وہ 0.02 فیصد ہے جبکہ 1998 کی مردم شماری میں یہ تعداد زیادہ 0.07 فیصد تھی۔

بہت سے سکھ صوبہ پنجاب میں آباد ہیں جو پرانے پنجاب کا ایک حصہ ہے جہاں سے سکھ مت کی شروعات ہوئی۔ صوبہ خیبر پختونخوا کے دارالحکومت پشاور میں بھی سکھ کافی تعداد میں آباد ہیں۔ ننکانہ صاحب جو سکھ مت کے بانی بابا گرونانک کی جائے پیدائش ہے بھی پنجاب، پاکستان میں ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں سکھ طبقہ ایک طاقتور سیاسی قوت بن گیا اور مہاراجا رنجیت سنگھ نے سکھ سلطنت کی بنیاد رکھی تھی جس کا دارالحکومت لاہور شہر تھا جو آج کے پاکستان کا دوسرا بڑا شہر ہے۔

پنجاب میں سکھ برادری زیادہ تر لاہور، راولپنڈی، ملتان، فیصل آباد اور ننکانہ صاحب میں ہے۔

1947ء میں تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے بہت سے سکھ اور ہندو بھارت چلے گئے۔ 1947ء میں آزادیِ پاکستان کے بعد سکھ برادری نے پاکستان میں منظم ہونا شروع کیا اور پاکستان سکھ گردوارہ پربندھک کمیٹی بنائی تاکہ پاکستان میں سکھوں کے مقدس مقامات اور ورثوں کا تحفظ کیا جاسکے۔ حکومت پاکستان نے بھارتی سکھوں کو پاکستان میں آنے اور اپنے مقدس مقامات کی یاترا کرنے کی اجازت دی ہوئی ہے اور پاکستان سکھوں کو بھارت جانے کی بھی اجازت ہے۔

1947ء میں تقسیم ہند سے پہلے تمام سکھ پاکستان میں بستے تھے، خاص کر خطۂ پنجاب میں اور بطور کسان، تاجر اور کاروباری ان کا معیشت میں بہت اہم کردار تھا۔ پنجاب، پاکستان کے دارالحکومت لاہور آج بھی سکھوں کی کئی اہم مذہبی مقامات کی جگہ ہے، جس میں رنجیت سنگھ کی سمادھی بھی ہے۔ ننکانہ صاحب میں گردوارہ جنم استھان سمیت 9 گردوارے ہیں اور یہ شہر سکھ مت کے بانی بابا گرو نانک کی جائے پیدائش بھی ہے۔ ننکانہ صاحب کا ہر گردوارہ بابا گرو نانک کی زندگی کے مختلف واقعات سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ شہر دنیا بھر کے سکھوں کی یاترا کا اہم مقام ہے۔

بدھ مت

پاکستان کے بہت سے علاقہ جات مقامی تہذیب و تمدن کے قدیم ترین گہوارے رہے ہیں لہٰذا پنجاب، سندھ اور کچھ دیگر علاقوں میں بدھ اثر و نفوذ کی قدامت کی واضح شہادتیں دستیاب ہوتی ہیں۔ ٹیکسلا کے کھنڈر قدیم مقامی آبادی کے بدھ مت سے متعلق عقیدت مندانہ رجحان کے عکاس ہیں۔ 1950ء سے 1960ء کی دہائی میں مرتب ہونے والے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں 4 لاکھ سے زائد بدھی پیروکار موجود تھے جن کی کثیر تعداد مشرقی پاکستان میں آباد تھی لیکن 1971ء میں سقوط ڈھاکہ کے بعد پاکستان میں بدھوں کی بہت کم تعداد باقی رہ گئی۔

1961ء کی مردم شماری رپورٹوں کے مطابق مشرقی و مغربی پاکستان میں بدھ مذہب کی شرح کل آبادی کا 0.38 فیصد تھی۔ دائرۃ المعارف اسلامیہ کے مطابق گزشتہ صدی کے ساتویں عشرے

میں پاکستان میں بدھوں کی تعداد تین لاکھ ستر ہزار کے قریب تھے۔اس دور میں بدھی پیروکار مشرقی پاکستان کی کل آبادی کا 0.74 اور مغربی پاکستان کی کل آبادی کا 0.01 فیصد تھے، چنانچہ 1981ء کی مردم شماری کے مطابق پاکستان میں بدھوں کی کل تعداد 2639 تھی جو اب یقیناً کچھ بڑھ گئی ہوگئی۔ انسائکلوپیڈیا پاکستانیکا (مرتبہ: سید قاسم محمد) کے مطابق پاکستان میں بدھوں کے تقریباً اڑھائی ہزار نفوس کل ملکی آبادی کا0.003 فیصد ہیں۔

پاکستان میں اقلیتوں کے مسائل: حقائق اور تجاویز

محمد اسرار مدنی

بلاشبہ پاکستان میں اقلیتوں کو کئی مسائل کا سامنا ہے۔ اس بات کو تقریبا اکثریت تسلیم بھی کرتی ہے۔ لیکن اس قضیے کے چند دیگر پہلو بھی ہیں جن سے عموماً صرفِ نظر کردیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پہ اگر اس کا موازنہ پڑوسی ملک بھارت سے کیا جائے تو اچھا خاصافرق محسوس ہوتا ہے، یا یہ کہ عمومی خلفشار، بدامنی اور بری گورننس کے ساتھ پاکستان میں اقلیتوں کے لیے جو اقدامات کیے گئے ہیں وہ بھی کافی خوش آئند ہیں۔ دوسرا پہلو اقلیتوں کے مسائل کے ضمن میں رابطہ کاری و سفارتی نوعیت کا بھی ہے جس میں ریاست کی کمزوریاں واضح جھلکتی ہیں۔ اس مضمون میں اقلیتوں کے بارے میں چند اوجھل پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ مضمون مئی 2021ء میں پاکستان کی اقلیتوں کے مسائل کے پیشِ نظر یورپی یونین کی طرف سے تجارتی پابندی کی ایک قرارداد پر بحث کے تناظر میں لکھا گیا۔

انسانی حقوق اور اقلیتوں کے مسائل کے حوالے سے پاکستان ایک طویل عرصے سے تسلسل کے ساتھ اعتراضات و خدشات کی زد میں ہے۔ بد قسمتی سے بین الاقوامی سطح پر پاکستان کا تصور ایک ایسے ملک کا بن رہا ہے کہ جہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں ہوتی ہوں، اقلیتوں کے لیے زمین تنگ کر دی گئی ہو اور جہاں ریاست ان تمام معاملات میں ظالم کے ساتھ کھڑی نظر آتی ہو۔ یہ تصور اس طور پختہ بنادیا گیا ہے کہ ملک کا اپنا عام شہری بھی یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ کیا واقعی ہم ایک ایسا ملک ہیں جہاں انصاف کی بات نہیں ہوتی اور جہاں مذہب کے نام پر صرف جبر کو روا رکھا جاتا ہے؟ اگر کچھ غور کیا جائے تو واضح طور پہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ تنقید کے ہر پیرائے میں کہیں نہ کہیں مذہب کو ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ پاکستان میں سماجی سطح پر جس قسم کی ناہمواری پائی جاتی ہے اس کا سبب بھی یہ گردانا جاتا ہے کہ جیسے مذہب اس کی وجہ ہے۔ حال ہی میں ڈاکٹر شعیب سڈل کی سربراہی میں قائم یک رکنی اقلیتی کمیشن نے اپنی رپورٹ عدالت عظمی میں جمع کرائی ہے جس میں تجویز دی گئی ہے کہ مذہب سے متعلقہ تعلیمات کو نصاب کے اندر صرف اسلامیات کے مضامین تک ہی محدود رکھا جائے۔ پاکستان

میں مذہبی تعلیمات کے حوالے سے نصاب بھی وقتاً فوقتاً زیر بحث رہتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ملک میں شدت پسندی اور بنیادپرست ذہنیت کے فروغ کا ایک بڑا سبب نصاب ہے، لہذا اس سے مذہبی تعلیمات کو کم کیا جائے۔

گویا مجموعی طور پہ انسانی حقوق کا مسئلہ ہو، اقلیتوں کے مسائل کی بات ہو یا شدت پسندی کا ذکر آئے، ہر سطح پر مذہب اور مذہبی تعلیمات کو ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے، اور یہ بحث ملک کی مذہبی شناخت کی جانب موڑ دی جاتی ہے۔ اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ پاکستان میں ایک خاص حلقے نے مذہب کے نام پر تشدد کو مجاز کہا، ملک ایک عرصے تک دہشت گردی کی آگ میں جھلستا رہا ہے اور یہاں عام لوگ اس سے شدید متاثر ہوئے۔ تاہم یہ کہنا درست نہیں کہ اس سب کا ذمہ دار مجموعی طور پہ مذہب ہے یا ملک کا مذہبی تشخص ہے۔ ملک کے معتدل مذہبی حلقے نے ہمیشہ ریاست کا ساتھ دیا، متشدد تحریکوں اور جماعتوں سے دستبرداری کا اظہار کیا۔ اگر مذہبی طبقے کے اندر سے بڑی طاقت ریاست کے شانہ بشانہ نہ کھڑی ہوتی تو متشدد تحریکوں وجماعتوں کو بے اثر نہ کیا جا سکتا۔ تحریک لبیک کے معاملے میں مظاہرے ہوئے اور صورتحال مزید ابتری کی جانب جاتی نظر آئی لیکن مذہبی حلقے کے اندر کی ثالثی سے معاملات پر قابو پالیا گیا۔ مذہبی جماعتوں سے جڑے کئی مخدوش معاملات اسی نوعیت کے ہیں جن میں انتظامی نوعیت کی کوتاہیاں شامل ہوتی ہیں۔ انتظامی امور جب بے قابو ہوتے ہیں تو ان کے حقیقی اسباب کو تلاش کرنے اور انہیں درست کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، جس کی طرف عموماً قدم نہیں اٹھایا جاتا، اور ملبہ ایک دوسرے پر ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ملک کی بعض مذہبی جماعتیں احتجاج اور مظاہروں کی پالیسی اپنائے ہوئے ہیں جس کی حمایت نہیں کی جاسکتی، تاہم سوال یہ بھی ہے کہ انتظامی سطح پر امور کتنے شفاف اور بے غبار ہیں؟

یہ پاکستان میں مذہب اور مذہبی جماعتوں کے مسائل کے حوالے سے نقطہ نظر کا ایک رخ ہے کہ ہم داخلی سطح پر بعض معاملات کو بے غبار اور شفاف نہیں بنا سکے۔ ہماری چھوٹی چھوٹی انتظامی ناکامیاں اور نااہلیاں اس حد تک خرابی کا باعث بن جاتی ہیں کہ ان کی وجہ سے مذہب اور ملک کی مذہبی شناخت پر سوال کھڑے کر دیے جاتے ہیں۔

اب تصویر کے ایک دوسرے رخ پر نظر ڈالی جانی چاہیے۔ پاکستان انسانی حقوق اور اقلیتوں کے مسائل کے حل کے لیے تسلسل کے ساتھ کوششیں بروئے کار لا رہا ہے۔ لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ ان اقدامات کو بین الاقوامی سطح پر سراہا نہیں جاتا۔ حتیٰ کہ پروپیگنڈہ اس حد تک کیا جاتا ہے کہ حقیقی اعداد و شمار کا جائزہ بھی نہیں لیا جاتا۔ صرف پاکستان میں ہونے والے بعض ناخوشگوار واقعات کو اتنا اچھالا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے یوں لگتا ہے جیسے پاکستان میں محض ظلم اور ناانصافیاں روا رکھی جاتی ہیں اور اقلیتوں کو زندہ رہنے کی کوئی آزادی میسر نہیں ہے۔ اگر پاکستان کا بھارت کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ پاکستان انسانی حقوق اور اقلیتوں کے حوالے سے بدرجہا بہتر ہے۔ کشمیر میں لاکھوں کی آبادی کئی مہینوں سے سخت فوجی محاصرے میں قید ہے۔ حتیٰ کہ شہریت بل کی اساس پر ہزاروں لوگوں سے ان کی شہریت چھیننے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کے باوجود دنیا کی مارکیٹ میں اس پر دروازے بند نہیں ہوتے۔ امریکا کا سرکاری ادارہ 'یونائیٹڈ سٹیٹ کمیشن آن انٹرنیشنل ریلیجس فریڈم (USIRF)' مسلسل دو سال سے بھارت میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر تنقید کر رہا ہے کہ بھارت اس معاملے میں پیچھے کی طرف جا رہا ہے، اور اس بنیاد پر وہ اپنی رپورٹس میں اسے بلیک لسٹ کرنے کا عندیہ بھی دے چکا ہے۔ مگر بدقسمتی سے پاکستان کی صورتحال یہ ہے کہ وہ انسانی حقوق اور اقلیتی برادریوں کی سہولت کے لیے کئی اچھے اور معیاری اقدامات کر چکا ہے مگر انہیں قومی سطح پر دنیا کے سامنے بہتر انداز میں سامنے نہیں لا سکا۔

(۱) پچھلے چند سالوں کے دوران پاکستان نے متعدد ایسے اقدامات کیے ہیں جو قابل تعریف ہیں اور جن کا دنیا نے اعتراف بھی کیا۔ ان میں سے ایک سکھ مذہب کے یاتریوں کے لیے کرتارپور راہداری کو کھولنا نمایاں قدم ہے۔ بھارت سے سے سکھ مذہب سے تعلق رکھنے والے شہریوں کو یہاں آنے کی سہولت فراہم کی گئی۔

(۲) آسیہ مسیح کی رہائی پر پاکستان میں سخت احتجاج ہوئے۔ یہ ہائی پروفائل کیس بن چکا تھا، کسی کو یقین نہیں تھا کہ پاکستان آسیہ مسیح کو چھوڑنے کا دباؤ برداشت کر پائے گا۔ مگر اسے رہائی ملی اور پاکستان سے باہر محفوظ طریقے سے پہنچایا گیا۔ پاکستان میں دنیا بھر کی اقلیتی برادریوں کے لیے مذہبی

سیاحت کا منصوبہ متعارف کرایا گیا۔ غیر مسلموں کے عبادت خانوں اوران کی یادگاروں کی تعمیر نو کی گئی اوران جگہوں کو محفوظ بنانے کے لیے اقدامات کیے گئے۔

(۳) یکساں نصابِ تعلیم تحت وفاقی وزارت تعلیم نے پانچ مذاہب کیلئے الگ مذہبی نصاب ترتیب دئے اور اس نصاب سازی میں متعلقہ تمام اقلیتوں کو مسلسل مشاورت میں شامل کیا گیا، ملک کی تمام انتہا پسند اور شدت پسند تنظیموں پر پابندی عائد کی گئی ہے، ان کے رہنماؤں کو گرفتار کیا گیا ہے۔ تنظیموں کے اثاثے منجمد کیے گئے، ان کے ادارے بھی تحویل میں لیے گئے ہیں۔

یہ چند ایسے اقدامات ہیں جو پاکستان نے حالیہ سالوں میں اٹھائے ہیں اور نہایت تیزی کے ساتھ ان پر عملدرآمد بھی کرایا گیا ہے۔ یہ سب اقدامات انتہائی مؤثر اور اہم ہیں۔ مگر اس کے باوجود بھی صورتحال یہ ہے کہ ملک میں انسانی حقوق اور اقلیتوں کا مسئلہ بین الاقوامی حیثیت اختیار کر گیا ہے جس کے اثرات بھی بہت بڑے اور گہرے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے کہ ہم جنوبی ایشیا کے دیگر ممالک کی بنسبت عملاً بہتر اقدامات کر رہے ہیں مگر ہماری شبیہ مخدوش ہے اور مسائل کا سامنا ہے ؟اس کی کئی وجوہات ہیں جن کا خلاصہ تجاویز کی شکل میں یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

ایک تو یہ کہ پاکستان میں ریاستی سطح پر انسانی حقوق اور اقلیتوں کے مسائل سے جڑے امور کو دیکھنے کا عمل تقسیم کا شکار ہے۔ جب بھی پاکستان کو اس سے متعلقہ کوئی چیلنج درپیش ہوتا ہے تو یہ واضح نہیں ہو پاتا کہ اس پر کام کرنے اور اس ضمن میں اقدامات کرنے کی ذمہ داری کس کی ہے۔ اقلیتوں کے حوالے سے دو کمیشن فعال ہیں ایک سپریم کورٹ کے فیصلے کی بنیاد پر شعیب سڈل کمیشن جبکہ موجودہ حکومت نے تمام مذاہب پر مشتمل نیشنل مینارٹی کمیشن بنایا ہے، جس کے چیئرمین کیولا رام چیلانی ہیں، دونوں کمیشن کے بیانات اور موقف آپس میں متضاد ہیں۔

وزات مذہبی امور کیساتھ بین المذاہب ہم آہنگی کا شعبہ بھی ہے جبکہ وزارت انسانی حقوق کا مطالبہ ہے کہ یہ ہمارے پاس ہونا چاہئے، لیکن حال ہی میں حکومت نے بین المذاہب ہم آہنگی اور مشرق وسطی کے لیے علامہ طاہر اشرفی کو مشیر مقرر کر دیا ہے۔

پاکستان انسانی حقوق اور اقلیتوں کی صورتحال کے حوالے سے دیگر ممالک کی رپورٹس پر اعتماد کرتا ہے۔ جبکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ پاکستان سالانہ اپنی رپورٹ جاری کرے۔ تاکہ ایک شفاف طریقے سے یہ چیز واضح کہ پاکستان کس حد تک ان امور میں بہتری کی جانب گامزن ہے۔ پاکستان میں اقلیتوں کی حالت کیسی ہے یہ بیان کرنے کے لیے یہاں کے اقلیتی وفود کی رائے لی جانی چاہیے۔ انہیں آگے لایا جائے اور ان کی بات کو آگے بڑھایا جائے۔ اس سے پاکستان کا امیج بہتر ہو گا۔

اس کے علاوہ یہ پہلو بھی اہم ہے کہ پاکستان کے اندر صوبائی سطح پر انسانی حقوق اور اقلیتوں کے مسائل کے حوالے سے اس نوعیت کا کام نہیں ہو رہا جس کی ضرورت ہے۔ وزارتِ انسانی حقوق، وزارت مذہبی امور اور اقلیتی کمیشن کی باڈیز کو مشترکہ طور پہ ایک ڈھانچہ تشکیل دینے کی ضرورت ہے۔ اگر ان تمام اداروں کے مابین اشتراک نہیں ہو گا تو نتائج خوش آئند نہیں نکلیں گے۔

پاکستان میں ان تمام معاملات میں قانون موجود ہیں۔ اگر ان کا درست استعمال ہو اور ایک منظم طریقے سے ان پر عمل کیا جائے کہ اس میں جانبداری کا کوئی شبہ نہ ہو تو اس طرح کے مسائل پیچیدہ صورتحال اختیار نہیں کریں گے۔ اگر بالفرض قانونی سقم موجود بھی ہیں تو انہیں دور کیا جاسکتا ہے۔ قانونی نظام میں بے شمار پیچیدگیاں ہیں جس کیوجہ سے توہین مذہب کے واقعات بھی مسلسل تعطل کے شکار رہتے ہیں جس کیوجہ سے ماورائے عدالت قتل عام میں مسلسل اضافی ہوتا رہا، بلکہ ایک بار تو ملزم کو کمرہ عدالت میں مار دیا گیا۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ایسے واقعات کیلئے خصوصی کورٹس تشکیل دی جائیں، جس میں بروقت فیصلے ہوں، اور مظلوموں کی دادرسی ہو سکے۔

میری رائے میں وزارت خارجہ یا پرائم منسٹر آفس میں ان امور کے لیے ایک خصوصی شعبہ تشکیل دیا جائے جس کے تحت اقلیتی کمیشن، اسلامی نظریاتی کونسل، وزارت مذہبی امور اور وزارت انسانی حقوق مل کر ایک کمیٹی تشکیل دیں جو ایک مربوط پالیسی رپورٹ مرتب کرے اور یورپی یونین

سمیت دنیا بھر میں اسے پیش کرے۔اس مقصد کے لیے 'کنگ عبداللہ انٹر نیشنل سنٹر برائے بین المذاہب و بین الثقافتی مکالمہ' آسٹریا، اسلامی ممالک کی تنظیم OIC، دوبئی، ابوظہبی، قطر، ملائیشیا اور ترکی میں ہونے والے کام کا جائزہ لیا جائے اور اس کی روشنی میں آگے بڑھا جائے۔

فارن آفس اور برسلز سمیت ہر جگہ پاکستان کے سفارتی عملے پر بھی سوال اٹھتا ہے کہ اتنی بڑی کارروائی کا سلسلہ جاری تھا اور ہمارے متعلقہ ادارے بے خبر تھے؟ نیز دنیا بھر میں تمام سفارتکار بین المذاہب تقریبات میں شرکت کرتے ہیں جبکہ پاکستانی ایمبیسیز کی حاضری سب سے کم ہوتی ہے۔

پاکستان نے اپنی سطح پر بہت مؤثر اور نمایاں اقدامات کیے ہیں مگر اس کے باوجود اس کے خلاف ہونے والا پروپیگنڈہ زیادہ کامیاب ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم خود اپنے اندر یہ صلاحیت پیدا کریں اور دنیا کو بتائیں کے اعداد و شمار اور حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو پاکستان خطے کے بہت سارے ممالک سے آگے ہے۔ مگر اصل بات یہ ہے اس پر مقتدر احباب توجہ فرمائیں اور اسے مسئلے کو ترجیحی بنیادوں پر اٹھایا جائے۔

احمدیوں کی مذہبی اور آئینی حیثیت کی بحث

ڈاکٹر عمار خان ناصر

پاکستان میں اقلیتی برادریوں میں سے احمدی برادری کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ اس بات سے قطعا انکار ممکن نہیں کہ ان کا عقیدہ اکثریتی مسلمان آبادی سے بالکل الگ ہے اور ان کے بارے میں آئین میں بھی رائے دیدی گئی ہے۔ لیکن اس سے ہٹ کرجب شہری حقوق کی بات ہوتی ہے تو احمدی برادری کے مطابق انہیں زیادہ تفریق کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور انہیں بعض شہری و معاشرتی حقوق کے حصول میں مسائل کا سامنا ہوتا ہے۔ کیا سماجی حقوق سے متعلق ان کے ساتھ اس طرح کے رویے کا اظہار کرنا درست ہے یا نہیں۔ اس مضمون میں تاریخی، دینی اور قانونی شواہد کی روشنی میں اسی پہلو پر گفتگو کی گئی ہے۔ مصنف ڈاکٹر عمار خان ناصر 'الشریعہ اکیڈمی' کے سربراہ ہیں۔ گفٹ یونیورسٹی گوجرانوالہ میں درس و تدریس سے منسلک ہیں۔آپ کا شمار ملک کے مذہبی مفکرین کی توانا آوازوں میں ہوتا ہے۔یہ مضمون مجلہ 'الشریعہ' میں شائع ہوا۔

احمدیوں کی تکفیر اور ختم نبوت سے متعلق امت مسلمہ کے اجماعی عقیدے کے تحفظ کے ضمن میں کچھ عرصہ قبل ہمارے ہاں کی جانے والی قانون سازی بعض مبینہ قانونی ترمیمات کے تناظر میں ایک بار پھر زیر بحث رہی۔ اس پس منظر میں والد گرامی مولانا زاہد الراشدی نے اپنی ایک تحریر میں بعض توجہ طلب سوالات دینی حلقوں کے غور وفکر کے لیے اٹھائے تھے۔ ان میں سے ایک نکتہ یہ ہے کہ:

''چوتھی بات اس مسئلہ کے حوالہ سے ان حلقوں کے بارے میں کرنا چاہتا ہوں جو ۱۹۷۴ء کے بعد سے مسلسل مسئلہ ختم نبوت کے دستوری اور قانونی معاملات کو سبوتاژ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ یہ بین الاقوامی ادارے ہوں، عالمی سیکولر لابیاں ہوں یا ملک کے اندر قادیانیت نواز حلقے ہوں، جب یہ ان کے علم میں ہے اور انہیں اس بات کا پوری طرح اندازہ ہے کہ وہ اس مسئلہ پر پاکستان کی رائے عامہ، سول سوسائٹی اور منتخب اداروں میں سے کسی کا کھلے بندوں سامنا نہیں کر سکتے

اور ہر بار انہیں درپردہ سازشوں کا ہی سہارا لینا پڑتا ہے تو وہ پاکستانی قوم کے اجتماعی فیصلے کو تسلیم کرنے اور زمینی حقائق کا اعتراف کر لینے سے مسلسل کیوں انکاری ہیں؟ یہ انصاف، جمہوریت، اصول پرستی اور حقیقت پسندی کی کون سی قسم ہے کہ پاکستانی قوم نے اجتماعی طور پر ایک فیصلہ کیا ہے اور وہ اس پر قائم رہنا چاہتی ہے تو اسے اس سے ہٹانے کے لیے دباؤ، سازش اور درپردہ کارروائیوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اور اپنے اجماعی عقیدہ اور موقف سے ہٹنے پر بلاوجہ مجبور کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ ان بین الاقوامی اور اندرون ملک حلقوں کو ان کی اس غلط روی بلکہ دھاندلی کا احساس دلانے کی ضرورت ہے۔" (روزنامہ اسلام، ۸ نومبر ۲۰۱۷ء)

آئندہ سطور میں ہم اس سوال کے بعض پہلوؤں کے حوالے سے اپنی معروضات پیش کرنا چاہیں گے۔

یہ بات درست ہے کہ مغربی حکومتوں اور بین الاقوامی اداروں کی طرف سے پاکستان میں اسلامی قانون سازی کے ضمن میں کیے جانے والے اقدامات کو ختم کرنے کے لیے دباؤ موجود ہے اور اس کے لیے علانیہ اور پس پردہ کوششوں کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ احمدی کمیونٹی اپنا مقدمہ بین الاقوامی فورمز پر مسلسل پیش کر کے عالمی سطح پر عمومی ہمدردی حاصل کر چکی ہے اور اپنے خلاف امتیازی قوانین کے خاتمے کے لیے پاکستانی حکومت پر مختلف اطراف سے دباؤ کو بڑھانے کے لیے بھی کوشاں رہتی ہے۔ تاہم ہمارے نزدیک اس صورت حال کو سادہ طور پر "پاکستانی قوم کے اجتماعی فیصلے کو تسلیم نہ کرنے" اور "اپنے اجماعی عقیدہ اور موقف سے ہٹنے پر بلاوجہ مجبور کرنے" سے تعبیر کرنے سے پہلے ذرا توقف کر کے معاملے کے چند بنیادی پہلوؤں پر غور کر لینے اور بالخصوص زاویہ نظر کے اس اختلاف کو سمجھنے کی ضرورت ہے جو احمدیوں کے حوالے سے ہمارے مذہبی موقف اور اس کی مخالفت کرنے والے بین الاقوامی اور قومی حلقوں کے مابین پایا جاتا ہے۔

احمدیوں سے متعلق مذہبی موقف کا ایک نکتہ تو یہ ہے کہ احمدی، امت مسلمہ کے نزدیک مسلمہ اور متفقہ مفہوم کے اعتبار سے اسلام کے ایک بنیادی عقیدے یعنی ختم نبوت پر یقین نہیں رکھتے اور اس وجہ سے امت مسلمہ نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا ہے کہ اعتقادی اور قانونی لحاظ سے انھیں مسلمانوں کا

حصہ شمار نہیں کیا جائے گا۔ اسلام کے اعتقادی نظام کا تحفظ نہ صرف مسلمانوں کا اجتماعی دینی فریضہ ہے، بلکہ سیکولر اخلاقی معیارات کے لحاظ سے بھی یہ مسلمانوں کا گروہی حق بنتا ہے کہ وہ اپنی مذہبی شناخت کو محفوظ رکھنے کے لیے کسی ایسے گروہ کو اپنا حصہ شمار نہ کریں جو شناخت کے کسی بنیادی اور اساسی جزو کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ تاہم اصل پیچیدگی اس نکتے کو تسلیم کر لینے کے بعد سامنے آتی ہے۔

مسلمانوں کی روایتی مذہبی تعبیرات کی رو سے اگر مسلمانوں میں سے کوئی فرد یا گروہ اپنے کسی عقیدے یا عمل کی وجہ سے دائرہ اسلام سے خارج شمار کیا جائے تو اس کا قانونی حکم یہ ہے کہ توبہ کا موقع دیے جانے کے باوجود اگر وہ اپنے عقیدہ و عمل پر قائم رہے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ اس تعبیر کی رو سے احمدیوں کا، اور خاص طور پر ان کی پہلی نسل کا، شرعی حکم یہ بنتا تھا کہ انھیں ارتداد کی پاداش میں قتل کر دیا جائے۔ چنانچہ علماء نے نظری طور پر احمدیوں کی تکفیر کے ساتھ ساتھ ان کا یہ قانونی حکم بھی واضح کیا، تاہم چونکہ یہ صورت حال اس وقت پیش آئی تھی جب برصغیر میں اسلامی اقتدار قائم نہیں تھا، اس لیے مذکورہ قانون پر عمل درآمد نہیں ہو سکتا تھا۔ اس پس منظر میں علامہ محمد اقبال نے، جو اس صورت حال کو روایتی فقہی تعبیرات کے بجائے جدید سیاسی و قانونی تصورات کے تناظر میں دیکھ رہے تھے، یہ تجویز کیا کہ احمدیوں کو مرتد اور گردن زدنی قرار دینے کے بجائے ایک غیر مسلم اقلیت کا درجہ دے دیا جائے اور مسلمان ان کے ساتھ عملاً وہی برتاؤ کریں جو دوسرے غیر مسلموں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ روایتی علما اگرچہ اپنی تحریروں میں عموماً احمدیوں کے متعلق روایتی فقہی موقف کا ہی اعادہ کرتے رہے، تاہم پاکستان بننے کے بعد جب اس ضمن میں عملی قانون سازی کا موقع آیا تو تمام مکاتب فکر کے اکابر علماء کی ایک مجلس نے اتفاق رائے سے علامہ اقبال کے تجویز کردہ حل کو قبول کر لیا اور یہ مطالبہ کیا کہ احمدیوں کو پاکستان میں غیر مسلم اقلیت کا درجہ دیا جائے۔

والد گرامی مولانا زاہد الراشدی نے موقف کی اس تبدیلی کو علماء کے اجتہادی زاویہ نظر کی ایک نمایاں مثال کے طور پر پیش کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

''اس تاریخی حقیقت کو پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہے کہ قیام پاکستان کے بعد جب علمائے کرام کو نئی ریاست کی دستوری حیثیت کا تعین کرنے کے لیے فیصلہ کرنے کا موقع ملا تو انھوں نے

ماضی کی روایات سے بے لچک طور پر بندھے رہنے کے بجائے وقت کے تقاضوں اور علامہ اقبال کی فکر کا ساتھ دیا۔ عقیدۂ ختم نبوت کے منکر قادیانیوں کو مرتد کا درجہ دے کر فقہی احکام کے مطابق گردن زدنی قرار دینے کے بجائے علامہ اقبال کی تجویز کی روشنی میں غیر مسلم اقلیت کی حیثیت دے کر ان کے جان ومال کے تحفظ کے حق کو تسلیم کرنا بھی ملک کے علما کا ایک ایسا اجتہادی فیصلہ ہے جس کے پیچھے علامہ محمد اقبال کی فکر کارفرما دکھائی دیتی ہے۔'' (عصر حاضر میں اجتہاد، شائع کردہ: الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ، فروری ۲۰۰۸ء، ص ۳۸)

یہاں یہ بات سمجھنا اہم ہے کہ مذہبی علماء نے علامہ محمد اقبال کی تجویز کو نتیجے کے اعتبار سے تو قبول کر لیا، یعنی یہ کہ احمدیوں کو قتل نہیں کیا جائے گا، تاہم وہ اقبال کی رائے کی اصل بنیاد پر یا تو غور نہیں کر سکے اور یا اسے قبول کرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوا۔ اقبال کی رائے، جیسا کہ عرض کیا گیا، ایک جمہوری ریاست میں حق شہریت کے جدید تصورات پر مبنی تھی جس کی رو سے ریاست کے تمام باشندوں کو یکساں شہری وسیاسی حقوق حاصل ہوتے ہیں اور ریاست کسی گروہ کے ساتھ مذہبی جبر کا اختیار نہیں رکھتی۔ یہ تصور، ظاہر ہے کہ دار الاسلام کے کلاسیکی فقہی تصور سے بالکل مختلف ہے جس میں نہ صرف یہ کہ ریاست کو ارتداد پر سزا دینے کا حق حاصل تھا، بلکہ ریاست کے غیر مسلم باشندے بھی شہری وسیاسی حقوق کے اعتبار سے مساوی درجے کے شہری تسلیم نہیں کیے جاتے تھے، اگرچہ ریاست مخصوص شرائط کی پابندی کے ساتھ ان کے جان ومال اور مذہبی آزادی کے تحفظ کی ذمہ دار سمجھی جاتی تھی۔ فقہی اصطلاح میں اسی وجہ سے انھیں ''اہل ذمہ'' قرار دیا جاتا ہے۔ مزید برآں اسلامی قانون کی رو سے اسلام سے ارتداد اختیار کرنے والے فرد یا گروہ کے بارے میں ریاست کو یہ اختیار بھی حاصل نہیں تھا کہ وہ انھیں ''اہل ذمہ'' کا درجہ دے کر دوسرے غیر مسلموں کی طرح ان کے جان ومال اور مذہبی آزادی کے تحفظ کی ضامن بن جائے۔

اب ہوا یہ کہ احمدیوں کے حوالے سے اقبال کی تجویز کو علماء نے ظاہری نتیجے کے لحاظ سے تو قبول کیا، لیکن معاملے کے مختلف پہلوؤں کو بنیادی طور پر روایتی فقہی زاویے سے ہی دیکھتے رہے اور اس ثنویت یا دو ذہنی کا اظہار علماء کے موقف میں مختلف پہلوؤں سے ہونے لگا۔ مثلاً متعدد ذمہ دار

مذہبی علماء اور اداروں کی طرف سے تسلسل کے ساتھ یہ کہا گیا کہ قادیانیوں کے بارے میں پارلیمنٹ کا فیصلہ موجودہ حالات کے اعتبار سے وہ کم سے کم اقدام ہے جو ممکن تھا، لیکن ان کا اصل حکم یہی ہے کہ جب بھی حالات سازگار ہوں، ان پر زندقہ وارتداد کے احکام جاری کیے جائیں۔ پھر جن علماء نے پارلیمنٹ کے فیصلے کو ایک حتمی فیصلے کے طور پر قبول کیا، انھوں نے بھی احمدیوں کے لیے غیر مسلم اقلیت کے حقوق تسلیم کرنے کو ایسی شرائط کے ساتھ مشروط کر دیا جو شہریت کے جدید تصور کے بجائے ذمہ کے روایتی فقہی تصور سے پیدا ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر ۱۹۷۴ء میں قومی اسمبلی کے فیصلے کے بعد مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے اس کے شرعی نتائج واضح کرتے ہوئے لکھا:

''مرزائیوں کی حیثیت قبل ازیں کفار محاربین کی تھی اور قومی اسمبلی کے فیصلہ کے بعد اس کی حیثیت پاکستان کے غیر مسلم شہریوں کی ہے جن کو ذمی کہا جاتا ہے (بشرطیکہ وہ بھی پاکستان میں بحیثیت غیر مسلم کے رہنا قبول کر لیں، اس لیے کہ عقد ذمہ دو طرفہ معاہدہ ہے)۔ اور کسی ذمی کے جان و مال پر ہاتھ ڈالنا اتنا سنگین جرم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن بارگاہ الٰہی میں ایسے شخص کے خلاف نالش کریں گے۔ اس بنا پر تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ ان کی جان و مال کی حفاظت کریں۔ مجلس عمل نے مرزائیوں سے سوشل بائیکاٹ کا فیصلہ کیا تھا جو مسلمانوں کے دائرہ اختیار کی چیز تھی، لیکن جن مرزائیوں نے قومی اسمبلی کا فیصلہ تسلیم کر کے اپنے غیر مسلم شہری ہونے کا اقرار کر لیا ہو، اب ان سے سوشل بائیکاٹ نہیں ہوگا۔ اور جو مرزائی اس فیصلہ کو قبول نہ کر رہے ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ مسلمانوں سے ترک محاربت پر آمادہ نہیں۔'' (احتساب قادیانیت، شائع کردہ مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، جلد ۱۶، ص ۳۳۳)

یہاں ''محاربین'' اور ''ذمی'' کی اصطلاحات کے استعمال سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا کے ذہن میں گفتگو کا تناظر ایک جمہوری ریاست نہیں، بلکہ دار الاسلام کا فقہی تصور ہے، اس لیے کہ جمہوری ریاست کے باشندوں کو نہ تو عقیدہ و مذہب کے اختلاف کی وجہ سے محارب کہا جا سکتا ہے اور نہ غیر مسلم شہریوں کو ذمی۔ پاکستان کے آئین کی رو سے احمدیوں کے شہری و سیاسی حقوق سے بہرہ ور ہونے یا نہ ہونے کا تعین ان کے مسلمان یا غیر مسلم ہونے پر سرے سے منحصر ہی نہیں تھا، کیونکہ

انھیں یہ تمام حقوق اس فیصلے سے پہلے بھی حاصل تھے اور اس کے بعد بھی۔

پھر ''ذمی'' کی حیثیت سے ان کے جان ومال کے تحفظ کو اس سے مشروط کرنا کہ وہ خود کو غیر مسلم تسلیم کر لیں، بدیہی وجوہ سے ناقابل فہم ہے۔ آئین شہریت کی شرائط میں اسے شمار نہیں کرتا کہ کوئی شخص نظری طور پر من کل الوجوہ آئین کے تمام اجزا کو تسلیم کرے۔ شہریت کا تعلق عملاً آئین اور قانون کی پابندی کرنے اور ملک وقوم کے مفاد کے ساتھ وفاداری سے ہے اور کسی مخصوص سیاسی نظریے یا مذہبی عقیدے کو غداری کے ہم معنی نہیں سمجھا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں مذہبی آئین کے مخالف اور سیکولر ریاست کے حامی گروہ موجود ہیں اور پوری طرح شہری وسیاسی حقوق سے بہرہ مند ہیں۔ اسی طرح جمہوریت کو غلط سمجھنے اور اس پر تنقید کرنے والے مذہبی گروہ بھی یہاں پائے جاتے ہیں اور ان کے لیے بھی وہ تمام شہری وسیاسی حقوق تسلیم کیے جاتے ہیں جو باقی شہریوں کو حاصل ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ غیر مسلم اقلیت تسلیم کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ انھیں اپنے عقیدے پر رہتے ہوئے شہری حقوق حاصل ہوں گے۔ احمدی اپنے عقیدے کے مطابق خود کو مسلمان تصور کرتے ہیں۔ امت مسلمہ ان کا یہ دعویٰ قبول نہیں کرتی، یہ تو درست ہے، لیکن احمدیوں سے یہ مطالبہ کہ وہ بھی خود کو مسلمان نہ سمجھیں، دراصل اس بات کا مطالبہ ہے کہ وہ اپنا عقیدہ چھوڑ دیں، تبھی انھیں اقلیت کے حقوق حاصل ہوں گے۔

(اس حوالے سے مذہبی طبقوں کی عمومی نفسیات نامعقولیت کی جن حدوں کو چھو رہی ہے، اس کا اندازہ گزشتہ دنوں سوشل میڈیا پر شیئر کی جانے والی ایک درخواست سے کیا جا سکتا ہے جو ایک مذہبی تنظیم کے ذمہ داران کی طرف سے احمدیوں کے خلاف مقدمہ کے اندراج کے لیے پولیس کو دی گئی ہے۔ درخواست میں کہا گیا ہے کہ فلاں اور فلاں احمدیوں نے ضلعی انتظامیہ کے نام درخواست کے شروع میں بسم اللہ اور حضرت محمد کے نام کے ساتھ صلی اللہ علیہ وسلم لکھا ہے جو کہ اسلامی شعائر ہیں اور ان کا استعمال صرف مسلمان کر سکتے ہیں، اس لیے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے اور قانون کی خلاف ورزی پر مذکورہ درخواست دہندگان کے خلاف مقدمہ درج کیا جائے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔)

شہریت کے تصور کے حوالے سے زیر بحث الجھاؤ کا دوسرا بنیادی اظہار اس مطالبے میں ہوتا ہے کہ احمدیوں کے لیے کلیدی مناصب پر تقرر کو ممنوع قرار دیا جائے۔ یہ مذہبی علماء کا ایک بنیادی مطالبہ رہا ہے اور پارلیمنٹ میں احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیے جانے کے بعد سے لے کر اب تک اس کا اعادہ کیا جاتا اور اس کی قانونی عدم تنفیذ کی وجہ سے غیر مسلم قرار دیے جانے کے فیصلے کو بھی ادھورا قرار دیا جاتا ہے۔ یہاں بھی بدیہی طور پر وہی الجھاؤ کارفرما ہے، کیونکہ یہ مطالبہ دارالاسلام کے اہل ذمہ کے بارے میں تو کیا جا سکتا ہے، لیکن جمہوری قومی ریاست کے تناظر میں اس کا کوئی آئینی جواز نہیں بنتا۔ آئین، چند ایک استثناءات کے ساتھ، شہری و سیاسی حقوق میں مذہب کی بنیاد پر کوئی تمیز نہیں کرتا اور احمدیوں کے لیے اس امتیاز کا مطالبہ دراصل آئین میں دی گئی عدم امتیاز کی ضمانت کو رد کرنا ہے۔

الجھاؤ کا اس سے بھی بڑھ کر اظہار علماء کے اس عمومی فتوے میں ہوتا ہے جس کی رو سے احمدیوں کے سماجی اور معاشی مقاطعہ کو مسلمانوں کی دینی ذمہ داری قرار دیا جاتا اور کسی بھی سطح پر احمدیوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کو عقیدہ ختم نبوت پر ایمان کے منافی گردانا جاتا ہے۔ اس ضمن میں جو شرعی و فقہی استدلال پیش کیا جاتا ہے، وہ تمام تر شہریت کے اسی فقہی تصور پر مبنی ہے جس میں ان معاملات کو عقیدہ اور مذہب کی روشنی میں طے کیا جاتا ہے۔ یہاں ہمارے پیش نظر اس نوعیت کا ایک مفصل فتویٰ ہے جو مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی مرحوم کے قلم سے ہے اور ''فتاویٰ بینات'' کی پہلی جلد میں شامل ہے۔ مولانا نے اس فتوے میں احمدیوں کے مقاطعہ کے تفصیلی و شرعی دلائل پیش کرنے کے بعد جو نتائج اخذ کیے ہیں، ان میں سے چند اہم نتائج یہ ہیں:

- کفار محاربین سے دوستانہ تعلقات ناجائز اور حرام ہیں۔ جو شخص ان سے ایسے روابط رکھے، وہ گمراہ، ظالم اور مستحق عذاب الیم ہے۔
- جو کافر مسلمانوں کے دین کا مذاق اڑاتے ہوں، ان کے ساتھ معاشرتی تعلقات، نشست و برخاست وغیرہ بھی حرام ہے۔
- جو کافر مسلمانوں سے برسرپیکار ہوں، ان کے محلے میں ان کے ساتھ رہنا بھی ناجائز ہے۔
- مرتد کو سخت سے سخت سزا دینا ضروری ہے۔ اس کی کوئی انسانی حرمت نہیں، یہاں تک کہ اگر

پیاس سے جاں بلب ہو کر تڑپ رہا ہو، تب بھی اسے پانی نہ پلایا جائے۔

- اقتصادی اور معاشرتی مقاطعہ کے علاوہ مرتدین، موذیوں اور مفسدوں کو یہ سزائیں بھی دی جا سکتی ہیں: قتل کرنا، شہر بدر کرنا، ان کے گھروں کو ویران کرنا، ان پر ہجوم (یعنی حملہ) کرنا وغیرہ۔
- اگر محارب کافروں اور مفسدوں کے خلاف کاروائی کرتے ہوئے ان کی عورتیں اور بچے بھی تبعاً اس کی زد میں آ جائیں تو اس کی پروا نہیں کی جائے گی، ہاں اصالتاً عورتوں اور بچوں پر ہاتھ اٹھانا جائز نہیں۔
- ان لوگوں کے خلاف مذکورہ بالا اقدامات کرنا دراصل اسلامی حکومت کا فرض ہے، لیکن اگر حکومت اس میں کوتاہی کرے تو خود مسلمان بھی ایسے اقدامات کر سکتے ہیں جو ان کے دائرہ اختیار کے اندر ہوں اور ظاہر ہے کہ عوام کے اختیار میں مکمل مقاطعہ ہی ایک ایسا اقدام ہے جو موثر بھی ہے اور پر امن بھی۔ (ص ۲۳۹، ۲۴۰)

استدلال کے دروبست سے واضح ہے کہ صاحب فتویٰ احمدیوں کی قانونی حیثیت محارب کے فقہی تصور کے تحت متعین کر رہے ہیں۔ اس سوال سے قطع نظر کر لیا جائے کہ فقہی لحاظ سے یہاں محارب کی تعریف صادق آتی ہے یا نہیں، لیکن یہ سامنے کی بات ہے کہ جمہوری ریاست کے تناظر میں یہ بحث نہ صرف بالکل غیر متعلق ہے، بلکہ کسی گروہ کے مقاطعہ کی عمومی دعوت دینا اور اس کی مہم چلانا ریاست کی دی ہوئی اس ضمانت کی نفی ہے کہ کسی شہری کے ساتھ اس کے عقیدے کی وجہ سے امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا۔ ریاست نہ صرف خود اس اصول کی پابند ہے، بلکہ اس کی بھی ذمہ دار ہے کہ کسی گروہ کو کسی دوسرے گروہ کے خلاف نفرت کا ایسا ماحول پیدا کرنے کی اجازت نہ دے جس سے اس کے مسلمہ شہری یا سیاسی حقوق متاثر ہوتے ہیں۔

اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ اس معاملے میں اصل الجھاؤ کہاں ہے اور اس کا فکری منبع کیا ہے۔ مذہبی علماء اصولاً اس مسئلے کو روایتی فقہی احکام کے تناظر میں دیکھ رہے ہیں اور اقبال کے تجویز کردہ حل کو اس کی پوری قانونی بنیاد اور تمام مضمرات کے ساتھ نہیں، بلکہ صرف ظاہری نتیجے کے لحاظ سے

قبول کرتے ہیں۔ اسی سے ایک طرف علماء کے مطالبات اور فتووں اور دوسری طرف آئین کی دی گئی ضمانتوں کے درمیان وہ تمام تضادات پیدا ہوتے ہیں جن کا سابقہ سطور میں ذکر کیا گیا۔ احمدیوں کو مظلوم اور مذہبی امتیاز کا شکار قرار دینے اور اس بنیاد پر ان کے ساتھ ہمدردی رکھنے والے بین الاقوامی اور قومی حلقوں کے سامنے بنیادی طور پر معاملے کا یہ پہلو ہوتا ہے اور احمدی حضرات بھی جب اپنا مقدمہ پیش کرتے ہیں تو انھی پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہوئے خود کو غیر مسلم قرار دیے جانے کے فیصلے کو اس کے ساتھ نتھی کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جدید دنیا میں ریاست اور شہریت کے معروف اور مسلم تصورات کی رو سے ان کے موقف میں وزن محسوس کیا جاتا ہے، جبکہ مذہبی علماء اس پہلو کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے اپنے تئیں یہ تصور قائم کر لیتے ہیں کہ امت مسلمہ کو اس کے اجماعی عقیدے سے ہٹانے کے لیے ناروا دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ یہ یقیناً معاملے کا ایک پہلو ہو سکتا ہے، لیکن اسے صرف اسی ایک پہلو سے دیکھنا ہمارے خیال میں معاملے کی پیچیدگی سے نظریں چرانے کے ہم معنی ہوگا۔

یہ بات کہ اس معاملے میں مذہبی حلقوں میں ذہنی اور فکری سطح پر ایک الجھاؤ موجود ہے، اس کا احساس بعض ذمہ دار علماء کو بھی ہے۔ چنانچہ والد گرامی مولانا زاہد الراشدی لکھتے ہیں:

”کچھ عرصہ سے ہمارے ہاں یہ روایت سی بن گئی ہے کہ ہم کسی اجتماعی مسئلے پر دینی اور شرعی حوالے سے ایک قدم اٹھا لیتے ہیں، فیصلہ کر لیتے ہیں، لیکن اس پر آزادانہ علمی بحث نہ ہونے کی وجہ سے اس فیصلے کی علمی توجیہ سامنے نہیں آتی اور دلائل کا پہلو اوجھل رہتا ہے جس سے کنفیوژن پیدا ہوتی ہے اور فیصلہ ہو جانے اور اس پر عمل درآمد ہو جانے کے باوجود علمی دنیا میں وہ فیصلہ بدستور معلق رہتا ہے۔۔۔۔ قادیانیوں کے بارے میں ہم نے اجتماعی طور پر فقہی احکام کو نظر انداز کرتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ انھیں غیر مسلم اقلیت کے طور پر ملک میں رہنے کا حق دیا جائے گا اور ان کے جان و مال کے تحفظ کی حکومت ذمہ دار ہوگی۔ یہ فیصلہ جو تمام مکاتب فکر کے علمائے کرام نے متفقہ طور پر کیا ہے اور ملک میں نافذ العمل ہے، ہمارے روایتی فقہی موقف سے ہٹ کر ہے۔ میں اس فیصلے کی مخالفت نہیں کر رہا، بلکہ اس کے حق میں ہوں اور اس کو قانونی اور دستوری درجہ دلوانے کے لیے عملی جدوجہد کرنے والوں میں شامل ہوں، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کی علمی توجیہ کیا ہے اور ایسا کرنا

شرعی طور پر کیا حیثیت رکھتا ہے؟ ہمارے خیال میں اس پر علمی مباحثہ ضروری ہے اور نہ صرف علما و طلبہ بلکہ جدید تعلیم یافتہ طبقات کے سامنے بھی اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ تبدیلی کیوں آئی ہے اور اس کا شرعی جواز کیا ہے؟‘‘ (کلمہ حق، ماہنامہ الشریعہ، مئی، جون ۲۰۰۹)

غالباً اسی تناظر میں کچھ عرصہ قبل اسلامی نظریاتی کونسل میں بھی یہ نکتہ زیر بحث آیا تھا کہ احمدیوں کی شرعی حیثیت کے مسئلے پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت ہے، تاہم اس پر کونسل کے ارکان میں ایک تنازع پیدا ہو گیا اور غالباً یہ سوال سنجیدگی کے ساتھ زیر بحث نہیں لایا جا سکا۔ بہر حال یہ بات باعث اطمینان ہے کہ مذہبی مطالبات میں پائے جانے والے الجھاؤ اور عملی مضمرات کا اب فکری سطح پر ادراک کیا جا رہا ہے اور دینی سیاسی موضوعات پر لکھنے والے کئی راسخ العقیدہ اہل دانش کی تحریروں میں اس پر نظر ثانی کی ضرورت کو اجاگر کیا جانے لگا ہے۔ چنانچہ حالیہ بحث کے دوران میں ملک کے معروف صحافی اور دانش ور جناب عامر ہاشم خاکوانی نے اس موضوع پر سوشل میڈیا میں اپنا نقطہ نظر پیش کیا جسے، بعض پہلوؤں سے اختلاف کی گنجائش کے باوجود، بحیثیت مجموعی ایک متوازن اور معتدل موقف کہا جا سکتا ہے۔ عامر ہاشم خاکوانی لکھتے ہیں:

’’تین چار باتیں الگ الگ ہیں۔ پہلا یہ کہ قادیانی غیر مسلم ہیں چونکہ وہ ختم نبوت پر یقین نہیں رکھتے۔ یہ ایسا بنیادی نکتہ ہے جسے نہ ماننے والا دائرہ اسلام میں رہ ہی نہیں سکتا۔ اس لئے قادیانیوں کے غیر مسلم ہونے کے حوالے سے کسی دوسری رائے کی گنجائش ہی نہیں۔ دوسرا یہ کہ پاکستانی آئین کے تحت قادیانی غیر مسلم قرار بھی پا چکے ہیں۔ یہ بھی واضح امر ہے، اس میں کوئی ابہام نہیں۔ یہ طے شدہ امر ہے، اسے قطعی طور پر ری اوپن نہیں کرنا چاہیے۔ ہم قادیانیوں کے غیر مسلم ہونے کی آئینی ترمیم میں ایک نقطے کی تبدیلی کے بھی حق میں نہیں۔ قانون توہین رسالت بھی اپنے اصول میں ایسی ہی حتمیت کا حامل ہے۔ اس کے پروسیجر میں کوئی تبدیلی صرف علمائے دین کی مشاورت سے ہو سکتی ہے، اس کا بہترین فورم اسلامی نظریاتی کونسل ہے۔ اکابر علما کے مشورے اور منظوری سے کوئی قدم اٹھانا چاہیے۔ تیسرا معاملہ قادیانی کے ساتھ تعلق کا ہے۔ یہ ہر ایک کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے، کوئی داعیانہ تعلق بنانا چاہتا ہے اور بطور غیر مسلم ان تک دعوت پہنچانا چاہتا ہے، ان کے فکری مغالطے اور

گمراہی کو دور کرنا چاہتا ہے تو اسے اس کا حق حاصل ہے، اسے کسی مولوی سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں (اللہ اور اس کا رسول اس کی نیت جانتا ہے، اسے اجر اپنی نیت اور عمل پر ملے گا، کسی مولوی صاحب کے سرٹیفکیٹ کی بناپر نہیں)۔ کوئی فاصلہ رکھنا چاہتا ہے تو رکھے، یہ اس کا ذاتی معاملہ ہے، مگر اسے اپنی رائے کو دوسروں پر تھوپنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ چوتھا معاملہ ہے قادیانیوں کے بطور غیر مسلم سرکاری ملازمتوں کا۔ آئینی طور پر وہ پاکستانی ہیں، دوسرے پاکستانیوں کی طرح ان کا مساوی حق ہے۔ دنیا کے کسی بھی ملک میں ایسا ممکن نہیں کہ کسی مذہب، نسل کی بنیاد پر کسی کو باقاعدہ قانون بنا کر روکا جائے۔ ایسا کرنا خطرناک بھی ہے کہ جنوبی افریقہ کی نسل پرست حکومت کی طرح اس کا بائیکاٹ ہو جائے گا، سماجی مقاطعہ۔ سرکاری اداروں میں ملازمتیں قادیانی بھی لے سکیں گے دوسروں کی طرح۔ ہاں جو اہم یا حساس محکمے ہیں، جہاں کسی قسم کا خطرہ ریاست کو محسوس ہو گا تو وہاں پر غیر تحریری، غیر رسمی طور پر ایسا کیا جاتا ہے۔

امریکی قانون کے تحت کسی مسلمان کو امریکی صدر بننے سے نہیں روکا جا سکتا یا سی آئی کا چیف بننے یا جج یا کسی اور اہم حساس محکمے میں ٹاپ پوزیشن لینے سے نہیں روکا جا سکتا۔ وہاں صرف یہ پابندی ہے کہ پیدائشی امریکی ہو۔ مسلمان بھی بن سکتا ہے اگر وہ پیدائشی امریکی ہو تو۔ لیکن کبھی کوئی مسلمان امریکی صدر بنے گا نہ سی آئی کا چیف یا کسی اور اہم حساس امریکی محکمے کی ٹاپ پوزیشن میں آسکے گا۔ ایسا مگر غیر تحریری، غیر رسمی طور پر سلیقے سے کیا جاتا ہے۔ کوئی احمق امریکی ہی مطالبہ کرے گا کہ نہیں، مسلمان کے لئے باقاعدہ قانونی پابندی لگائی جائے۔ اس کی اس بات پر اس کا مذاق اڑایا جائے گا، کیونکہ ایسا ہوتا نہیں۔ یہ صرف پاکستان ہے جہاں ایسے غبی العقل لوگ موجود ہیں جو ایسے معاملات کی پیچیدگی اور حساسیت کو نہیں سمجھتے۔ جہاں جہاں روکا جانا مقصود ہے، بے فکر رہیں، وہاں ایسا ہو رہا ہے۔ ایسا ہونے دیں، احمقانہ مطالبات اور تقریروں سے مسائل پیدا نہ کریں۔

نوٹ: یہ بھی یاد رکھیں کہ جس طرح ہر یہودی صہیونی نہیں، ہر ہندو بی جے پی والا نہیں، اسی طرح ضروری نہیں کہ ہر قادیانی پاکستان یا اسلام کے خلاف دن رات سازشیں کرنے میں لگا ہو۔ عالمی قادیانیت تحریک کے حوالے سے مجھے بھی تحفظات ہیں۔ کچھ لوگ ہو سکتے ہیں جنہیں پاکستان

کھٹکتا ہو، مگر عام آدمی ہر جگہ ایک جیسے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بہت سے چونکہ کسی خاص مذہب کے گھر میں پیدا ہو گئے، اس لیے وہ مذہب اختیار کر لیا۔ دعوت کا کام اچھے طریقے سے ہو تو ان شاء اللہ ایک بڑی تعداد حق کی طرف لوٹ سکتی ہے۔ یہ گنجائش باقی رکھنی چاہیے۔‘‘

امید کرنی چاہیے کہ اہل فکر کی توجہ کے نتیجے میں اس طرح کے موضوعات پر عمومی بحث و مباحثہ کی راہ کھلے گی اور اس نوعیت کے حساس مسائل پر اجتماعی دانش کو بروئے کار لاتے ہوئے ہم بہتر مستقبل کی طرف پیش رفت کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

پاکستان میں جبری تبدیلیِ مذہب کا مسئلہ

ضیاء الرحمان

پاکستان میں جبری تبدیلیِ مذہب کا مسئلہ کافی سنجیدہ ہے۔ اس بابت اندرون سندھ کے علاقوں سے وقفے وقفے سے خبریں موصول ہوتی رہتی ہیں اور میڈیا کی زینت بنتی ہیں۔ اس قضیے میں بین الاقوامی تنظیمیں اور مغربی ممالک بھی کئی بار پاکستان پر دباؤ ڈال چکے ہیں۔ لیکن اس مسئلے کی حقیقت کیا ہے، کیا ایسے واقعات ہوتے ہیں، ان کی شرح کیا ہے اور قانونی طور پہ اس پہ کیا کاروائیاں ہوتی ہیں۔ یہ تمام پہلو شفاف نہیں ہیں۔ دو مختلف آراء ہیں جن میں ایک یہی ہے جو مشہور ہے، جبکہ بعض تحقیقاتی اداروں اور ماہرین کی رائے ہے کہ مسئلہ کی نوعیت ویسی نہیں ہے جس طرح میڈیا میں پیش کیا جاتا ہے۔اس مضمون میں مسئلے کے دونوں پہلو اور معتدل موقف کو پیش کیا گیا ہے۔ مضمون نگار 'انٹرنیشل ریسرچ کونسل برائے مذہبی امور' کے شعبہ تحقیق کے ساتھ وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ صحافت کے شعبے سے بھی منسلک ہیں۔ کئی بین الاقوامی میڈیا ہاؤسز کے ساتھ تحقیق و رپورٹنگ کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں۔

پاکستان کے اندر آئے روز جبری تبدیلی مذہب کا مسئلہ زیر بحث رہتا ہے۔ بالخصوص سندھ کے حوالے سے کئی طرح کی آراء سامنے آتی ہیں جن میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ لوگ ہندو لڑکیوں کو زبردستی مسلمان کرتے اور ان سے نکاح کر لیتے ہیں۔ تاہم اس کے ساتھ ہی یہ رائے بھی موجود ہے کہ یہ معاملہ اس طرح نہیں ہے، بلکہ یہ شاذ ونادر جبری طور پہ ہوتا ہے، بہت سی خواتین خود ہی اسلام قبول کرتی ہیں۔

ملک میں جبری تبدیلی مذہب کے مسئلہ کے پیش نظر حال ہی میں ایک بل بھی پیش کیا گیا تھا جس میں مطالبہ کیا گیا کہ اٹھارہ سال سے کم عمر کی لڑکی کا اسلام قبول کرنا معتبر نہیں سمجھا جائے گا۔ لیکن اس بل کو اسلامی نظریاتی کونسل نے بھی رد کیا تھا اور یہ پاس نہیں ہو سکا تھا۔ اس بل کے مسودے میں یہ تجویز کیا گیا تھا کہ جو شخص اپنا مذہب تبدیل کرنا چاہتا ہے اس کی کم از کم عمر کی حد 18

سال ہونی چاہیے اور یہ کہ اس شخص کو سیشن کورٹ کے جج کے سامنے یہ بیان دینا ہوگا کہ وہ کسی زور زبردستی کے بغیر اپنی خوشی سے مذہب تبدیل کر رہا ہے یا کر رہی ہے۔ بل میں یہ بھی تجویز کیا گیا تھا کہ مذہب تبدیل کرنے والے شخص کو تقابل ادیان کا مطالعہ کرنے کا وقت دیا جائے۔ مذہبی جماعتوں نے اس بل کی شروع سے ہی مخالفت کی ہے اور وہ اس کو غیر اسلامی قرار دیتی ہیں۔

اسلامی نظریاتی کونسل نے مذہب کی جبری تبدیلی کے متعلق وزارتِ انسانی حقوق کے بل میں شریعت سے متصادم شقوں کی نشاندہی کرتے ہوئے عمر کی حد اور مذہب تبدیل کرنے کے طریقۂ کار پر اعتراضات اٹھائے تھے۔ مسودے میں کہا گیا کہ 18 سال سے کم عمر شخص اسلام میں داخل نہیں ہو سکتا اور بالغ شخص بھی مخصوص طریقۂ کار کا پابند ہوگا۔ دوسرے مذہب میں داخلے کیلئے عدالتی سرٹیفکیٹ، مذہبی کتب پڑھنا اور علماء سے نشست لازمی قرار دے دی گئی۔ مذہب کی تبدیلی کیلئے دی گئی درخواست موصول ہونے کے بعد ایڈیشنل سیشن جج 7 روز کے اندر انٹرویو کی تاریخ مقرر کرے گا۔ وہ شخص عدالت میں پیش ہوگا اور اس بات کو یقینی بنایا جائے گا کہ مذہب کی تبدیلی کسی دباؤ، دھوکہ دہی یا غلط بیانی کے باعث نہیں۔ بعد ازاں 90 روز بعد مذہب تبدیل ہونے کا سرٹیفکیٹ جاری ہوگا۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے کہا کہ اسلام قبول کرتے ہی شرعی احکامات نافذ ہوتے ہیں، 90 روز یا کم کی تاخیر مناسب نہیں۔ ریاست سمجھتی ہے کہ مذہب کی جبری تبدیلی پہلے ہی خلافِ قانون ہے۔

حکومت کا موقف

پاکستان میں حکومت جبری تبدیلیِ مذہب کی خبروں کو مسترد کرتی رہی ہے۔ اس کا موقف ہے کہ یہ مسئلہ ویسا نہیں جیسے بیان کیا جاتا ہے۔ دفتر خارجہ کے ترجمان زاہد حفیظ چودھری نے جنوری 2021ء میں امریکی رپورٹ پر ردعمل دیتے ہوئے کہا تھا کہ پاکستان میں جبری تبدیلی کا کوئی ادارہ جاتی وجود نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ زیادہ تر رپورٹ شدہ الزامات کی جب تحقیقات کی گئیں تو انکشاف ہوا کہ وہ یا تو فکشن اور سیاسی بنیادوں پر عالمی برادری میں پھیلائے گئے یا بین الاقوامی برادری میں پاکستان کو بدنام کرنے کے لیے بدنیتی پر مبنی تھے۔ اس سلسلے میں ترجمان دفتر خارجہ نے برسلز کی ای یو ڈس انفو

لیب کی تحقیقات کی مثال دی جس میں یہ بات سامنے آئی تھی کہ بھارتی پروپیگنڈا نیٹ ورک دہلی کے ساتھ ناخوشگوار تعلقات رکھنے والی اقوام بالخصوص پاکستان کو بدنام کرنے میں ملوث ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ بعض افراد اور غیر ریاستی عناصر کی جانب سے جبری تبدیلی کے کچھ واقعات ہوئے ہیں لیکن اس میں کسی بھی ریاستی ادارے کی شمولیت کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ دفتر خارجہ کا بیان امریکی خبر رساں ادارے کی اس رپورٹ کے ایک روز بعد سامنے آیا تھا جس میں دعوی کیا گیا تھا کہ پاکستان میں ہر سال مذہبی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والی ایک ہزار لڑکیوں کو جبری طور پر مسلمان کیا جاتا ہے۔ ترجمان کا کہنا تھا کہ جب بھی اور جہاں بھی اس طرح کے واقعات کی اطلاع ملی تمام ریاستی اداروں نے ذمہ داروں کے خلاف فوری کارروائی کی ہے جبکہ کچھ واقعات میں ریاست فوری اور مؤثر انصاف کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے عدالت میں مجرموں کے خلاف مقدمہ میں فریق بھی بنی۔

مختلف آراء

پاکستان میں تقریباً اکثریتی این جی اوز اور انسانی حقوق کی تنظیموں کا کہنا ہے کہ ملک میں جبری تبدیلی مذہب کا مسئلہ حقیقی اور سنجیدہ مسئلہ ہے۔ جبکہ بعض حلقوں کا کہنا ہے مسئلہ اس سطح کا نہیں ہے۔

معروف تھنک ٹینک انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی سٹڈیز (آئی پی ایس) نے اپنی ایک رپورٹ میں اس طرح کی خبروں کو مسترد کیا اور کہا کہ پاکستان میں جبری مذہب کی تبدیلی کی رپورٹس بے بنیاد ہیں اور ان میں کوئی صداقت نہیں ہے، رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پاکستانی ریاست اور معاشرہ مختلف حوالوں سے عالمی و مقامی تنظیموں اور مغربی حکومتوں کی تنقید کے دہانے پر رہتا ہے۔ مروجہ انسانی حقوق کے درجنوں پہلو ایسے ہیں، پاکستان میں جن کی خلاف ورزی کی کہانیاں زبان زدِ عام ہیں۔ ایسا ہی ایک معاملہ مذہبی اقلیتوں سے تعلق رکھنے والی خواتین اور نوجوان لڑکیوں کی مذہب تبدیلی کا ہے جس کے بارے میں بالعموم یہ تاثر پایا جاتا ہے کہ ان لڑکیوں کو اغواء کر کے زبردستی اسلام قبول کروایا جاتا ہے اور پھر مسلمان مردوں سے ان کی شادی کر دی جاتی ہے۔ انسانی حقوق کی غیر سرکاری تنظیموں کے

اعداد و شمار ہندو، دلت اور عیسائی خواتین کو اس مہم کا خصوصی شکار گردانتے ہیں اور کثیر تعداد میں ہندو اور دلت آبادی کا مسکن ہونے کی بنا پر صوبہ سندھ اس معاملے میں شہ سرخیوں میں رہتا ہے۔

تاہم اس سارے قضیے کی حقیقت کیا ہے؟ کیا واقعی اس بڑی تعداد میں دیگر مذاہب کی خواتین اغوا کے بعد قبولِ اسلام پر مجبور کی جاتی ہیں؟ کیا ہندو اور عیسائی خواتین کو بالجبر مسلمان مردوں سے بیاہنے کے واقعات فی الحقیقت موجود ہیں؟

رپورٹ کے مطابق اس مہم کی تائید میں گردش کرتی تمام دستاویزات، ان میں بیان کردہ اعداد و شمار اور ان کے سارے دلائل کا انحصار چند اخباری خبروں اور مضامین پر ہے۔ یہ تنظیمیں اپنے موقف کو سہارا دینے کے لیے پہلے سے موجود چند رپورٹوں کا حوالہ دیتی ہیں۔ تاہم آئی پی ایس کی حالیہ رپورٹ بتاتی ہے کہ بطور حوالہ استعمال کی گئی رپورٹوں کا ذریعہ معلومات بھی غیر مصدقہ خبریں، سیاسی بیانات اور متضاد دعوے ہی ہیں۔ ان کی تیاری میں شاذ و نادر ہی مبینہ مغوی خاتون اور مسلمان مرد کا موقف لیا جاتا ہے۔ تمام تر بات لڑکیوں کے والدین کے اس الزام کو بنیاد بنا کر کی جاتی ہے کہ ان کی بیٹی کو اغوا کر کے اس کی مرضی کے خلاف مذہب تبدیل کروایا گیا اور مسلمان مرد سے ہونے والی شادی میں بھی اس کی رضامندی شامل نہیں تھی۔ یورپی حکومتیں، مغربی جامعات اور اقوام متحدہ جیسے ادارے بھی انہی رپورٹوں پر تکیہ کرتے ہیں۔

رپورٹ کے مطابق کچھ تنظیمیں دعویٰ کرتی ہیں کہ سالانہ ۱۰۰۰ خواتین جبری شادی اور مذہب تبدیلی کا شکار ہو جاتی ہیں، جبکہ اس کے برعکس ایک اور دعوے کے مطابق ایسی خواتین کی تعداد ماہانہ ۲۵ کے لگ بھگ ہے۔ اگرچہ جبری تبدیلیٔ مذہب کا کوئی ایک حقیقی واقعہ بھی قابلِ مذمت ہے اور متاثرہ فریق مکمل حق رکھتا ہے کہ اسے انصاف دلوایا جائے۔ لیکن بدقسمتی سے زمینی حقائق بالکل برعکس تحقیق کیے بغیر ہی دعوے کیے جاتے ہیں۔

رپورٹ کے مطابق پاکستان میں غیر مسلم خواتین کے قبولِ اسلام کے واقعات یقیناً وقوع پذیر ہو رہے ہیں تاہم اس میں جبر کا پہلو موجود نہیں ہے۔ اکثر لڑکیوں کے قبولِ اسلام کی پشت پر پسند

کی شادی کی خواہش کارفرما ہوتی ہے لیکن والدین اسے دوسرا رخ دیتے ہیں۔

انفرادی اور گروہی سطح پر کچھ لوگ اگر اسلام قبول کرتے ہیں تو اس میں کئی قسم کے معاشی اور معاشرتی محرکات کارفرما ہو سکتے ہیں تاہم یہ کہنا قرینِ قیاس نہیں ہے کہ یہ سب جبر کے زیرِاثر ہو رہا ہے۔ اسلام قبول کرنے کا ایک بڑا رجحان دلت برادری میں پایا جاتا ہے۔ یہ وہ طبقہ ہے جو چاہے لاکھ اپنی الگ شناخت کا مطالبہ کر لے، ہندو اشرافیہ اسے اپنا حصہ ہی شمار کرتی ہے۔

آئی پی ایس کی رپورٹ کے مطابق تبدیلیٔ مذہب کے معاملے پر سرحد پار سے خصوصی دلچسپی لی جا رہی ہے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی، راشٹریہ سوائم سیوک سنگھ اور دیگر شدت پسند ہندو تنظیمیں پاکستان میں مذہب تبدیلی کے حوالے سے انٹرنیٹ پر مواد تلاش کرنے اور اس کا پرچار کرنے میں کافی نمایاں ہیں۔ خود ہندوستان کی کئی ریاستوں میں تبدیلیٔ مذہب ہی کو غیر قانونی قرار دے کر اب پاکستان میں مذہب کی تبدیلی کو متنازعہ بنایا جا رہا ہے۔

متبادل درمیانی موقف

معروف دانشور کالم نگار خورشید ندیم اس حوالے مسائل کا تجزیہ یوں کرتے ہیں، اور یہ زیادہ قرین قیاس لگتا ہے کہ اس میں اعتدال نظر آتا ہے۔ ان کے کالم کا حصہ درج ذیل ہے:

مذہب کا انتخاب انسان کا بنیادی حق ہے۔ یہ حق انسان کو عالم کے پروردگار نے دیا ہے اور انسان ساز افکار نے بھی۔ یہ ان چند نکات میں سے ہے جن پر مذہبی اور غیر مذہبی طبقات کا اتفاق ہے۔ پھر یہ حالیہ نزاع کیوں ہے؟

مذہب کا انتخاب اگر انسان کا بنیادی حق ہے تو پھر کسی کو مذہب کی تبدیلی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا مذہب کی جبری تبدیلی مذہب کی نظر میں جرم ہے اور قانون کی نظر میں بھی۔ پاکستان میں اقلیتوں کے بعض حلقوں میں یہ شکایت پیدا ہوئی کہ ان کی کم سن بچیوں کو مذہب کی تبدیلی پر مجبور کیا جاتا ہے اور اکثریت کے سماجی جبر کی وجہ سے وہ اس کے خلاف آواز نہیں اٹھا سکتے۔ اس کے ساتھ ان

بچیوں کی مسلمان لڑکوں سے شادی بھی کرادی جاتی ہے جس سے ان کی واپسی کا راستہ بھی بند ہو جاتا ہے۔ حکومت نے اس کو روکنے کے لیے ایک بل متعارف کرایا جس میں بعض دفعات ایسی ہیں جن پر ردِ عمل ہوا اور یوں ایک بحث چل نکلی۔

ہمارا آئین بنیادی حقوق کو مانتا ہے' اس میں مذہب کا انتخاب فرد کا بنیادی حق تسلیم کیا گیا ہے لہٰذا جبری مذہبی تبدیلی بدیہی طور پر جرم ہے۔ اس کے لیے شاید مزید کسی قانون سازی کی ضرورت نہ ہو۔ مذہبی آزادی کو برقرار رکھنا حکومت کی ذمہ داری ہے اور اس کا مطالبہ کیا جانا چاہیے۔ نفاذِ قانون کے لیے قائم ادارے متاثرین کی دادرسی کے پابند ہیں۔

اس بل سے صرفِ نظر کرتے ہوئے' میرا خیال ہے کہ چند سوالات پر سنجیدہ غور ہونا چاہیے۔ حکومت نے اس معاملے میں درست فیصلہ کیا کہ اسے اسلامی نظریاتی کونسل کے حوالے کر دیا۔ کونسل اس کا دینی پہلو سے جائزہ لے گی لیکن یہ مسئلہ دینی ہی نہیں' سماجی بھی ہے۔ اس لیے ایک وسیع تر مشاورت کا متقاضی ہے۔ یہ سوالات اس بحث کی تفہیم میں معاون ہو سکتے ہیں۔

پہلا سوال یہ ہے کہ مذہب کی جبری تبدیلی محض الزام ہے یا اس میں کوئی سچائی بھی ہے؟ اس کا جواب اسلامی نظریاتی کونسل کے پاس نہیں ہے۔ سادہ جواب یہ ہے کہ وزارتِ انسانی حقوق اس پر الزام عائد کرنے والوں سے شواہد طلب کرے اور پھر ان کی مشاورت سے ایک کمیٹی بنائے جو ان علاقوں کا دورہ کرے اور اپنے طور پر الزام کا جائزہ لے۔ قانون سازی اس کے بعد کا مرحلہ ہے۔ میرے علم کی حد تک یہ مرحلہ ابھی طے نہیں ہوا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ پاکستان میں کیا سب کو تبلیغ کا حق حاصل ہے؟ اگر ہے تو اس کی حدود کیا ہیں؟ یہ تو میں جانتا ہوں کہ مسلمانوں کے اندر بڑی تبلیغی جماعتیں موجود ہیں۔ پاکستان میں یہ جماعتیں زیادہ تر مسلمانوں ہی میں تبلیغ کرتی ہیں۔ اس کی نوعیت تذکیر کی ہے۔ اس کا تعلق تبدیلئ مذہب سے نہیں ہے۔ معروف تبلیغی جماعت قیامِ پاکستان سے پہلے برصغیر میں موجود تھی اور متحرک تھی۔ میرے علم میں نہیں ہے کہ اس جماعت سے غیر مسلموں کو کبھی کوئی شکایت پیدا ہوئی ہو۔ یہ

مسئلہ حال ہی میں اٹھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اقلیتوں کو کس گروہ سے شکایت ہے اور کیوں ہے؟

پھر یہ کہ کیا تبلیغ کا حق یک طرفہ ہے؟ کیا غیر مسلموں کو پاکستان میں اپنے مذہب کی تبلیغ کی اجازت ہے؟ یہ سوال اسلامی نظریاتی کونسل اور علما سے متعلق ہے۔ پاکستان میں اگر سب شہریوں کے حقوق برابر ہیں، تو کیا برابری کے اس اصول کا اطلاق تبلیغ کے معاملے میں بھی ہوتا ہے؟ مثال کے طور پر یورپ اور امریکہ وغیرہ میں سب کو تبلیغ کی اجازت ہے۔ مسلمانوں کی تبلیغی جماعتیں عشروں سے ان ممالک میں متحرک ہیں اور انہیں کسی نے کبھی روکا نہیں۔

امریکہ کے ایک سفر میں میرا سالٹ لیک سٹی جانا ہوا۔ میں جمعہ کے دن وہاں کی ایک بڑی مسجد میں نمازِ جمعہ کے لیے گیا۔ میں نے دیکھا کہ ایک جگہ ایک الماری میں قرآن مجید کے بہت سے نسخوں کے ساتھ 'فضائلِ اعمال' بھی رکھی تھی۔ یہ تبلیغی جماعت کا نصاب ہے۔ ساتھ ہی ایک رجسٹر پڑا تھا جس پر ان لوگوں کے نام درج تھے جنہوں نے ہفتے کے مختلف دنوں میں گشت کے لیے اپنا نام لکھوایا تھا۔ کیا پاکستان میں بھی سب مذاہب کو یہ آزادی حاصل ہے؟ کیا دین میں اس کی کوئی ممانعت ہے؟ اس سوال کا جواب علما کے ذمہ ہے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ اگر کوئی اپنی مرضی سے مذہب تبدیل کرنا چاہے تو کیا اس پر عمر کی قید لگائی جاسکتی ہے جو مجوزہ قانون میں لگائی گئی ہے؟ کیا اس پر قرآن مجید یا رسالت مآب ﷺ کی کوئی واضح ہدایت موجود ہے؟ اگر نہیں تو کیا ریاست یہ حق رکھتی ہے کہ سدِ ذریعہ کے اصول پر اس پر پابندی لگا دے؟ یہاں پھر وہ مسئلہ اپنی جگہ موجود ہے کہ تبدیلی مذہب کوئی یک طرفہ عمل نہیں ہو سکتا۔ اگر قانون بنے گا تو کیا اس کا اطلاق یکساں طور پر ہو گا؟ اس مسئلے کو بھی اہلِ علم ہی حل کر سکتے ہیں۔

چوتھا سوال یہ ہے کہ اقلیت کے باب میں اکثریت کی ذمہ داری کیا ہے؟ کسی اقلیت کا مسلسل خوف میں مبتلا رہنا، کیا کسی اکثریت کے لیے باعثِ فخر بات ہے؟ یہ سوال عوام سے ہے۔ یہ سوال ہمیں اپنے آپ سے کرنا ہے۔ ایسے سوالات کے بارے میں اقبال کی نصیحت یہ ہے کہ:

'اپنے دل سے پوچھ، مُلا سے نہ پوچھ'

اس کے لیے ہمیں اپنا جائزہ لینا ہے۔ایک غیر مسلم، مسلمان کے سامنے اپنے خیالات کے اظہار میں خود کو کتنا آزاد سمجھتا ہے؟وہ مسلمانوں سے خوف کھاتا ہے یا انہیں اپنی جان و مال اور عزت و آبرو کا محافظ سمجھتا ہے؟مذہب کی جبری تبدیلی کا گہرا تعلق اس سوال کے ساتھ ہے۔

ہمیں ان سوالات پر غور کرنا ہے۔ہر مسئلہ اس لیے نہیں ہوتا کہ اس کا فیصلہ کسی میدانِ کارزار ہی میں کیا جائے۔اگر اختلاف کسی داخلی معاملے میں ہے تو اس کا حل مکالمہ ہے۔ہمیں بات کر نی چاہیے۔ہمیں اکثریت اقلیت کی تقسیم سے بلند ہو کر، ہر مسئلے کو اپنا مسئلہ سمجھنا چاہیے۔پاکستان ایک ملک ہے جسے پُرامن رکھنا ہم سب کی ذمہ داری ہے۔اگر ہم تین فیصد آبادی کو خوف کی فضا سے نہ نکال سکیں تو ہمیں سوچنا چاہیے کہ یہ بات ہمارے لیے باعثِ عزت ہے یا باعثِ ندامت؟

ریاست کا جدید تصور اکثریت اقلیت کی بحث سے ماورا ہے۔ہم ابھی تک اس کا شکار ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے جدید ریاست کو نہیں سمجھا۔ہم ابھی تک اسے قدیم فقہ کی نظر سے دیکھتے ہیں جو فاتح اور مفتوح کی نفسیات کے زیرِاثر مرتب ہوئی اور جس میں شہریت کا جدید تصور موجود نہیں تھا۔مجھے پورا یقین ہے کہ وہی فقہا اگر جدید ریاست کو سامنے رکھ کر فقہ مرتب کرتے تو ان کے نتائجِ فکر بالکل مختلف ہوتے۔یہ کام آج کے علما کا ہے کہ وہ پہلے جدید ریاست کے تصور کو جانیں اور پھر اس کو سامنے رکھ کر دین کے باب میں راہنمائی کریں۔

اسلامی نظریاتی کونسل ایک اجتہادی ادارہ ہے۔اس سے بجا طور پر یہ توقع رکھی جاتی ہے کہ وہ جدید معاملات میں قوم کی راہنمائی کرے گا۔فقہ کی قدیم کتب سے اقوال نقل کر دینا اجتہاد نہیں ہو تا۔یہ کام علمِ فقہ کا کوئی مبتدی بھی کر سکتا ہے۔جدید قومی ریاست میں تبدیلی مذہب ایک اہم مسئلہ ہے۔اس پر ریاست کو راہنمائی کی ضرورت ہے اور عوام کو بھی۔

قانونِ توہینِ مذہب: بین الاقوامی معیارات، تحفظات اور مسائل

ضیاءالرحمان

پاکستان میں جب بھی مذہبی آزادیوں کے حوالے سے بات کی جاتی ہے تو اس ضمن میں ’قانونِ توہینِ رسالت‘ یا قانونِ توہینِ مذہب پر کئی طرح کے خدشات و تحفظات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ معتدل ماہرین و علماء کی رائے تو یہ ہے کہ اس مسئلے میں درمیانی راستہ نکالنے کی ضرورت ہے، یعنی کہ اس قانون کے غلط استعمال کو روکنے کے لیے ریاست کو انتظامی و پالیسی سطح پر ٹھوس طریق کار مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ تاہم یہ قانون چونکہ متنازعہ ہے، اس پر ملک کے اندر اور بیرون ملک سخت مباحث ہوتی ہیں اور اس پر تنقید بھی کی جاتی ہے۔ اس لیے اس موضوع کی مختلف جہات اور نکتہ ہائے نظر کو پیش کرنا اہمیت کا حامل ہوگا۔زیرنظر مضمون میں قانون توہین مذہب کے بین الاقوامی معیارات اور پیش آمدہ مسائل کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔یہ مضمون جمہوریت اورانسانی حقوق کے عالمی ادارے’فریڈم ہاؤس‘ کی رپورٹس سے تیار کیا گیا ہے۔

قانونِ توہین مذہب کا تصور اور مغرب کے تاثرات

مذہبی توہین کو مجرمانہ قرار دینے والے قوانین بہت سے ملکوں میں کئی دہائیوں سے کتابوں میں موجود ہیں، اور کچھ معاملات میں تو یہ صدیوں سے موجود ہیں۔ حالیہ سالوں میں ان کی مؤثّریت اور انکی ضرورت کے بارے میں ناقدین کے لگاتار سوال اٹھائے ہیں، لیکن ریاستی ارباب اقتدار کے ذریعہ انکی حمایت کی گئی ہے جو یہ دعوی کرتے ہیں کہ مختلف مذہبی گروپوں کے بیچ سماجی ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کے لئے یہ قوانین ضروری ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر مذہبی توہین—یا "مذہب کو بدنام کرنے -"کو روکنے کی کوششوں کے طور پر اقوام متّحدہ میں بھی اسی دلیل کا استعمال کیا گیا ہے۔ اس پروجیکٹ کے حامی اسے انسانی حقوق کے بنیادی ڈھانچہ کی ایک توسیع قرار دیتے ہیں، انکا کہنا ہے کہ توہین آمیز اظہار بیان مبنی بر امتیاز ہے اور اس سے ان گروپوں کی مذہبی آزادی منفی طور پر متاثّر ہوتی ہے جنکے جذبات اس سے مجروح ہوتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق قانونِ توہینِ مذہب کا غلط

استعمال عموماً ان ممالک اور معاشروں میں زیادہ ہے جہاں انتظامی خلا ہیں اور جہاں طریق کار شفاف نہیں ہوتا۔ ایسے مقامات پر اس قانون کے استعمال میں تحفظات کا اظہار کیا جاتا ہے۔

اقوام متحدہ اور توہینِ مذہب

گزشتہ برس مارچ 2022ء میں اقوام متحدہ نے اسلاموفوبیا کے مقابلے کے لیے عالمی دن منانے کا اعلان کیا تھا۔ اقوام متّحدہ کے اندر آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس (OIC) کی ممبر ریاستیں، اور کچھ افریقی گروپ، جس میں مصر، الجیریا، اور پاکستان خاص ہیں — ایک طویل عرصے سے تحریک چلا رہے ہیں تا کہ مذہب کی توہین پر پابندی کو انسانی حقوق کے بین الاقوامی ڈھانچہ میں جگہ دی جا سکے۔ او آئی سی کی نمائندگی کرتے ہوئے، پاکستان نے 1999 میں انسانی حقوق کمیشن میں اس مسئلہ پر پہلی قرارداد پیش کی تھی۔ 2009 میں انسانی حقوق کونسل کے سامنے یہ قرارداد دوبارہ پیش کی گئی اور اس بار اس میں مذہب کی توہین کو بہت واضح طور پر ICCP (The International Covenant on Civil and Political Rights) کے آرٹیکل 20(2) کے تحت ریاستوں کی ّذمہ داری سے بہت واضح طور پر جوڑ دیا گیا، جس کے تحت، ریاستوں کی ّذمہ داری ہے کہ وہ "نفرت کی ترغیب" کو قانونی طور پر روکیں۔ یہ قدم ترغیب کے اوپر پہلے سے موجود بین الاقوامی معیاروں کو اور وسعت دینے کی ایک کوشش تھا۔ 2009 کی قرارداد میں مذہب کی توہین کا کم سے کم سات مرتبہ ذکر کیا گیا تھا اور اسے مذہبی منافرت کی ترغیب کی ایک شکل قرار دیا گیا تھا:

'اس پر زور دیا گیا کہ مذہب کی توہین انسانی وقار پر ایک شدید حملہ ہے جس سے اس مذہب کے ماننے والوں کی مذہب کی آزادی محدود ہوتی ہے اور اس سے مذہبی منافرت اور ّتشدد کی ترغیب پیدا ہوتی ہے۔'

'تمام حکومتوں پر بھرپور زور دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے اپنے قانونی اور آئینی نظاموں کے اندر رہتے ہوئے، مذہب کی توہین سے پیدا ہونے والی نفرت، امتیاز، دباؤ اور عمومی مذہبی منافرت سے مناسب تحفّظ فراہم کریں اور تمام مذاہب اور عقائد کی کے لئے احترام اور رواداری کو بڑھانے کے لئے ہر ممکن

اقدامات کریں۔'

مذاہب کی توہین پر اقوام متّحدہ نے ایک سالانہ قرار دار منظور کی تھی۔ یہ ان قراردادوں جیسی ہی ہے جنہیں انسانی حقوق کی کونسل نے مستعار لیا۔ حالیہ سالوں کے دوران ان دونوں دستاویزوں کے حق میں ان دونوں تنظیموں کے اندر حمایت اور رائے شماری میں لگاتار کمی آئی ہے،اور پچھلے سال اس قرارداد کے لئے ڈالے گئے ووٹ اور اس سے غیر حاضر رہنے والوں کی تعداد اس قرارداد کی حمایت کرنے والے لوگوں سے کہیں زیادہ تھی۔ کچھ تجزیہ نگاروں کے مطابق اسکی حمایت میں آنے والی کمی کا تعلق او آئی سے کے اس عزم سے ہے جس میں اس نے عوامی طور پر اس عزم کا اظہار کیا ہے کہ وہ ایک معاہدہ کی شکل میں یا اس معاہدہ کے ساتھ ایک اضافی پروٹوکول کی صورت میں ایک ایسا قانون لائے گی جو بین الاقوامی طور پر سب کے لئے لازمی ہوگا اور جس کے تحت مذہب کی توہین ممنوع ہوگی۔

حالانکہ بین الاقوامی قانون میں موت کی سزا پر پابندی نہیں لگائی گئی ہے، لیکن اقوام متّحدہ نے اسکے استعمال پر کچھ تحدیدات عائد کی ہیں۔ شہری اور سیاسی حقوق کے بین الاقوامی عہد (ICCPR) کی دفعہ 6(2) میں کہا گیا ہے: "کہ ایسے ممالک جہاں موت کی سزا کو ابھی تک ختم نہیں کیا گیا ہے، موت کی سزا کو صرف سب سے شدید جرائم کے لئے ہی لاگو کیا جاسکتا ہے اور وہ بھی اس قانون کے مطابق جو جرم کا ارتکاب کئے جاتے وقت لاگو ہوتے تھے اور جو ان موجودہ اعلامیے (Covenant) کے خلاف نہ ہوں اور نہ ہی نسل کشی کی روک تھام اور اسکے لئے سزا کے اوپر کئے گئے عہد(The Convention on the Prevention and Punishment of the Crime of Genocide) کے خلاف ہوں۔ یہ سزا اس وقت ہی عمل میں لائی جاسکتی ہے جب ایک بااختیار عدالت نے اسکے بارے میں حتمی فیصلہ صادر کر دیا ہو۔" اقوام متّحدہ کی انسانی حقوق کمیٹی نے "سب سے شدید جرائم" کی اکثر و پیشتر تعریف کی ہے اور اس کی تعریف کی رو سے یہ وہ جرائم ہیں جنکی وجہ سے زندگی کا ضیاع ہو۔ اس پینل کا عمومی تبصرہ نمبر 6 یہ بھی کہتا ہے کہ کمیٹی کا یہ ماننا ہے کہ 'سب سے شدید جرائم' کے الفاظ کی تعریف بھی کچھ قیود کے ساتھ اس طرح کی جائے کہ اسکی وجہ

سے موت کی سزا صرف ایک انتہائی استثنائی اقدام کے طور پر ہی دی جائے"۔

اقوام متّحدہ کی بہت سی دوسری رپورٹوں میں "سب سے زیادہ شدید جرائم" سے سمجھ میں آنے والی تحدیدات کی وضاحت کی گئی ہے۔ اقوام متّحدہ کی جنرل اسمبلی کے ساتھ ساتھ اکنامک اور سوشل کونسل نے ایسی حفاظتی تحدیدات استعمال کی ہیں جو موت کی سزا کا سامنا کرنے والے لوگوں کے حقوق کے تحفّظ کی ضمانت دیتی ہیں۔ اس کے پیرا گراف 1 میں کہا گیا ہے کہ "ایسے ممالک جہاں موت کی سزا کو ابھی تک ختم نہیں کیا گیا ہے وہاں موت کی سزا صرف انتہائی شدید جرائم کے لئے ہی دی جا سکتی ہے۔ یہ بات سمجھ لی جانی چاہئے کہ ان کا دائرہ ان جرائم سے آگے نہ بڑھایا جائے جو جان بوجھ کر کئے گئے ہوں اور جنکے مہلک یا دوسرے خطرناک نتائج بر آمد ہو سکتے ہوں"۔ [1]

انسانی حقوق کے بین الاقوامی اداروں کی رائے

مذہبی توہین کے سبھی قوانین میں کچھ ایسی داخلی خامیاں ہوتی ہیں جو خاص طور پر انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی وجہ بنتی ہیں۔ یہ قانون اس مسئلہ کو حل کرنے میں ناگزیر طور پر ناکام رہتے ہیں کہ مذہبی توہین واقعتاً کیا ہے، اور نتیجتاً اس سے پراسکیوٹروں، ججوں اور دوسرے الزام لگانے والوں کے ہاتھوں میں جو پہلے سے کسی نہ کسی سیاسی یا ذاتی مفادات یا ترجیحات سے متاثّر ہو سکتے ہیں، بے انتہا اختیار آجاتے ہیں۔ اپنے ذریعہ تجویز کی گئی سزاؤں میں بھی انکا اختلاف قابل ذکر ہوتا ہے، کیونکہ دوسرے جرائم کے برعکس، مذہبی توہین کے شکار یا اس سے پیدا شدہ نقصان واضح اور سمجھ میں آنے والا نہیں ہوتا۔ مذہبی توہین قانون کے احاطہ میں آنے والے اعمال کی ترجمانی کئی طرح سے کی جا سکتی ہے، وہ کسی انفرادی احساس کے خلاف نسبتاً ہلکا جرم بھی ہو سکتے ہیں، کسی پورے فرقے کے عقائد کے خلاف توہین بھی ہو سکتے ہیں، یا کسی مذہبی دیوتا پر انتہائی شدید حملہ بھی ہو سکتے ہیں۔ ان کمیوں کی وجہ سے مذہبی توہین کے قوانین کا استعمال اور انکا نفاذ، چن کر، من مانے طریقے سے اور امتیازی سلوک کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس سے ان ممالک کی موجودہ صورتحال اور بھی زیادہ خطرناک ہو جاتی ہے

[1] http://www2.ohchr.org/english/bodies/hrcouncil/7session/reports.htm;

جہاں کے جمہوری ادارے کمزور ہیں اور اس سے ان جمہوریتوں کے انسانی حقوق کے ریکارڈ پر برا اثر پڑتا ہے جہاں جمہوریت بصورت دیگر اچھی طرح سے کام کر رہی ہے۔

قریب قریب سبھی معاملات میں، مذہبی توہین کے قانون کی کوئی واضح اور ٹھیک تعریف نہیں دی گئی ہے، جسکی وجہ سے ان کو توڑ مروڑ نا اور من مانے طریقے سے انکولاگو کرنا بہت ہی آسان ہے۔ بین الاقوامی سطح پر اس بارے میں کوئی اتّفاق نہیں پایا جاتا کہ کس طرح کے کاموں کو مذہبی توہین یا مذہب کی تذلیل مانا جائے، اور بلکہ قومی اور ملکی سطح پر بھی یہ اصطلاحات بالکل غیر واضح ہیں۔ نتیجتاً مذہبی توہین کے قانون کا دائرہ عام طور پر انتہائی وسیع اور مہنگا ہو جاتا ہے، اور عملاً کسی بھی عمل پر مذہبی توہین کا الزام لگا کر اسکے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے۔ بہت سے دوسرے معاملات میں مذہبی توہین کے قانون کے الفاظ کچھ اس طرح رکھے گئے ہیں کہ انکے ذریعہ مذہب یا مذہبی شخصیات کی "توہین" یا "برائی" کو مجرمانہ عمل قرار دیا جائے۔ یہ انتہائی شخصی اصطلاحات ہیں، اور جو چیز ایک انسان کی لئے توہین ہوسکتی ہے ممکن ہے کہ دوسرا شخص اسکا بالکل بھی برا نہ مانے۔ اپنی سب سے زیادہ مہربان شکل میں بھی مذہبی توہین کے قانون کی وجہ سے ایسے واقعات پیدا ہوئے "جنہیں معمولی واقعات" قرار دیا گیا ہے جیسا کہ یونان میں دیکھا گیا، جہاں انفرادی اشخاص نے دوسروں کے خلاف روزمرہ کی زندگی میں کئے جانے والے تبصرے یا بیان کے اظہار کو ہی توہین آمیز سمجھ لیا۔ اس طرح کے اکثر واقعات کو یونان کی عدالتوں نے پہلی دفعہ میں ہی برخاست کر دیا ہے، لیکن ناکام قانونی کاروائی کی دھمکی بھی خود ساختہ پابندی کی حوصلہ افزائی کر سکتی ہے۔

اس سے بھی زیادہ تشویش کی بات وہ واقعات ہیں جن میں حکومت نے سیاسی مخالفین کو خاموش کرنے کے لئے مذہبی توہین کے قانون کا استعمال کیا ہے۔ مثال کے طور پر، مصر میں، اس وقت مبیّنہ طور پر بہت سے بلاگر تعزیری ضابطہ کی آرٹیکل 198 کے تحت مبّینہ مذہبی توہین کے الزام میں قید میں ہیں۔ انھوں نے حکومت کے اداروں اور شخصیات کے بارے میں بھی تنقید آمیز باتیں لکھیں اور ایسا مانا جاتا ہے کہ ان پر یہ الزامات سیاسی مقاصد سے لگائے گئے ہیں۔ اس قانون کے غلط استعمال کی ایک اور صورت میں، انفرادی اشخاص نے جائداد کے جھگڑوں اور دوسری ذاتی دشمنیوں

کے انتقام کے لئے بھی مذہبی توہین کی شکایات درج کی ہیں۔ جبکہ کچھ دوسرے معاملات میں، جیسا کہ پاکستان میں دیکھا گیا ہے، کچھ لوگوں نے مذہبی اقلیتی گروپوں کے افراد کو مذہبی طور پر دبانے کے لئے بھی اس طرح کے الزامات عائد کئے ہیں۔ کچھ ممالک کے قانون میں حسبہ کا اسلامی اصول شامل کیا گیا ہے، جسکے تحت کوئی بھی مسلمان دوسرے مسلمان کے خلاف شکایت لا سکتا ہے اگر اسے لگتا ہے کہ اس نے اسلامی قانون (شریعت) کی خلاف ورزی کی ہے۔ اس طرح کے واقعات کو روکنے یا انہیں محدود کرنے میں حکومت کی ناکامی سے آزادئ اظہار کے لئے شدید نتائج برآمد ہوئے ہیں۔

مذہبی توہین کے لئے دی جانے والی سزا سے بھی انسانی حقوق کے لئے اندیشے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سزائیں الگ الگ حکومتوں کے حساب سے مختلف ہیں۔ اور ان میں جرمانے، یا جرمانے اور ہلکی سزا دونوں ایک ساتھ، یا قید کی سزائیں شامل ہیں۔ جیسا کہ یونان، پولینڈ اور الجیریا میں۔ یا پھر اور زیادہ لمبی سزائیں جن میں پانچ سال تک کی قید کی سزا ہو سکتی ہے جیسا کہ انڈونیشیا میں۔ یا پھر انتہائی لمبی سزائیں جن میں 20 سال تک کی قید کی سزا ہو سکتی ہے جیسے افغانستان میں۔ جسمانی سزائیں جیسے سوڈان میں کوڑے مارنا۔ اور اور یا پھر موت کی سزا تک ہو سکتی ہے، جو سعودی عرب اور پاکستان جیسے ممالک میں ممکن ہے۔ یہاں یہ ذکر کرنا بھی ضروری ہے کہ مذہبی توہین جرائم کے اس بین الاقوامی معیار کو پورا نہیں کرتی جس کے تحت موت کی سزا کو قابل قبول مانا جاتا ہے۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ مذہبی توہین کے قانون کے نفاذ کے ساتھ جڑے سرکاری اور غیر سرکاری امتیاز نے مذہبی رنگارنگی کے خلاف عدم برداشت کی ایک عمومی فضا بنانے میں مدد دی ہے۔ بہت سے سرکاری اور عدلیہ سے جڑے ارباب اقتدار کی طرف سے پیش کئے گئے دعووں کے برعکس یہ قانون مذہبی ہم آہنگی کو تحفّظ دینے کے بجائے اسے نقصان پہنچاتے ہیں۔ ایک اخبار جکارتا پوسٹ میں انڈونیشیا کے ماہر قانون ٹوڈنگ مولیالوبس (Todung Molialobs) کا ایک حوالہ دیا گیا، جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ٹکراؤ اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب کچھ ایسے گروپوں کی طرف سے کچلنے اور دبانے والی کاروائیاں کی جاتی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ صرف سرکاری رضامندی والے مذاہب (یعنی اسلام، مسیحیت، پروٹیسٹینٹزم، ہندوازم، بدھزم، اور کنفیوشنزم کی معیاری شکلیں) ہی قانونی

ہیں اور باقی سبھی دوسرے مذاہب کا خاتمہ کر دیا جانا چاہئے۔ اس طرح کی کاروائیاں ٹکراؤ کا ذریعہ ہیں۔ پاکستانی ماہر قانون اکبر ایس۔ احمد نے 2002 میں واشنگٹن پوسٹ میں ایک کالم میں اسی طرح کا اشارہ دیا تھا کہ، [پاکستان کے اندر] مذہبی توہین کے قانون کے استعمال سے عدم رواداری کو بڑھاوا ملا ہے۔

مذہبی توہین کس طرح واقع ہوتی ہے یہ طے کرنے کے لئے، ریاستی ارباب اقتدار کو چاہئے کہ وہ مذہب کے نظام عقائد کا کوئی اصول طے کریں تا کہ مذہبی دل آزاری یا توہین کے کسی بھی مبیّنہ عمل کی پرکھ ان اصولوں سے کی جا سکے۔ اس سے حکومت کو یہ موقع مل جائے گا کہ وہ ملک یا پورے فرقہ پر بحیثیت مجموعی سرکاری یا غالب مذہب کی کسی خاص شکل کو لاگو کرے۔ کچھ ممالک میں حکومتیں مذہبی توہین کے قانون کا استعمال مذہبی طرز عمل پر اپنا وسیع تر کنٹرول قائم کرنے کے لئے کرتی ہیں، جب کہ کچھ دوسرے ممالک میں، حکومت غالب یا مذہبی ارباب اقتدار کا بہت زیادہ لحاظ کرتی ہے، جو عدلیہ کے نظام کو اپنا اثر بڑھانے اور اپنے اصولوں کو لاگو کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

بین الاقوامی قوانین

بین الاقوامی قانون میں توہین مذہب — جسکا مطلب ہوتا ہے، مذہبی اصولوں، شخصیتوں اور دیوتاؤں کے خلاف نہایت سخت، توہین آمیز اور نازیبا کلمات کا اظہار اور اشتعال انگیزی، یعنی کہ ایسا اظہار جس کے ذریعہ دشمنی کو کھلے عام بڑھاوا دیا جائے اور تشدد پر اکسایا جائے، ان دونوں کے بیچ ایک اہم فرق ہے۔ ان دونوں میں سے، صرف مؤخّر الذکر ہی ان محدود حالات میں صحیح بیٹھتا ہے جن میں آزادئ اظہار پر پابندی کو قابل قبول سمجھا جاتا ہے۔

شہری اور سیاسی حقوق کے بین الاقوامی عہد (ICCPR) کے آرٹیکل 19 کے مطابق، رائے کی آزادی پر پابندی لگانے کی اجازت کبھی بھی نہیں دی جا سکتی۔ تاہم، آرٹیکل 19(3) حکومت کو اظہار کی آزادی پر پابندی لگانے کی اجازت صرف اسی صورت میں دیتا ہے اگر قانون کے اندر اس کی گنجائش رکھی گئی ہے اور دوسروں کی ساکھ اور حقوق کی حفاظت کرنے یا پھر قومی تحفّظ، عوامی نظم، یا

عوامی صحت اور اخلاقیات کے کے لئے ایسا کرنا ضروری ہو۔

یہ نظریہ کہ بندش "ضروری" ہونی چاہیئے بہت ہی اہم ہے، کیونکہ اس سے یہ طے کرنے کے لئے ایک کم سے کم معیار طے ہو جاتا ہے کہ کیا مناسب ہے، کیا فائدہ مند ہے اور کیا معقول ہے۔ جیسا کہ انسانی حقوق کی دانشور نازلہ غانیہ ہر کوک نے آئی سی سی پی آر کے آرٹیکل 19 اور 20 کے اوپر منعقد کی گئی اقوام متّحدہ کی کانفرنس میں اکتوبر 2008 کے دوران پیش کی گئی اپنی پریزنٹیشن میں اس کی طرف اشارہ دیا تھا، کہ "ضروری" ہونے کی شرط یہ بتاتی ہے کہ کوئی بھی پابندی اس قدر کے متناسب ہونی چاہیئے جس کو وہ تحفّظ دینا چاہتی ہے"۔ اقوام متّحدہ کی حقوق کمیٹی نے عمومی تبصرہ نمبر 10 میں اس بات کی بھی تصدیق کی ہے کہ آرٹیکل 19(3) کے تحت آزادیٔ اظہار پر جائز ٹھہرائی گئی پابندی سے خود اس حق کو خطرے میں نہیں ڈالا جا سکتا۔‘‘

ICCPR کے آرٹیکل 20(2) کے تحت جس میں کسی بھی ایسی قومی، نسلی، یا مذہبی منافرت کی حمایت پر پابندی لگائی گئی ہے جو بھید بھاؤ، دشمنی یا تشدد پر ورغلانے کے مترادف ہو — پابندیاں لگانے کے لئے کم سے کم حد بہت ہی کم واضح ہے۔ تاہم آزادیٔ اظہار کے مشہور ماہرین کے بیچ اس بات پر اتّفاق ہے کہ پابندی کا پیمانہ ابھی بھی کافی اونچا ہے۔ وہ آرٹیکل 20 وضع کئے جانے کے تاریخ سیاق و سباق کو مثال کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں یعنی جنگ عظیم دوم اور نازی حکومت کے حالیہ خوف اور دہشت۔ غانیہ ہر کوک نے یہ واضح کیا ہے کہ آرٹیکل 20 کے پہلےّ حصہ میں "جنگ کے لئے پروپیگنڈہ کرنے پر" پابندی ہے، اس سے اس نفرت کی سنجیدگی کا پتہ چلتا ہے جس کی طرف اس آرٹیکل میں اشارہ ہے۔

قانونِ توہین مذہب کے حامیوں کی دلیل

تاہم، مذہبی توہین کے قانون کے حامیوں کا کہنا ہے کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کے لئے مذہب کے خلاف جارحانہ الفاظ کے اظہار پر پابندی ہونی چاہیئے، اور یہ کہ اس طرح کی پابندیاں خود ICCPR کے آرٹیکل 19(3) اور 20(2) کے تحت بین الاقوامی لوزمات کے کے مطابق

ہیں۔ مذکورہ بالا شہادت کے علاوہ کہ مذہبی توہین کے قانون سے مذہبی تناؤ اور ٹکراؤ کو اور ایندھن ملتا ہے، ماہرین نے اس کے جواب میں یہ دلیل بھی دی ہے کہ اظہار کے اوپر قابل قبول تحدیدات میں مذہبی نظام یا عقائد کے نظام کا تنقید سے تحفّظ شامل نہیں ہے۔ جیسا کہ مذہب اور عقیدے کی آزادی یا نسل پرستی کی معاصر شکلوں کے بارے میں اعلی سطح پر روئداد تیار کرنے کے لئے معمور اقوام متّحدہ کے خصوصی نمائندہ نے 2006 میں انسانی حقوق کونسل کے سامنے اپنی مشترکہ سالانہ رپورٹ میں اس طرف اشارہ دیا تھا "آزادیٔ اظہار کے حق پر جائز طور پر پابندی لگائی جاسکتی ہے اگر اس کی وجہ سے مذہب کی بنیاد پر لوگوں کے حلاف ّ تشدد یا امتیاز کی ترغیب دینے والے کاموں کو حمایت حاصل ہوتی ہے"۔ مذہب کی توہین سے لوگوں کو تکلیف پہنچ سکتی ہے اور انکے مذہبی احساسات کی دل آزاری ہوسکتی ہے، لیکن اسکی وجہ سے لازمی طور پر یا کم سے کم براہ راست طور پر انکے کسی حق کی خلاف ورزی نہیں ہوتی، جس میں مذہب کی آزادی کا انکا حق بھی شامل ہے۔

پاکستان میں توہینِ رسالت اور توہینِ مذہب کے قوانین

پاکستان میں ایک 'اسلامی جمہوریہ' ہونے کے ناطے توہین رسالت کا قانون موجود ہے جو اس ملک کے جملہ مسلم و غیر مسلم افراد پر بلاامتیاز نافذ ہے جس کا متن یہ ہے:

دفعہ 295 (الف): ''کسی جماعت کے مذہب یا مذہبی اعتقادات کی تذلیل کے ذریعے اس کے مذہبی جذبات کی بے حرمتی کی نیت سے اور ارادی افعال: جو کوئی شخص (پاکستان کے شہریوں کی) کسی جماعت کے مذہبی جذبات کی بے حرمتی کرنے کے ارادی اور منافرانہ مقصد سے الفاظ کے ذریعہ خواہ زبانی ہوں یا تحریری یا دکھائی دینے والے خاکوں کے ذریعے مذکورہ جماعت کے مذہب یا مذہبی اعتقادات کی تذلیل کرے یا تذلیل کرنے کی کوشش کرے تو اسے کسی ایک قسم کی سزا اتنی مدت کے لیے دی جائے گی جو دو سال تک ہوسکتی ہے یا جرمانے کی سزا یا دونوں سزائیں دی جائیں گی''۔

دفعہ 295 (ب): ''قرآن پاک کے نسخے کی قصداً بے حرمتی وغیرہ کرنا: جو کوئی قرآن پاک کے نسخے یا اس کے کسی اقتباس کی عمداً بے حرمتی کرے، اس کا نقصان یا بے ادبی کرے یا اسے توہین

آمیز طریقے سے یا کسی غیر قانونی مقصد کے لیے استعمال کرے تو وہ عمر قید کی سزا کا مستوجب ہو گا۔"

دفعہ 295 (ج): "پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں توہین آمیز الفاظ وغیرہ استعمال کرنا: جو کوئی الفاظ کے ذریعے خواہ زبانی ہوں یا تحریری یا نقوش کے ذریعے، یا کسی تہمت، کنایہ یا درپردہ تعریض کے ذریعے بلاواسطہ یا بالواسطہ رسول پاک حضرت محمد ﷺ کے پاک نام کی توہین کرے گا تو اسے موت یا عمر قید کی سزا دی جائے گی اور وہ جرمانے کی سزا کا بھی مستوجب ہو گا۔[2]"

11 مئی 1968ء کو قومی اسمبلی میں (سیاستدان احسن اقبال کی والدہ) محترمہ نثار فاطمہ نے توہین رسالت کے مجرم کے لئے سزائے موت کا بل پیش کیا جس کے نتیجے میں 295 سی کی صورت میں توہینِ رسالت کا قانون نافذ[3] کیا گیا لیکن اس قانون میں توہین رسالت کی سزا 'سزائے موت یا عمر قید مع جرمانہ' کی صورت میں رکھی گئی تھی۔

ذوالفقار علی بھٹو کے زیر نگرانی تیار ہونے والے 1973ء کے دستور میں آرٹیکل 203 کے تحت وفاقی شرعی عدالت کسی قانون کے خلافِ اسلام ہونے کا جائزہ لے سکتی ہے۔ چنانچہ محمد اسمٰعیل قریشی ایڈووکیٹ نے 1984ء میں وفاقی شرعی عدالت میں ایک پٹیشن دائر کی تھی جس میں مذہبی دل آزاری کے سابقہ قوانین کو ناکافی قرار دیتے ہوئے، ان میں توہین رسالت کے جرم کی سزا کے تعین کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ 1986ء کے قانون میں یہ عین اسلام کے مطابق نہ ہو سکا، اور محمد اسمٰعیل قریشی کی پٹیشن کی ضرورت باقی رہی، اس بنا پر وفاقی شرعی عدالت میں داخل اس پٹیشن کا فیصلہ اکتوبر 1990 کو آیا جس میں عدالت نے قرار دیا:

"مندرجہ بالا بحث کے پیش نظر ہماری رائے یہ ہے کہ عمر قید کی متبادل سزا، جیسا کہ دفعہ 295 سی پاکستان ضابطۂ تعزیرات میں مقرر ہے، احکاماتِ اسلام سے متصادم ہے جو قرآن اور سنت میں دیئے گئے ہیں لہٰذا یہ الفاظ اس میں سے حذف کر دیئے جائیں۔ ایک شق کا مزید اضافہ اس میں کیا

---

2 مجموعہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ 295 اور اس کی ذیلی دفعات کا متن

3 وجداری ترمیمی ایکٹ نمبر 3... سال 1986

جائے،تاکہ وہی اعمال اور چیز جب دوسرے پیغمبروں کے متعلق کہی جائیں، وہ بھی اسی جرم کے مستوجبِ سزا بن جائے جواوپر تجویز کی گئی ہے۔اس حکم کی ایک نقل صدرِ پاکستان کودستور کے آرٹیکل203(3) کے تحت ارسال کی جائے ،تاکہ قانون میں ترمیم کے اقدامات کئے جائیں اوراسے احکاماتِ اسلام کے مطابق بنایا جائے۔اگر30۔ اپریل 1991ء تک ایسا نہیں کیا جائے گاتو'عمر قید' کے الفاظ دفعہ 295سی تعزیراتِ پاکستان میں اس تاریخ سے غیر مؤثر ہو جائیں گے''۔

گویامذکورہ بالا فیصلہ کی روسے 295سی کے قانون میں نہ صرف عمر قید کے الفاظ ختم ہوگئے بلکہ یہ قانون پیغمبر اسلام محمد ﷺ سے بڑھ کر تمام انبیاے کرام کی توہین تک وسیع کردیا گیا۔فاضل عدالت کا فیصلہ ہونے کے ناطے اس میں شرع و قانون اور عدل وانصاف کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا۔

وفاقی شرعی عدالت کے اس فیصلے کے بعد نواز حکومت کے پہلے دور1992ء میں، پارلیمنٹ میں یہ معاملہ دوبارہ پیش ہوا۔2جون1992ء کو قومی اسمبلی میں زیر بحث آیااوراسمبلی نے 'عمر قید' کی سزاکے خاتمے کو منظور کردیااور8۔ جولائی1992ء کو پاکستان کی سینیٹ نے بھی اس بل کواتفاقِ رائے سے منظور کیااور آج پاکستان میں یہی قانون نافذ ہے جو آخرکار پارلیمنٹ کی طرف سے منظور ہوا ہے۔

پاکستان میں اقلیتوں کے مسائل و حقوق

ندیم عباس

پاکستان میں بہت سی اقلیتیں آباد ہیں، جن کا اپنا اپنا مذہب، اپنے اپنے عقائد اور اپنی اپنی ثقافتی اقدار ہیں۔ یہاں سب سے بڑی اقلیت ہندو ہیں،اس کے بعد مسیحیوں کا نمبر آتا ہے۔ ان دونوں بڑی اقلیتوں کے علاوہ بہائی، پارسی، قادیانی، بودھ اور دیگر عقائد کے لوگ بھی ہیں۔عام طور پہ پاکستان پر اقلیتوں کے حوالے سے کافی تنقید کی جاتی ہے۔ عالمی میڈیا میں پاکستان کا نام اس تناظر بہت بدنام ہے۔ تاہم یہ پوری طرح یکطرفہ مسئلہ نہیں ہے۔ پاکستان میں ویسے ہی انتظامی اور گورننس کے شدید مسائل ہیں جن کا نشانہ خود اکثریت بھی بنتی ہے۔ جبکہ اقلیت کو ان مشکلات کا زیادہ سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاہم پاکستان میں اقلیتوں کے لیے جہاں یقینی طور پہ کچھ شدید قسم کے مسائل ہیں وہیں ان کے حقوق کے لیے کوششیں بھی کی جاتی ہیں۔زیرنظر مضمون میں اقلیتوں سے متعلق نمایاں مسائل و حقوق پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مضمون نگار پی ایچ ڈی سکالر ہیں، مذہبی ہم آہنگی اور سماجی موضوعات پر لکھتے ہیں۔

آئینی جمہوری حقوق

پاکستان کے 1973 عیسوی کے آئین کی رو سے سیاسی اور مذہبی اقلیتوں کو ہر قسم کا تحفظ حاصل ہوگا- تمام شہری قانون کی نظر میں برابر ہوں گے - ریاست اقلیتوں کے جائز حقوق اور مفادات کی حفاظت کرے گی-انہیں وفاقی اور صوبائی ملازمتوں میں مناسب نمائندگی دی جائے گی- صوبائی اسمبلیوں میں اقلیتوں کو نمائندگی دینے کے لیے اضافی نشستیں بھی مخصوص کی گئی ہیں-آئین میں وہ تمام ضمانتیں موجود ہیں جو ایک جمہوری ملک میں اقلیتوں کے حقوق اور مفادات کے تحفظ میں دی جاتی ہیں۔

آئین میں اقلیتوں کے حقوق پر کلام موجود ہے۔اس میں کئی آرٹیکلز اقلیتوں کو درپیش مسائل

کے بارے میں ہیں جن میں سے بعض کا تعلق بالعموم انسانی حقوق سے ہے جبکہ 36 آرٹیکلز ایسے ہیں جو اقلیتوں کے مخصوص حقوق کے بارے میں ہیں۔ اکثریتی مذہب اسلام اور مسلمانوں کے حوالے سے بھی شقیں الگ سے مذکور ہیں۔ مسلمان کی تعریف بھی بیان کی گئی ہے۔ اسلام کو سرکاری مذہب اور نظریہ اسلام کو نظریہ پاکستان کہا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی کئی حوالوں سے بات کی گئی ہے۔ اس آئین کا مسلم وغیر مسلم دونوں حلف اٹھاتے ہیں۔

اقلیتوں کی مذہبی آزادی کی حدود

پاکستان کا آئین کسی غیر مسلم کو اِس امر پر مجبور نہیں کرتا کہ وہ اسلام قبول کرلے، یہ بحیثیتِ آزاد شہری اُن کا انتخاب ہے کہ وہ اسلام قبول کریں، لیکن اگر وہ اسلام قبول نہیں کرتے، تو ملک سے وفاداری کے تقاضے پورے کرنے کے ساتھ وہ ایک شہری کی حیثیت سے اپنے تمام حقوق وفرائض کے ساتھ زندگی گزار سکتے ہیں۔ لیکن ملک کا آئین ان دوسرے مذاہب یا افکار کے حاملین کو اِس بات کا ضرور پابند کرتا ہے کہ اُن کو مسلمانوں کے حقیقی جذبات واحساسات کا پاس ولحاظ رکھنا ہوگا۔ اگر وہ اِس میدان میں بے ضابطگی کا ارتکاب کریں گے، تو قانون کے مطابق انھیں جواب دہ بھی ہونا پڑے گا۔ آزادیِ افکار کا حق انھیں حاصل ہے، مگر دستور اور قانون کے دائرے میں۔ یہ غیر مسلم شہریوں کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں، بلکہ خود مسلمانوں کو بھی جو حقوق حاصل ہیں، وہ بھی قانون کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے ہی حاصل ہیں، کسی کو بھی قانون اپنے ہاتھ میں لینے کا اختیار نہیں۔

عدالتوں کا رویہ

پاکستان کی عدالتوں نے اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے اہم فیصلے کیے۔ سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس تصدق حسین جیلانی نے اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے چند سال قبل ایک جامع فیصلہ کیا تھا۔ اس فیصلہ میں اقلیتوں کے حالاتِ کار کو بہتر بنانے کے لیے لائحہ عمل واضح کیا گیا۔ سپریم کورٹ نے جسٹس تصدق حسین جیلانی کے فیصلہ پر عملدرآمد کے لیے سابق آئی جی پولیس ڈاکٹر شعیب سڈل پر مشتمل کمیشن قائم کیا۔ ڈاکٹر شعیب سڈل نے اقلیتوں کی شکایات کا بغور جائزہ

لیا۔ اقلیتوں سے تعلیم، صحت اور روزگار کے شعبوں میں امتیازی سلوک کی شکایات ختم کرنے کے بارے میں تجاویز پیش کی گئیں۔

حال ہی میں سپریم کورٹ کے ایک معزز جج صاحب کا کٹاس راج اور اس میں رکھے بعض نوادرات کے حوالے سے متروکہ وقف املاک کے ذمے داران کی سرزنش کی تھی۔ عدالتِ عظمیٰ نے جو ریمارکس دیے تھے، سب نے اُن سے اتفاق کیا تھا۔

چند ماہ قبل سپریم کورٹ نے بہاولپور کے قریب واقع ایک مندر پر حملہ کا نوٹس لیا تھا۔ جسٹس گلزار کے حکم کی بناء پر حملہ آور گرفتار ہوئے۔ عدالت نے حکم دیا کہ حملہ آوروں کے مندر پر حملہ میں ہونے والے نقصان کا ازالہ کیا جائے۔ 2021 میں دیوالی کے تہوار کے موقع پر جسٹس گلزار کرک تشریف لے گئے۔ انھوں نے اس موقع پر اپنے خطاب میں کہا کہ اقلیتوں کو تحفظ فراہم کرنا تمام اداروں کی ذمے داری ہے۔

مناصب وعہدے

اقلیتی برادریوں کے نمائندوں کو صوبائی اور مرکزی وزراء، مشیران اور پارلیمانی سیکرٹری بھی مقرر کیا جاتا ہے۔ جداگانہ انتخابات کی بدولت اقلیتی افراد کو سرکاری کمیٹیوں اور کونسلوں میں لیا جاتا ہے۔ اقلیتوں کو ووٹ دینے اور بلدیاتی اداروں، مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں اپنے ووٹوں سے، اپنی پسند کے، اپنے ہم مذہب، ہم مسلک اور ہم خیال نمائندے بھیجنے کے حقوق میسر ہیں۔

مخصوص نشستیں

آئین پاکستان کی دفعہ 51 کے مطابق قومی اسمبلی میں غیر مسلموں کے لئے دس نشستیں مخصوص کی گئی ہیں۔ اس شق کی مزید وضاحت کے لئے آئین میں لکھا گیا ہے کہ ”قومی اسمبلی میں نشستیں سرکاری طور پر شائع شدہ آخری مردم شماری کے مطابق آبادی کی بنیاد پر ہر صوبے، وفاق کے زیرِ انتظام قبائلی علاقہ جات اور وفاقی دارالحکومت کے لئے متعین کی جائیں گی“۔

مذہبی اسفار کا کوٹہ

قومی اسمبلی کے اقلیتی ممبران کو باقاعدہ 'مذہبی اسفار کوٹہ' ملتا ہے جس سے کچھ مسیحی شہری کرسمس منانے 'روم' جاتے ہیں۔

تعلیمی نصاب کی آزادی

اگرچہ بورڈ کا نصاب تقریبا سب کا ایک جیسا ہوتا ہے لیکن اپنے نجی تعلیمی اِداروں میں اقلیتی گروہ اپنی مرضی سے بھی نصابِ تعلیم مقرر کرتے ہیں جو بالعموم سیکولر ہوتا ہے، طلبہ کا لباس اور ثقافت مسلمانوں سے الگ ہوتے ہیں۔

حکومتی امداد

حکومت کی طرف سے طلبہ ،اساتذہ اور افراد کو سائیکلیں، موٹر سائیکلیں اور سکولوں کو ویگنیں تحفہ میں ملتی ہیں۔ بیواؤں کو سلائی مشینیں اور بیٹیاں بیاہنے کے لئے رقوم دی جاتی ہیں۔

انعامات

ہر سال قومی تہوار پر اقلیتی ادیبوں، اداکاروں اور فنکاروں کی حوصلہ افزائی کے لئے ایوارڈز دیئے جاتے ہیں۔ اقلیتی مریضوں کو علاج کے لئے اِمداد اور وظیفہ ملتا ہے۔

تہواروں پر پروگرامز و چھٹیاں

بعض اقلیتی تہواروں پر سرکاری ملازمین کو رخصت ملتی ہے۔ کرسمس پر مسلمانوں کے برابر دو چھٹیاں ہوتی ہیں۔ کرسمس پر وزیرِاعظم کی طرف سے نقد رقم کا تحفہ دیا جاتا ہے۔ اقلیتی تہواروں کو ریڈیو اور ٹی وی پر نمائندگی ملتی ہے، گورنر ہاؤس میں اقلیتی کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں اور ان کے تہوار بھی منائے جاتے ہیں۔

اقلیتیں کس صوبے میں زیادہ محفوظ محسوس کرتی ہیں؟

صوبوں کی سطح پر پنجاب کے مقابلے میں اقلیتی شناخت خیبر پختونخوا میں زیادہ محفوظ ہے۔سابقہ قبائلی علاقوں کے نوجوانوں کے مطابق ان کے علاقے میں کبھی شناخت کی بنیاد پر قبائل ایک دوسرے کے ساتھ نہیں لڑے،اگر کبھی مسائل پیدا ہوئے ہیں تو یہ تنازعے سیاسی نوعیت کے تھے۔ان علاقوں میں اتنا امن تھا کہ میرانشاہ میں بہت سارے چرچ تھے جنہیں کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا گیا۔ کبھی کبھار بازار اور آفس بند کروائے جاتے تھے لیکن اس دوران مسیحی برادری کو کچھ نہیں کہا جاتا تھا، وہ اپنا کاروبار جاری رکھتے تھے،دکانیں اور آفس کھلے رکھتے تھے۔اور کرزئی ایجنسی میں سکھوں کی بڑی تعداد ہے جو محفوظ ہیں،آزاد ہیں۔ساؤتھ وزیرستان میں بھی مسیحی ہیں،وہاں کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا،ان علاقوں میں لڑائی جب بھی ہوئی سیاسی مفادات کے تحت وارد ہوئی۔

پاڑاچنار میں زیادہ تر شیعہ ہیں، وہاں شیعہ اور سنی عرصے سے اکٹھے پر امن رہتے تھے لیکن درمیان میں پانچ سال ایسے آئے کہ طرفین کا بے تحاشا خون بہا لیکن اس کی بنیاد مذہبی وابستگی نہیں تھی بلکہ یہ سب سیاسی مسائل ہیں۔ان علاقوں میں عوام اپنی سطح پر ایک دوسرے کی شناختوں کو تسلیم کرتے ہیں اور امن سے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

مسائل

پاکستان میں انتظامی سطح پر بہت سی کوتاہیاں ہیں جن کے باعث اکثریت کو بھی مشکلات کا سامنا رہتا ہے۔ایسے میں لازمی طور پہ اقلیتیں زیاہ متاثر ہوتی ہیں۔ملک میں اقلیتوں کے لیے جہاں بہت سے اقدامات کیے جاتے ہیں وہیں کچھ مسائل بھی ہیں جو حقیقت ہیں اور انہیں حل کیا جانا چاہیے۔ان میں بعض یہ ہیں:

امتیازی سلوک

مختلف سرویز کی روشنی اقلیتی برادری کے نمائندہ نوجوان سمجھتے ہیں کہ ان کی شناخت محفوظ

نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''ہمیں ہر سطح پر اپنی شناخت چھپانی پڑتی ہے۔ ہم اپنی شناخت کا اظہار نہیں کر سکتے کیونکہ ہمیں یہ لگتا ہے کہ ہمیں امتیازی سلوک کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ ستر کی دہائی سے قبل ہم اقلیتوں کو مشکلات کا سامنا نہیں تھا لیکن اس کے بعد سے ہم اپنا تشخص چھپانے پر مجبور ہیں۔ ہم جدید اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں بھی اپنی شناخت کا کھل کر اظہار نہیں کر سکتے۔''

ریاست اقلیتی شناخت کو تحفظ دینے کے لیے اگرچہ کچھ اقدامات اٹھاتی ہے لیکن اس نے کئی ایسے خلا بھی چھوڑ رکھے ہیں جن کی وجہ سے اقلیتوں میں بے چینی پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً آخری مردم شماری میں جو فارم بنائے گئے تھے ان میں مذہب کے خانے میں ایک آپشن ''دیگر'' کے عنوان سے موجود تھا۔ یعنی جو اقلیتیں زیادہ تعداد میں ہیں ان کے تو نام درج کیے گئے تھے لیکن جن کی تعداد بہت کم ہے اور وہ طاقتور بھی نہیں ہیں ان کا نام شامل نہیں کیا گیا تھا، ان سب کو دیگر میں رکھا گیا۔ اس سے کئی مسائل نے جنم لیا ہے۔ مثال کے طور پہ جب انہیں اپنی تعداد کا ہی علم نہ ہوگا تو وہ اپنے حقوق کے لیے آواز کیسے اٹھا سکتے ہیں اور اقلیتوں کے نام پر کوٹہ سسٹم میں ان کی حیثیت کیا ہوگی؟

جبری مزدوری

جبری بے گار (forced labour) اگرچہ ملک کا عموی مسئلہ ہے۔ بچوں سے کام لینا اور مزدوری کرانا غیر قانونی ہے۔ اس مسئلے کا سامنا بلا تفریق سب کو ہے لیکن جب کوئی مزدور اقلیت سے ہو تو پھر مشکلات مزید بڑھ جاتی ہیں۔

اجتماعی جائیدادوں کا قضیہ

اجتماعی جائیدادوں کے مسائل بھی ہیں۔ ایسی جائیدادیں جو مذہبی اقلیتوں کی تھیں، ان کا بہتر تحفظ ممکن نہیں بنایا جاتا، بالخصوص عبادت گاہیں وغیرہ۔

خواندگی

اقلیتیں خواندگی میں بھی پیچھے ہیں۔ آزادی کے بعد مسیحی برادری ملک کی بڑی تعلیم یافتہ کمیونٹی تھی لیکن 1998 کے اعداد و شمار کے مطابق پتہ چلا ہے کہ اس کمیونٹی میں محض ایک تہائی مسیحی تعلیم یافتہ ہیں، جبکہ ہندو اس سے بھی کم، صرف ایک چوتھائی پڑھے لکھے ہیں۔

پاکستان میں اقلیتیں تعلیمی شعبے میں کافی پیچھے ہیں۔اس کی کئی وجوہات ہیں جن میں سب سے بڑی وجہ معاشی مسائل ہیں۔ معاشی طور پہ بہتر نہ ہونے کے سبب نوجوان چھوٹی عمر سے ہی مزدوری کرنے لگتے ہیں اور تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے۔

جبکہ ایک وجہ امتیازی سلوک بھی ہے کہ تعلیمی اداروں میں عام طور پہ اقلیتی برادری کے بچوں کے ساتھ زیادہ میل جول نہیں رکھا جاتا اس لیے وہ تعلیم کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

جبکہ اقلیتی برادری کی خواتین کی صورتحال زیادہ تشویشناک ہے۔ ''مذہبی اقلیتی برادری کی خواتین کے پاس مواقعوں کی کمی ہے۔ مسیحی برادری کے لئے تو اگرچہ تعلیمی ادارے موجود ہیں، لیکن سکھ کمیونٹی، ہندو، بہائی کمیونٹی کے بچے اور خاص طور پر بچیاں تعلیم سے محروم رہ جاتیں ہیں۔اکثر ان کے لئے الگ سے ادارے تو موجود نہیں ہوتے اور باقی سرکاری اور نجی ادروں میں وہ اپنے ساتھ ہونے والے ساتھی طلبہ کی طرف سے امتیازی سلوک کے باعث سکولز نہیں پڑھتیں یا چھوڑ دیتی ہیں۔اس طرح ان کی ایک بڑی شرح غیر تعلیم یافتہ ہے اور جس سے ان میں شعور اور خوداعتمادی کی کمی رہ جاتی ہے اور یہی کمی انہیں ہر شعبے میں محسوس ہوتی ہے''۔

اس حوالے سے لوگوں کے رویے بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں جو کہ مسیحی، ہندو اور سکھ کمیونٹی کی خواتین میں خوداعتمادی کے فقدان کی بڑی وجہ بنتے ہیں اور چونکہ حصول کی شرح کم ہے، اس لئے پھر بہترین ملازمتوں کے حصول میں بھی یہ خواتین ملکی سطح پر اقلیتی برادری کو دیئے جانے والے 5 فیصد کوٹے کے باوجود پیچھے رہ جاتی ہیں یا پھر کلاس فور، نرسز اور دیگر چھوٹے عہدوں پر ملازمت کرنے پر مجبور ہوتیں ہیں۔

بے روزگاری

پاکستان میں جہاں ایک طرف بہت بڑی آبادی کو بے روزگاری جیسے مسائل کا سامنا ہے وہیں اقلیتی آبادی کے نوجوانوں میں یہ شرح کہیں زیادہ ہے۔ بہت سے اقلیتی نوجوان نوکریاں نہ ہونے کے باعث بے روزگاری کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ معاشرے میں ان کے پاس خاکروب، صفائی ستھرائی اور سینٹری کے کام کے علاوہ کوئی باعزت روزگار موجود نہیں۔

بالخصوص پرائیویٹ شعبوں میں اقلیتی کمیونٹی کے لئے نوکریاں بالکل بھی نہیں ہیں کیونکہ پرائیویٹ شعبے میں زیادہ تر نوکریاں تعلقات، اثرورسوخ اور سفارش کی بنیاد پر ملتی ہیں اور چونکہ اقلیتی کمیونٹی کے لوگوں کے ذاتی نوعیت کے تعلقات بہت کم ہیں اس لئے وہاں انہیں مسئلہ ہوتا ہے۔

اقلیتی برادری کی زیادہ تر آبادیوں کے لوگ کچے اور خستہ مکانوں میں رہ رہے ہیں۔ ان کے بچے بڑے سکولوں میں نہیں پڑھتے، یہی وجہ ہے کہ ان بچوں کو بھی یہی لگتا ہے کہ انہیں بھی اپنے والدین والا کام ہی کرنا ہے۔

اہانتِ مذہب کے مقدمات

پاکستان میں مذہب کی توہین ایک قابل جرم چیز ہے اور یہ ایک ایسا پہلو امر ہے جس پر پوری دنیا میں عمل کیا جاتا ہے۔ البتہ پاکستاان میں عام طور پہ بہت سی مثالیں ایسی سامنے آجاتی ہیں جن میں توہینِ مذہب کے جھوٹے مقدمات بھی شامل ہوتے ہیں۔ یا یہ کہ محض الزام کی بنیاد پہ بغیر کسی عدالتی کاروائی کے کوئی فرد خود ہی اقدامِ قتل کر دیتا ہے۔ حالیہ عرصے میں اس صورتحال میں اضافہ ہوا ہے جسے ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے۔ اقلیت کو ہر طرح کا تحفظ دینا ریاست کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ 1987 سے 2017 تک اہانتِ مذہب کے 1549 مقدمات رپورٹ ہوئے۔ ان میں سے 1138 پنجاب میں رپورٹ ہوئے، بلوچستان اور گلگت میں سب سے کم شرح رہی۔ اور جو لوگ مارے گئے ان میں 39 مسلمان تھے، 23 مسیحی، 2 ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے جبکہ 2 کا مذہب معلوم نہیں ہو سکا۔

مسلکی و فرقہ وارانہ کشمکش

فرقہ واریت کی جڑیں مذہبی یا سیاسی اور تاریخی؟

ڈاکٹر ولی نصر

ڈاکٹر ولی نصر مشرقِ وُسطیٰ اور بین الاقوامی تعلقات کے ماہر، خارجہ امور پر امریکی حکومت کے مشیر اور ایک معروف دانشور ہیں۔ اس وقت وہ امریکا کی جان ہاپکنز یونیورسٹی کے اسکول آف ایڈوانسڈ انٹرنیشنل اسٹڈیز میں ڈین اور بین الاقوامی تعلقات کے پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر نصر امریکا کے معروف ادارے ’کونسل آن فارن افیئرز‘ کے تاحیات رکن ہونے کے ساتھ ساتھ امریکی محکمۂ خارجہ کے پالیسی بورڈ کے بھی رکن ہیں۔ یہ ان کے انٹرویو کا ایک متعلقہ حصہ ہے جو انہوں نے2014 ء میں نیوز لائن کو دیا تھا۔ اس کے بعض مندرجات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن اس کے باوجود ان کے انٹرویو کے چند اقتباسات پاکستان اور مسلم دنیا کے متعلق امریکی دانشور طبقے کے خیالات کو سمجھنے میں کار آمد ہوسکتے ہیں۔

سوال: آپ کے خیال میں اسلام میں فرقہ واریت کی بنیاد کیسے پڑی اور اسلام کی تاریخ میں ایسے کون سے واقعات تھے جنہوں نے آنے والی صدیوں میں فرقہ وارانہ تصادم اور کشیدگی کو جنم دیا؟

ولی نصر: یہ ایک بہت مشکل موضوع ہے۔ درحقیقت اس مسئلے کا تعلق تنوع یا اختلافِ رائے سے ہے اور اس بارے میں ہمارے دو رویے ہوتے ہیں۔ یا تو آپ اختلافِ رائے کو تسلیم کرتے ہیں یا اس کی موجودگی سے یکسر انکاری ہوتے ہیں۔ ہم ایک ایسے دور میں جی رہے ہیں، جب اسلام کی نام لیوا قابلِ ذکر قوتیں اس اختلافِ رائے اور دین کی مختلف تشریحات کی اجازت نہیں دیتیں۔ ان میں ایک رویہ جماعتِ اسلامی جیسی تنظیموں کا ہے جن کا ردِ عمل پُرامن ہوتا ہے اور دوسری جانب ’القاعدہ‘ جیسے گروہ ہیں جو اس مسئلے پر متشدد رویہ اپناتے ہیں۔ لیکن مسئلہ دونوں کا ایک ہی ہے۔ دونوں ہی طرح کے گروہ یہ ماننے پر تیار نہیں کہ سُنّی اسلام کی ایک سے زیادہ تشریحات بھی ہوسکتی ہیں۔ دیوبندیوں اور بریلویوں کا باہمی تنازع بھی اس تنوع اور اختلافِ رائے کو تسلیم نہ کرنے کے رویے کا مظہر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام اپنے آغاز سے ہی متنوع رہا ہے۔ پیغمبرِ اسلام محمد ﷺ رسول بھی تھے اور حکمران بھی۔ اسی لیے ہم اسلامی ریاست کی تعریف یہ کرتے ہیں کہ ایک ایسی ریاست جو شریعت کی بنیاد پر قائم ہو۔ لیکن یہاں سوال اٹھتا ہے کہ کون سی شریعت اور کس کی شریعت؟ اب اگر اسلام صرف ذاتی عقائد سے بحث کرتا تو یہ کہنا آسان ہوتا کہ آپ جو چاہے عقائد رکھیے، کیوں کہ آپ کے عقائد آپ کی ذات تک محدود رہیں گے اور اسلامی تاریخ کے بیشتر دور میں مسلمانوں کے عقائد ان کا ذاتی معاملہ رہے ہیں۔

لیکن سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے شروع ہونے والی اسلامی بنیاد پرستی کا مسئلہ یہ رہا ہے کہ اس کے نظریات اسلام کی اس تاریخ سے منسلک نہیں۔ تنوع، تاریخ کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور اس اصول کا عیسائیت، ہندومت، یہودیت اور اسلام، سب پر یکساں اطلاق ہوتا ہے۔ مختلف ثقافتوں اور ماحول میں مذہبی تعلیمات پر عمل کے نتیجے میں بھی تنوع اور اختلافِ رائے جنم لیتا ہے اور مختلف مذہبی نظریات، عقائد اور تعلیمات کا نتیجہ بھی تنوع اور اختلافِ رائے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ کسی بھی سیاسی یا مذہبی تنازع کی مثال کئی شاخوں والے ایک درخت کی سی ہے جس کی شاخیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خود درختوں کی صورت اختیار کر جاتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ شیعہ اور سُنّی مکاتبِ فکر کے درمیان اختلافات آج بھی وہی ہیں جو ۱۴۰۰ سال قبل تھے۔ ان کے درمیان سیاسی اور ثقافتی اختلافات، عقائد، قوانین اور مذہبی اداروں کے دائرہ اختیار پر اختلافات اور بحث ساتویں صدی عیسوی سے چلی آ رہی ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اکیسویں صدی میں اچانک ایسا کیا ہو گیا ہے کہ یہ شیعہ اور سُنّی ایک دوسرے کے لیے ناقابلِ برداشت ہو گئے ہیں؟ درحقیقت یہ مسئلہ تاریخی نہیں، بلکہ موجودہ دور کا ہے۔ کیوں کہ تاریخ کے بیشتر ادوار میں یہی شیعہ اور سُنّی بغداد سے کراچی اور دہلی سے لکھنؤ تک پُرامن بقائے باہمی کے تحت زندگیاں گزارتے رہے ہیں۔ مختلف معاشروں میں شیعوں اور سنیوں کے درمیان شادی بیاہ عام بات تھی اور دونوں فرقوں کے افراد کے مابین خوشگوار سماجی تعلقات معمول کی بات تھے۔

میری رائے میں دونوں فرقوں کے درمیان پیدا ہونے والے مسائل کی ایک جڑ اسلامی بنیاد

پرستی ہے جس نے دورِ جدید میں اسلام کے مزاج کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ اس بنیاد پرستی کا آغاز ۱۹۳۰ء کی دہائی سے ہوا جس میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شدت آتی گئی۔ تیل کی دولت نے سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں کو طاقت بخشی جو مخصوص سخت گیر نظریات کی حامل تھیں۔ لٰہذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی بنیاد پرستی کے پھیلنے میں جہاں سیاست اور تاریخ کا ہاتھ ہے، وہیں دولت بھی ایک اہم عنصر رہا ہے۔ یہ تمام چیزیں ایک دوسرے سے اس طرح منسلک ہیں کہ انہیں الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔

سوال: پاکستان میں بڑھتی ہوئی فرقہ واریت کو کئی لوگ محض ایک مذہبی مسئلہ سمجھتے ہیں۔ جب کہ بعض دیگر افراد کے نزدیک یہ ایک سیاسی مسئلہ ہے۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

ولی نصر: میرے خیال میں یہ مسئلہ مذہبی بھی ہے اور سیاسی بھی، اور کیوں نہ ہو۔ آخر کو پاکستان میں اس کے قیام سے ہی سیاست اور مذہب ایک دوسرے سے جڑے رہے ہیں۔ مسلمانوں نے ہندوستان سے ہجرت کیوں کی تھی؟ ظاہر ہے اس لیے کہ وہ مسلمان تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ایک وقت ایسا آیا تھا کہ جب آپ اس نئے وطن کے لیے سیکولر شناخت کا انتخاب کر سکتے تھے۔ لیکن ایسا ہونے سے قبل ہی ۱۹۴۹ء میں قراردادِ مقاصد آگئی جس نے واضح کر دیا کہ یہ ایک اسلامی ملک ہے اور جب آپ نے یہ کہہ دیا کہ یہ ایک اسلامی ملک ہے، تو اس کا مطلب ہے کہ اب اس ملک میں سیاست اسلام کے مطابق ہوگی اور یہیں سے یہ مسئلہ سیاسی ہو جاتا ہے۔

اب اگر یہ مان لیا جائے کہ اسلام سیاست کا ایک اہم جزو ہے، تو سوال اٹھتا ہے کہ کون سا اسلام؟ ہم اکثر کہتے ہیں کہ شریعت ہی اصل قانون ہے۔ لیکن کس کی شریعت؟ حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی یا جعفری؟ ہمارے پاس تو شریعت کے پانچ بنیادی مکاتبِ فکر موجود ہیں۔ یہ مسئلہ اُس وقت بھی اٹھا تھا، جب جنرل ضیاء الحق نے اعلان کیا تھا کہ پاکستان چوں کہ ایک اسلامی ریاست ہے، لٰہذا تمام مسلمان اپنی زکوٰۃ ریاست کو دیا کریں گے، کیوں کہ تاریخ میں یہی ہوتا آیا ہے۔ عباسی اور اموی خلفا کے دور میں زکوٰۃ کا انتظام وانصرام ریاست کے پاس ہوتا تھا۔ لیکن جنرل ضیاء کے اس حکم پر شیعوں نے ردِعمل کا اظہار کیا اور کہا کہ پاکستان کو سُنّی ریاست بنایا جارہا ہے۔ تو ثابت ہوا کہ یہ ایک سیاسی مسئلہ ہے

کیوں کہ پاکستان میں اسلام بھی سیاسی ہی رہا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ایک ایسا ملک جس کی ۷۵ سے ۸۰ فیصد آبادی سُنّی ہے، وہ آخر شیعہ اقلیت کے بارے میں اتنی حساس کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے آپ کو پاکستان میں طاقت کے سرچشموں کا تاریخی جائزہ لینا ہوگا۔ یہ در حقیقت طاقت کے حصول کی لڑائی ہے۔ پاکستان کو کنٹرول کرنے کی لڑائی اور مقاصدِ پاکستان کی تشریح کرنے کی لڑائی۔

ذرا ۱۹۵۳ء کو یاد کیجیے، جب پاکستان میں پہلے پہل قادیانی مسئلہ کھڑا ہوا تھا۔ اس وقت جب ایک قادیانی کو وزیرِ خارجہ نامزد کیا گیا تو دیوبندی علما نے اس پر اعتراض کیا۔ اس وزیر نے تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا تھا، وہ پنجاب میں پیدا ہوا تھا اور خود کو پاکستانی کہتا تھا۔ لیکن دیوبندی علما کا اصرار تھا کہ وہ شخص پاکستانی ہی نہیں کیوں کہ وہ سُنّی العقیدہ نہیں ہے اور اسی لیے اسے وزیر کا منصب بھی نہیں سونپا جاسکتا۔ ان علما نے اِسی پر بس نہیں کی، بلکہ انہوں نے تمام قادیانیوں کو ہی غیر مسلم قرار دینے کا مطالبہ کر ڈالا۔ اس دلچسپ حقیقت کو بھی پیشِ نظر رکھیے کہ دیوبندی علما کی اکثریت نے پاکستان کے قیام کی ہی مخالفت کی تھی۔ لیکن قیامِ پاکستان کے بعد وہ نہ صرف اس کے شہری بن گئے بلکہ رہنما بھی قرار پائے، کیوں کہ وہ بھی سُنّی تھے اور ریاست بھی سُنّی ہو چکی تھی۔ اس کے برعکس شیعہ اور قادیانی، جنہوں نے تحریکِ پاکستان میں حصہ لیا تھا، انہیں سرے سے پاکستانی ہی تسلیم نہیں کیا گیا، کیوں کہ پاکستان ایک سُنّی ریاست قرار پاچکا تھا۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اختیار کے حصول اور اس سرزمین کی شناخت کے تعین کی کوششیں ہی اس مسئلے کی بنیاد ہیں۔

پاکستان کے موجودہ مسائل کا حل تلاش کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے یہاں جاری تشدد میں ہر ممکن حد تک کمی لائی جائے۔ ریاست کو اس بارے میں سنجیدہ ہونا ہوگا۔ تشدد کے خاتمے کے لیے قومی اتفاقِ رائے تشکیل دینا ہوگا جو میری رائے میں اس وقت عنقا ہے۔ میرا ایک عرصے سے پاکستان آنا جانا ہے اور مجھے ان دوروں کے دوران اس بارے میں بہت سے شکوے شکایتیں سننا پڑتی ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ملک میں جاری تشدد کے خلاف تاحال کوئی قابلِ ذکر مزاحمت پیدا نہیں ہو سکی ہے۔ سب سے پہلے تو آپ کو اس تشدد کو روکنا ہوگا اور پھر سوچنا ہوگا کہ

معاشرے کے بکھرے ہوئے تار و پود کو پھر سے کس طرح سمیٹا اور جوڑا جائے۔

سوال: عام تاثر ہے کہ سعودی عرب اور ایران پاکستان میں اپنی 'پراکسی' لڑائی لڑ رہے ہیں۔ آپ کے خیال میں یہ تاثر کتنا درست ہے اور مشرقِ وسطیٰ میں جاری فرقہ وارانہ کشید گی سے پاکستان پر کیا اثر پڑ رہا ہے؟

ولی نصر: ایران اور سعودی عرب نے پاکستان میں اپنی پہلی 'پراکسی' لڑائی ۱۹۸۰ء کی دہائی میں لڑی تھی جس میں، میری رائے کے مطابق، سعودی عرب فاتح رہا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان میں سرگرم ایران کے حمایت یافتہ عناصر کا اُن عناصر سے کوئی مقابلہ ہی نہیں، جنہیں سعودی عرب کی آشیر باد حاصل ہے۔ میری رائے میں پاکستان میں جاری فرقہ وارانہ کشید گی میں ایک اہم کردار سعودی عرب اور ایران کی اس سرمایہ کاری کا بھی ہے جو یہ دونوں ملک ماضی میں پاکستان میں فرقہ واریت کو فروغ دینے والے مدارس اور تنظیموں کے قیام اور نظریات کو فروغ دینے کے لیے کرتے رہے ہیں۔ میرے خیال میں پاکستان بھی آج کل وہی کچھ بھگت رہا ہے، جو عراق، لبنان اور شام بھگت چکے ہیں۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ پاکستان اور افغانستان میں ایک بار پھر فرقہ وارانہ کشید گی اور 'پراکسی' جنگ کا میدان گرم ہونے کا امکان موجود ہے۔ لیکن ایسا ہونا آسان نہیں ہو گا کیوں کہ اب پاکستان اپنے مسائل کو اپنے تئیں حل کرنے کا اہل ہو چکا ہے۔ اس لیے ایران کی جانب سے پاکستان کے اندرونی معاملات میں کھلی مداخلت کا امکان اب بہت کم ہے۔ خود ایرانی حکومت کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی ہے کہ پاکستان میں آباد شیعوں کے تحفظ کی ذمہ داری اس پر نہیں بلکہ پاکستانی حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ ایرانی حکومت یہ ذمہ داری اپنے سر لینے پر آمادہ نہیں اور چاہتی ہے کہ پاکستان اس مسئلے سے خود نبٹے۔

لیکن اگر مشرقِ وسطیٰ کی صورتِ حال مزید ابتر ہوئی تو پاکستان کو لازماً اس کے منفی اثرات بھگتنے پڑیں گے۔ کیوں کہ پاکستان کے اسلام پسند عناصر مشرقِ وسطیٰ کی صورتِ حال پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں اور وہاں جو کچھ ہو رہا ہے، اس سے خود کو متعلق سمجھتے ہیں۔ لہٰذا یہ ممکن ہے کہ دولتِ اسلامیہ (داعش) کے پُر تشدد نظریات کو پاکستان میں بھی کچھ حمایت میسر آ جائے جس سے لازمی طور پر یہاں فرقہ وارانہ کشید گی بڑھے گی۔

مذہبی و فرقہ وارانہ منافرت کیسے ختم ہو سکتی ہے؟

خورشید ندیم

مسلکی و فقہی اختلافات ایک منطقی چیز ہے جوکہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جب یہ اختلافات انتشار اور تصادم کا باعث بنتے ہیں تو اسے عموما فرقہ واریت کا نام دیا جاتا ہے۔اورفرقہ واریت پاکستان میں ایک ایسا مسئلہ ہے جسے ہر خاص و عام حل کرنا چاہتا ہے کیونکہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اس نے لوگوں کو تقسیم کیا ہے اور باہمی طور پر رنجدیگیاں پیدا کی ہیں۔ لیکن یہ مسئلہ عملاً حل ہونے کی بجائے زیادہ پیچیدہ ہوا ہے۔ تاریخ میں اس کی کیا حیثیت ہے اور اس مسئلے کو کن خطوط پہ حل کیا جاسکتا ہے، زیرنظر مضمون میں اسی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ مضمون روزنامہ 'دنیا' میں شائع ہوا۔مصنف پاکستان میں سماجیات کے چنیدہ ماہرین میں سے ایک ہیں۔ادارہ تعلیم و تحقیق کے سربراہ ہیں اور کئی کتب کے مصنف ہیں۔

مذہب کے عنوان سے فساد ایک مسلمہ حقیقت ہے۔تاہم دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو فساد کا علم بردار ہو۔ ہر مذہب کی تعلیمات میں اعلیٰ انسانی اخلاق کو اساس بنایا گیا ہے اور مذہبی تجربے کا حاصل اخلاقی تطہیر کو قرار دیا گیا ہے۔جب لوگ ایک طرف مذہب کی تعلیمات کو پڑھتے اور دوسری طرف اہلِ مذہب کے رویے کو دیکھتے ہیں تو انہیں بُعد المشرقین دکھائی دیتا ہے۔اس پسِ منظر میں اس سوال کا پیدا ہونا فطری ہے کہ اگر مذہب خیر کا علم بردار اور امن کا پیامبر ہے تو پھر انسانی تاریخ میں مذہب کے نام پر فساد کیوں برپا رہا؟

عالمی سیاسی تناظر ہی میں نہیں، یہ سوال ایک معاشرے کے داخلی ساخت کے حوالے سے بھی اٹھتا ہے۔مشاہدہ یہ ہے کہ ایک مذہب کے ماننے والے کئی گروہوں میں بٹ جاتے ہیں اور پھر ان کے مابین بھی ایسا ہی اختلاف پیدا ہو جاتا ہے کہ جو فساد کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔اسے فرقہ واریت، مسلکی تقسیم کا نام دیا جاتا ہے۔فرقہ واریت نے معاشروں کو کمزور کیا اور اس سے خود مذہب کے بارے میں سوالات اٹھنے لگے۔اسی تجربے کی کوکھ سے اس خیال نے جنم لیا کہ مذہب کو ریاست و

معاشرت سے بے دخل کرنے ہی میں عافیت ہے۔ اس نقطۂ نظر کو قبول کیا جا سکتا تھا مگر انسانی تجربہ یہ بتاتا ہے کہ انسان کی روحانی بالیدگی اور تطہیر کے لئے مذہب نے ہمیشہ ایک مثبت کردار ادا کیا ہے۔ مذہب کو لاتعلق کر دینے سے انسانی معاشرہ ایک بڑی خیر سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس لئے یہ بات اہم ہے کہ مذہبی منافرت کے مسئلے کو صحیح تناظر میں سمجھا جائے۔ اس مضمون میں اس سوال کو اسلام اور مسلم معاشرے کے تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔

مسلم تاریخ میں دو طرح کے اختلافات پیدا ہوئے۔ ایک کی بنیاد وہ سیاسی تنازعات تھے جو اسلام کے صدرِ اوّل ہی میں نمودار ہو گئے۔ دوسرے اختلافات وہ ہیں جن کا تعلق بنیادی مذہبی ماخذات کی تعبیر و تفہیم سے ہے۔ اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں جو اہم حادثات ہوئے، ان میں سیاسی اختلافات کا کردار بنیادی تھا۔ مثال کے طور پر سیدنا عثمان کی شہادت کے محرکات سیاسی تھے۔ اس کے بعد اسلامی ریاست میں ایک خلفشار پیدا ہوا جو تدریجاً بڑھتا چلا گیا۔ سیاسی نقطہ ہائے نظر کا یہ اختلاف اتنا بڑھا کہ ان کی بنیاد پر مسلمانوں میں باقاعدہ فرقے وجود میں آ گئے۔

دوسرا اختلاف دین کے مصادر کی تفہیم میں ہوا۔ یہ اختلاف بھی ابتداء ہی سے موجود تھا۔ قرآن مجید کی آیات کو سمجھنے میں ایک سے زیادہ آراء سامنے آئیں اور اسی طرح رسالت مآب ﷺ کے ارشادات کی تفہیم میں بھی اختلاف ہوا۔ اگر آج قدیم تفاسیر کا مطالعہ کیا جائے تو ایک آیت کی تفسیر میں متعدد اقوال ملتے ہیں۔ بعض آیات کے ذیل میں ایک صحابی کی تفسیر دوسرے صحابی سے مختلف ہے۔ ابتداء میں اس اختلاف کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی۔ بعد کے ادوار میں یہ اختلاف بڑھ گیا۔ علمی سرگرمی کے طور پر امت کے چند جیّد اور بڑے علماء نے مصادرِ دین سے استنباط کے اپنے اپنے اصولوں کو مدوّن کر دیا اور ان پر ان کے بہت سے ہم خیال بھی پیدا ہو گئے۔ یوں مسلمانوں میں باضابطہ طور پر مسالک وجود میں آئے۔

سیاسی اختلاف کی بنیاد پر جو فرقہ واریت پیدا ہوئی، اس نے مسلمانوں کی سیاسی قوت کو نقصان پہنچایا اور ان کے مابین وہ وحدتِ فکر و عمل باقی نہ رہی جو ان کو متحد رکھ سکتی تھی۔ بنو امیہ اور بنو عباس کے اختلاف کے باعث مسلم سماج خانہ جنگی کی کیفیت سے دوچار رہا، جس کا مسلمانوں کو نقصان

ہوا۔اس کا ایک ناگزیر نتیجہ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کا خاتمہ تھا۔ سقوطِ بغداد کے بعد بھی اگرچہ مسلمانوں کی حکومت بعض علاقوں میں قائم رہی، لیکن ان کا وہ رعب اور دبدبہ باقی نہیں رہا جو ایک عالمی قوت ہونے کے ناتے انہیں پہلے حاصل تھا۔

یہ بات انتہائی اہم ہے کہ ابتدائی صدیوں میں مسلکی اختلاف سے مسلمانوں کو زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ابتداء میں لوگ ایک دوسرے سے علمی اختلاف کرتے تھے لیکن اسے فطری سمجھتے تھے اور ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ مسلکی اعتبار سے شوافع اور احناف کا اختلاف مشہور ہے۔اس کے باوجود دونوں مسلکوں کے علماء ایک دوسرے سے محبت کا تعلق رکھتے تھے۔امام شافعی کا مشہور واقعہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ امام ابو حنیفہ کی قبر پر گئے اور وہاں انہوں نے فجر کی نماز پڑھی۔ شوافع فجر کی نماز میں دعائے قنوت پڑھتے ہیں، لیکن امام شافعی نے وہاں دعائے قنوت نہیں پڑھی۔ کسی نے سوال کیا کہ کیا آپ نے اپنا مسلک چھوڑ دیا۔ان کا جواب تھا "نہیں"۔ مجھے صاحبِ قبر (امام ابو حنیفہ) سے حیا آ گئی۔یعنی میں نے ان کے مسلک کے احترام میں دعائے قنوت نہیں پڑھی۔

اس اختلاف کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی علمی روایت آگے بڑھی۔ قرآن مجید پر غور و فکر کے دروازے کھل گئے اور لوگوں نے مختلف زاویوں سے اللہ کی کتاب کو سمجھا۔یہی معاملہ اللہ کے رسول ﷺ کی سنت و حدیث کا بھی رہا۔اس اختلاف کی وجہ سے مسلمانوں کی علمی روایت مستحکم ہوئی۔

اور اسلام میں اجتہاد کا اصول مستحکم ہوا۔اس نے اسلام کی آفاقیت کو واضح کیا اور یہ بات ایک علمی حقیقت کے طور پر قبول کی گئی کہ اسلام ہر دور کے تقاضوں کے مطابق اور قابلِ عمل ہے۔تاہم بعد میں ایسے لوگ آئے جنہوں نے ان بزرگوں کی رائے اور تفہیم کو حتمی سمجھا اور ان سے اختلاف کرنے والوں کو گمراہ قرار دیا۔ اجتہاد کی جگہ تقلید نے لے لی۔ لوگوں نے حَنَفیت اور شافعیت پر مورچے لگا لئے۔ برصغیر میں بھی اس کے اثرات مرتب ہوئے اور یوں وہ مسلکی اختلاف جو دینی ماخذات کی تعبیر کے حوالے سے پیدا ہوا، اور فطری تھا، اس نے مسلک کی بنیاد پر لوگوں کو تقسیم کر دیا۔

آج صورتِ حال یہ ہے کہ وہ اختلاف جو تاریخی اعتبار سے سیاسی امور میں واقع ہوا، اس کی بنیاد پر مستقل فرقے وجود میں آ چکے ہیں۔ اسی طرح وہ اختلاف جو ماخذات کی تعبیر میں تھا اور فطری تھا، اسے بھی فطری دائرے سے نکال کر ایک مذہبی شناخت بنا لیا گیا ہے۔ اس کے نتیجے میں مذہبی منافرت پیدا ہوئی جس نے مسلم سماج کو منقسم کر دیا۔ اس سے نجات ممکن ہے اگر ان اختلافات کا صحیح تناظر واضح ہو اور عصری مسائل کے حل کو لمحۂ موجود کی دانش کی روشنی میں حل کیا جائے۔ اس ضمن میں، چند ایسے اقدامات تجویز کئے جا سکتے ہیں جو مذہب کی اصل حیثیت کو بحال کرتے ہوئے اسے سماجی تعمیر میں معاون بنا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر:

☆ تاریخ کے باب میں اختلاف کو ایک علمی سرگرمی کے طور پر محدود کر دیا جائے۔ یہ اہلِ علم کے ہاں تو زیرِ بحث رہے، گلی اور بازار کا موضوع نہ بنے۔

☆ ان سیاسی و سماجی مسائل کے حل کو، جن کا تعلق مذہب سے ہے، اجتماعی دانش کے سپرد کر دیا جائے۔ خوش قسمتی سے ہمارے ملک میں ایسے ادارے قائم ہو چکے ہیں، جہاں سب مسالک کے لوگ مل بیٹھ کر رائے قائم کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلامی نظریاتی کونسل، وفاقی شرعی عدالت۔ ان کو زیادہ سے زیادہ موثر اور نمائندہ بنانا چاہیۓ۔ سماجی سطح پر بھی ایسے ادارے بنائے جائیں۔

☆ ہماری دینی تعلیم مسلکی بنیادوں پر کھڑی ہے۔ مثالی حل تو یہی ہے کہ اس کی تشکیلِ نو ہو۔ تاہم جب تک ایسا نہیں ہوتا، مسلکی ہم آہنگی کو مدارس کے نصاب کا حصہ بنایا جائے اور اس بات کی تعلیم دی جائے کہ مصادر کی تفہیم اور فقہی مسائل میں ایک سے زیادہ آراء کی موجودگی فطری ہے۔ یہ پہلے بھی موجود تھی اور اسے قبول کرنا چاہیۓ۔

☆ ہر مسلک کا دار الافتاء ہو جہاں دین کے جید علما رائے دیں۔ انہیں آزادی ہو کہ وہ شخصی معاملات میں اپنے مسلک پر عمل کریں۔

☆ معاشرتی سطح پر بین المذاہب ہم آہنگی کے لئے بلدیاتی اداروں کی سطح پر ادارے بنائے جائیں۔ ایک

دوسرے کی تقریبات میں شرکت کو فروغ دیا جائے۔

☆میڈیا میں مذہبی تعلیمات پر سنجیدہ پروگرام ہوں جن میں بتایا جائے کہ کس طرح تمام مذاہب فرد کی اخلاقی تطہیر کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔

مذہبی منافرت کا خاتمہ اسی وقت ممکن ہے جب ریاست اور معاشرہ دونوں،اس حوالے سے اپنی ذمہ داری محسوس کریں۔جب شہری قانون کے دائرے سے تجاوز کریں۔ریاست قانون کے نفاذ سے فساد کو روک سکتی ہے۔معاشرہ نظامِ اقدار اور سماجی رویوں کی تطہیر سے مذہب کے تعمیری کردار کو نمایاں کر سکتا ہے۔

مذہبی و سماجی وحدت کے لئے مسجد و مدرسے کا کردار

خورشید ندیم

ہر ملک کے اندر کچھ سماجی ادارے ہوتے ہیں جن کا کام براہ راست عوام کے ساتھ ربط اور ان کی اخلاقی تربیت کرنا ہوتا ہے اور مختلف مختلف اکائیوں کے مابین ہم آہنگی بھی پیدا رکھتے ہیں۔ پاکستان میں جو سماجی ادارے ہیں ان میں مسجد اور مدرسہ کا کردار بہت اہم ہیں۔ ان کی تعداد تو بہت زیادہ ہے لیکن اس کے ساتھ ہی معاشرے میں شدید تقسیم بھی موجود ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مسجد و مدرسے نے اپنا اصل کردار بھلا دیا ہے جو انہیں ادا کرنا تھا اور جو ایک تاریخی روایت رہی ہے۔ مصنف اس مضمون میں معاشرتی وحدت کے قیام کے لیے مسجد و مدرسے کے کردار پر گفتگو کرتے ہیں۔ یہ مضمون روزنامہ 'دنیا' میں شائع ہوا۔

مسجد اور مدرسہ مسلم معاشرت کے اہم مظاہر ہیں۔ صدیوں کا تعامل جس نے مسلم تہذیب کو ایک منفرد حیثیت بخشی، اس میں مسجد اور مکتب کو مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ آج بھی جہاں مسلمانوں کے چند گھر آباد ہوتے ہیں، وہ سب سے پہلے مسجد کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔

ابتدا ہی سے مسلم نفسیات کی تشکیل جن خطوط پر کی گئی، ان میں ان اداروں کا کردار بنیادی تھا۔ رسالت مآب ﷺ جب تک مکہ میں رہے، بیت اللہ سے آپ کا تعلق قائم رہا، باوجود اس کے کہ اللہ کا یہ گھر شرک کا مرکز بنا دیا گیا تھا۔ مدینہ تشریف لانے کے بعد آپ ﷺ نے جس عمارت کی تعمیر کو اولیت دی، وہ مسجد ہی تھی۔ ساتھ ہی اصحابِ صفہ کے لئے چبوترہ بھی قائم ہو گیا جہاں درس وتدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ غیر محسوس طریقے سے، مسلمانوں کو یہ تعلیم دی جا رہی تھی کہ ایک مسلم معاشرے کے امتیازی خواص کیا ہوتے ہیں۔ یہ تعلیم مسلمانوں کے شعور ہی نہیں، لاشعور کا بھی حصہ بن گئی۔ آج مسجد کے بغیر مسلم معاشرت کا تصور قابل فہم نہیں۔

مذہب کا بنیادی کام انسان کا اخلاقی تزکیہ ہے۔ تزکیہ دو امور سے عبارت ہے: اللہ کے ساتھ

تعلق اور انسانوں کے ساتھ تعلق۔ تزکئے کی پہلی ضرورت علم کا تزکیہ ہے۔ اگر اللہ اور بندوں کے ساتھ تعلق کی درست تفہیم نہیں ہو گی تو ان کے حقوق کا صحیح ادراک اور احساس بھی نہیں ہو گا۔ اس لئے مسجد اور مدرسے کا وجود ناگزیر ہے۔ یہ ادارے دونوں کام بیک وقت کرتے ہیں۔ مسجد میں جہاں اللہ کی عبادت ہوتی ہے، وہاں ایک دوسرے کے احوال سے واقفیت بھی پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح مدرسے سے جو تعلیم ملتی ہے، وہ محض تعلیم نہیں ہوتی بلکہ تربیت اس کا لازمی حصہ ہے۔

قرآن مجید نے بتایا ہے کہ مسجد اللہ کے لئے ہوتی ہے (سورہ جن: ۱۸)۔ گویا مسجد کا انتساب کسی فرد کے نام نہیں ہے۔ اسی لئے جو مسجد انسانوں یا گروہوں سے منسوب ہونے لگے یا جہاں لوگوں کو داخل ہونے سے روکا جائے، وہ ایک عمارت تو ہو سکتی ہے، اللہ کا گھر نہیں ہو سکتا۔ قرآن مجید میں کہا گیا: "اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہو گا جو اللہ کے معبدوں میں اس کے نام کی یاد سے روکے اور ان کی ویرانی کے درپے ہو۔ ایسے لوگ اس قابل ہیں کہ ان عبادت گاہوں میں قدم نہ رکھیں اور اگر وہاں جائیں بھی تو ڈرتے ہوئے جائیں۔" (سورۃ البقرہ ۱۱٤)۔ قرآن مجید نے اس بات کا تذکرہ یہود ونصاریٰ کی کشمکش کے تناظر میں کیا ہے۔ دونوں کا قبلہ بیت المقدس تھا۔ نصاریٰ نے، ایک رائے یہ ہے کہ سیدہ مریم کے مقامِ اعتکاف کی رعایت سے مشرق کو قبلہ ٹھہرایا اور یہود نے ان کی ضد میں مغرب کی طرف رخ کر لیا۔ اس کے نتیجے میں ایک کشمکش نے جنم لیا اور دونوں نے ایک دوسرے کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کی۔

یہود ونصاریٰ کی اس کشمکش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، مسجد کی سماجی حیثیت کے بارے میں ابتدا ہی سے واضح کر دیا گیا کہ یہ اللہ کے لئے ہے اور اسے کسی ایک گروہ سے منسوب کر کے، اس کے دروازے کسی دوسرے گروہ پر بند نہیں کئے جا سکتے۔ رسالت مآب ﷺ کا معاملہ تو یہ تھا کہ جب نجران کے مسیحیوں کا وفد آپ سے ملنے آیا اور انہوں نے اپنی عبادت کے وقت یہ چاہا کہ مسجدِ نبوی سے باہر عبادت کریں تو آپ نے انہیں اجازت دی کہ وہ مسجد کے اندر ہی اپنی عبادت کریں۔ اس طرح آپ ﷺ نے اپنے طرزِ عمل سے بتایا کہ مسجد اللہ کی عبادت کے لئے ہے اور یہ خدا کے نام پر لوگوں کو جمع کرتی ہے۔

یہی معاملہ مدرسے کا بھی ہے۔ علم کا دروازہ کسی کے لئے بند نہیں کیا جا سکتا۔اسی کے ساتھ مسلم روایت یہ بھی ہے کہ علم صرف معلومات جمع کرنے کا نام نہیں بلکہ علم وہی ہے جو انسان کا اخلاقی تزکیہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ ہمیشہ علمِ نافع کی دعا کرتے تھے۔ تربیت کو درس وتدریس کا لازمی حصہ سمجھنے کی وجہ سے مسلمانوں میں مدرسے کا جو تصور قائم ہوا،اس میں مدرسہ ایک تربیت گاہ تھا جہاں ایک طالب علم کو عام ماحول سے الگ کرکے،اس کی شخصیت سازی کی جاتی تھی۔اسی سبب سے مسلمانوں میں مدرسے کو جن خطوط پر استوار کیا گیا،ہاسٹل اس کا لازمی حصہ تھا۔ گویا طالب علم اور استاد کا رشتہ محض چند گھنٹوں کا نہیں ہوتا تھا بلکہ پورے دن کا ہوتا تھا اور اس میں بہت سی غیر نصابی سرگرمیاں بھی شامل تھیں جن میں عبادت اور اخلاقی تزکیہ کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔

سوال یہ ہے کہ اگر مسجد اور مدرسہ تعلیم، تزکیہ اور تربیت کے مراکز ہیں تو کیا وجہ ہے کہ آج مذہبی انتہا پسندی اور فرقہ واریت جیسے سماجی عوارض کا انتساب ان کے نام ہے؟ مساجد کیوں مسالک سے منسوب ہو گئی ہیں؟ ہمیں مساجد کے باہر ایسے ہدایت نامے کیوں آویزاں دکھائی دیتے ہیں جن میں دوسرے مسالک کے لوگوں کو داخل ہونے سے روکا جاتا ہے؟ ہمیں ان سوالات کا جائزہ تاریخی تناظر میں لینا ہوگا۔

روایتی طور پر مدرسہ ،مسجد اور خانقاہ میں گہرا رشتہ قائم تھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ مدرسہ علم، مسجد عبادت اور خانقاہ تزکیہ کی علامات تھیں۔ مسلم تہذیبی روایت میں تینوں ایک دوسرے سے الگ نہیں تھیں۔ علم، عبادت اور تزکیہ بیک وقت انسانی شخصیت کی تعمیر کرتے تھے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی دارالعلوم دیوبند کے بانی تھے۔انہوں نے روحانی واخلاقی ترقی کے لئے بطورِ خاص حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے تعلق قائم کرنا چاہا جو دینی علوم کے ماہر یا کوئی باضابطہ عالم نہیں تھے۔جب لوگوں نے ان سے کہا کہ ان جیسے جید عالم کو کسی ایسے فرد کے پاس نہیں جانا چاہئے جو دینی علوم میں رسوخ نہ رکھتا ہو تو ان کا کہنا تھا: "میں عالم ضرور ہوں مگر مجھے عمل کا ذوق حاصل نہیں ہو سکا۔ میں اسی ذوقِ عمل کے حصول کے لئے حاجی صاحب کے قریب ہوا ہوں۔"

ہمارے ہاں بدقسمتی سے علم، عبادت اور تزکئے کی یہ یک جائی باقی نہیں رہی۔ وہ مراکز جنہیں

معاشرے کو وحدت، حسنِ خلق اور حقوق کا پیغام دینا تھا، وہ اپنی اس ذمہ داری کو فراموش کر بیٹھے۔اس کا ناگزیر نتیجہ یہ ہے کہ آج یہ مراکز تو موجود ہیں مگر ان میں وہ روح نہیں جو ماضی میں ان کے اندر جاری وساری تھی اور اگر کہیں استثناء ہے تو ان کی برکات کو آج بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔

آج اگر مسجد و مدرسہ اپنے روایتی کردار کی طرف لوٹ جائیں تو یہ معاشرے میں ایک بار پھر مذہبی وحدت اور اخلاقی تربیت کے مراکز بن سکتے ہیں۔اس کردار کے احیاء کے لئے چند اقدامات ناگزیر ہیں:

۱۔ مسجد اور مدرسے کے مابین گہرا تعلق ہے۔ بالعموم ایک مدرسے کا فارغ التحصیل ہی کسی مسجد کا امام یا خطیب ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں دینی مدارس مسلک کی بنیاد پر قائم ہیں۔جب ان کا تعلیم یافتہ کسی مسجد کا انتظام سنبھالتا ہے تو مسجد ایک ناگزیر نتیجے کے طور پر اس مسلک کی نمائندہ بن جاتی ہے۔یوں مسجد کا وہ کردار مجروح ہوتا ہے جو قرآن مجید نے بیان کیا ہے کہ وہ اللہ کے لئے ہیں۔اس لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہمارے ہاں دینی تعلیم کے اداروں کی تشکیلِ نو ہو۔اس کا مطلب یہ ہے کہ وہاں سب مسالک کی علمی روایات سے آگاہی پیدا کی جائے اور اختلاف کے آداب کو مدرسے کی تعلیم کا حصہ بنایا جائے۔

۲۔ مدرسہ اور خانقاہ کے ٹوٹے ہوئے رشتے کو جوڑا جائے۔اس کا مفہوم یہ ہے کہ تزکیہ نفس دینی علوم کا ناگزیر حصہ ہو، تا کہ یہاں کا فارغ التحصیل جب کسی مسجد میں جائے تو اسے اخلاقی تربیت، عبادت اور بھائی چارے کا مرکز بنائے۔اسے معلوم ہو کہ مسجد اللہ کے لئے ہوتی ہے اور اس کے دروازے اللہ کے بندوں پر بند نہیں ہو سکتے۔اس مقصد کے حصول کے لئے مدرسے کے ماحول کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔

۳۔ مساجد کے نظم کو بھی کسی سماجی بندوبست کے تابع کرنا ضروری ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر مسجد کمیٹی ہوتی ہے جو مسجد کا انتظام سنبھالتی ہے۔اس کو بامعنی اور مزید بہتر بنانا لازم ہے۔اس کا کام صرف یہ نہیں ہونا چاہئے کہ وہ مسجد کی عمارت، پانی کی فراہمی وغیرہ کا خیال

رکھے بلکہ وہ یہ بھی دیکھے کہ مسجد کسی مسلک کی خدمت کر رہی ہے یا اللہ کے بندوں کے لئے عبادت اور وحدت کا مرکز ہے۔

۴۔ حکومت کو بھی وزارتِ مذہبی امور میں ایک شعبہ قائم کرنا چاہیۓ جس کا کام مساجد کا انتظام و انصرام ہو۔ یہ شعبہ مساجد کمیٹیوں سے رابطے میں رہے۔ اس ضمن میں ترکی میں قائم ادارے 'دیانت' کے تجربے سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

۵۔ آئمہ اور خطباء کے لئے خصوصی تربیتی ورکشاپس کا اہتمام ہو جس میں انہیں نئے موضوعات اور سماجی ضروریات کے بارے میں آگاہ کیا جائے۔ ان ورکشاپس میں دوسرے مسلمان ممالک سے لوگوں کو مدعو کیا جائے جو بتائیں کہ ان ملکوں میں مسجد اور مدرسہ کیا کردار ادا کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر انڈونیشیا میں مدرسے کی ایک بہت مضبوط روایت موجود ہے جس سے استفادہ کیا جانا چاہیۓ۔ وزارتِ مذہبی امور کو یہ کام سونپا جاسکتا ہے۔

ایک مسلم سماج اپنی بنیادی مذہبی ضروریات سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ مسجد و مکتب، گویا اس کی تہذیبی شناخت کے ناگزیر عناصر ہیں۔ اگر ہم ان کے روایتی اور تاریخی کردار کا احیاء کر سکیں تو معاشرے کی اخلاقی قوت میں بے پناہ اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ تعلیم اور رابطے کے فطری ادارے ہیں۔ ان کے ذریعے جس طرح وحدت اور بھائی چارے کا پیغام عام ہو سکتا ہے، کسی دوسرے ذریعے سے ممکن نہیں۔ مسجد دن میں پانچ بار ایک محلے میں رہنے والوں کو اکٹھا کرتی ہے۔ جمعہ کو ایک بڑے اجتماع کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اگر لوگ اس اجتماع کو باہمی غلط فہمیوں کی دوری اور ایک دوسرے کی مدد کے لئے استعمال کریں تو کسی دشمن کو یہ موقع نہ ملے کہ وہ ہمارے معاشرے میں مذہبی یا کسی اور طرح کی منافرت پھیلا سکے۔ مسجد اور مدرسے کی بنیاد پر ہم ایک مستحکم معاشرہ قائم کر سکتے ہیں جو ایک مضبوط ریاست کے لئے ناگزیر ہے۔

لازم ہے کہ ان اداروں کے احیاء کے لئے سماجی سطح پر مکالمہ ہو اور یہ ادارے وحدت کے مراکز بنیں۔

مذہبی آزادی میں حائل رکاوٹیں اور فرقہ واریت

ڈاکٹر سید محسن نقوی

فرقہ واریت صرف مسلکی اختلاف کی شدت کی صورت میں ہی سامنے نہیں آتی بلکہ یہ کئی حوالوں سے معاشرے کو تفریق اور انتشار کا شکار بناتی ہے۔ اسی کے ہی بطن سے تکفیر نے بھی جنم لیا۔ یہ مسئلہ آج کا نہیں ہے، نہ صرف ہمارے معاشرے کا مسئلہ ہے۔ اس کی تاریخی جڑیں ہیں جن کو کھولنے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ عنصر کس قدر خطرناک ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے مسلکی تقسیم، اس کی تاریخی بنیادوں اور تکفیر کے عوامل پر کلام کیا ہے جو عصرحاضر کی فرقہ وارانہ شکلوں کی تفہیم میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ڈاکٹر سید محسن نقوی آغاخان یونیورسٹی میں پروفیسر، اسلامی نظریاتی کونسل کے سابق رکن اور تاریخ و علم الکلام کے جید عالم ہیں۔کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور رواداری ومکالمہ کے نقیب ہیں۔

مسلمان اور غیر کا تصور

مسلکی فرقہ واریت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اسلامی تعلیمات کے تناظر میں ‘‘مسلمان اور غیر’’ کے تصورات کو واضح طور پر سمجھ لیا جائے کیوں کہ فرقہ دراصل مسلمانوں کے اندر ہی ’غیر‘ قرار دینے سے وجود میں آتا ہے، جب ’غیر‘ کا تصور انتہاء و شدت اختیار کرتا ہے تو تکفیریت جنم لیتی ہے۔ ضروریات دین کی دو قسمیں ہیں اول عقائد کے اعتبار سے توحید، نبوت، معاد، ملائکہ، قرآن مجید، ختم نبوت، دوم عبادات کے اعتبار سے نماز قائم کرنا، زکاۃ اداء کرنا، ماہ صیام کے روزے رکھنا، حج بیت اللہ شریف کرنا، جہاد کے وقت شرعی اجازت سے جہاد کرنا شامل ہیں۔اسی میں ایک اہمیت اسلامی قواعد کے مطابق ذبیحہ کرنا اور قبلہ رخ ناز اداء کرنا بھی ہے۔اس ضمن میں دو نصوص شرعی ملاحظہ ہوں۔

۱۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ

مِنْ قَبْلُ-وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓىِٕكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا۔[1]

ترجمہ: "اے ایمان لانے والو! ایمان لے آؤاللہ پر، اوراس کے رسول پر، اوراس کتاب پر جو س نے اپنے رسول پر اتاری ہے اور ہر اس کتاب پر جو وہ نازل کر چکا؛ اور جس نے انکار کیا اللہ کا، اس کے ملائکہ کا، اس کی کتابوں کا، اس کے رسولوں کا، اور یوم آخرت کا وہ بہت ہی زیادہ گمراہ ہے"۔ یہ سب عقائد متعدد مقامات پر قرآن مجید میں بیان ہوئے ہیں جس پر ایمان لانا ضروری ہے۔

٢۔عن أنس بن مالك، قال، قال رسول الله ﷺ من صلى صلاتنا، و استقبل قبلتنا، وأكل ذبيحتنا، فذلك المسلم الذى له ذمة الله و ذمة رسوله، فلا تخفروا الله في ذمته۔ [2]

ترجمہ: جس نے ہماری طرح نماز پڑھی، اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کیا، اور ہماری طرح کا ذبیحہ کھایا پس وہ مسلمان ہے اور اس کے ذمہ دار اللہ اور اس کے رسول ہیں، پس تم اس کے عہد کو نہ توڑو۔

ایک اور حدیث صحیح میں ہے کہ:

عن أنس بن مالك، قال، قال رسول الله ﷺ أمرت أن أقاتل الناس حتى يقولوا لا إله إلا الله، فإذا قالوها ، و صلوا صلاتنا، واستقبلوا قبلتنا، و ذبحوا ذبيحتنا، فقد حرمت علينا دمائهم، و أموالهم إلا بحقهاو حسابهم على الله۔ [3]

ترجمہ: رسول اللہ صلی اللہ ولیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے لوگوں سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے یہاں تک کہ وہ یہ اقرار نہ کرلیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، پھر جب وہ یہ اقرار کرلیں اور ہماری طرح نماز ادا کریں، ہمارے قبلے کی طرف منہ کریں، اور ہماری طرح ذبیحہ کریں تو ہم مسلمانوں پر ان کا خون بہانا اور ان کے اموال پر قبضہ کرنا حرام ہے، مگر یہ کہ اسے حق کے ساتھ انجام دیا گیا ہو، نیز ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔(یعنی کسی کے قصاص میں قتل کیے جائیں یا مال میں سے دیت یا دیگر وجوہ

---

1 النساء:136

2 الألباني، الصحیحۃ، ٣٥٦٥، البخاري، ٣٩١، صحیح النسائی، للألبانی، ٥٠١٢، ٣٩٩٧

3 البخاری، ٣٩٢، البیهقی، ٢:٣، المقدسی، صحاح الأحادیث، ٣١٠٢٠، ج٨، ص ١٦٣

شرعیہ اداء کیے جائیں)

یہ صحیح احادیث ان لازمی امور کو بیان کر رہی ہیں جن کے بغیر ایک انسان مسلمان نہیں ہو سکتا، نیز یہ کہ ان شرائط کے پائے جانے کے بعد کوئی امر انسان کو دائرہ اسلام سے باہر نہیں کرتا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ''مسلمان'' وہ ہے جو اس اعتقادی اور عملی دائروں کے اندر رہے۔

فرقہ وارانہ تقسیم کی بنیاد

فرقہ وارانہ تقسیم کی بنیادی وجہ ان دوائر کو پھیلا کر ان میں ان باتوں کو شامل کر لینا ہے جن کو یہ دائرے شامل ہی نہیں ہیں۔اس روش کو پروان چڑھانے میں ان کتابوں نے بھی حصہ لیا ہے جو گزشتہ ایک ہزار سالہ اسلامی تاریخ میں فرق ہائے اسلامیہ کے تذکروں پر لکھی گئی ہیں۔ان کتابوں کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ معمولی اختلافات کو ایک نئے فرقے کا نام دے دیا گیا خواہ ان کا کوئی نظام عقائد و عمل موجود ہو یا نہ ہو۔خاص طور پر امام ابوالحسن اشعری کی کتاب مقالات الاسلامیین اور اسماعیلی مصنف شہرستانی کی الملل والنحل، نوبختی کی فرق الشیعہ، بغدادی کی الفرق بین الفرق، اس ضمن میں نمائندہ کتابیں ہیں۔بناء برایں بعد کے تذکرہ نویسوں نے اسی روایت کو آگے بڑھایا اور یوں مزید فرقے فہرست میں شامل ہوتے گئے۔اور شرعی معنوں میں ہر فرقے نے دوسرے فرقے کو اپنا غیر مان لیا۔ان فرقوں نے جن مسائل کی وجہ سے دوسروں کو غیر مانا وہ یا تو عقائد سے متعلق تھے یا پھر اعمال کی انجام دہی میں فروعی اختلافات سے۔یہ اختلافات اتنے معمولی ہیں کہ ان کی بناء پر کوئی مسلمان دائرہ اسلام سے خارج تصور نہیں ہو سکتا اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ جس آیہ مبارکہ اور جن احادیث صحیحہ کا سطور بالا میں ذکر کیا گیا ہے وہ ان امور کے بیان سے خالی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ علماء نے قرار دیا ہے کہ اگر کسی کو مسلمان سمجھنے کی ایک وجہ موجود ہو جب کہ ننانوے وجہیں اس کے خلاف جاتی ہوں تو بھی اسے کافر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ماضی کے مسلکی اختلافات

فرقوں کے وجود میں آنے کا ایک پہلو تو یہ ہے کہ عقائد و فقہی مسائل کا اختلاف ہوا لیکن علماء نے اسے فرقوں کی بجائے مسالک و مذاہب کا نام دیا کیوں کہ یہ اختلافات تفریعات و تاویلات پر مبنی تھے نہ کہ ایک دوسرے کی ضد پر، دوسرا اہم امر یہ ہے کہ بہت سے فرقوں کی پیدائش سیاست کی وجہ سے ہوئی ہے یا یوں کہہ لیں انھیں مختلف ادوار میں حکمرانوں کی حمایت یا مخالفت کے لیے پیدا کیا گیا یا وہ وجود میں آئے۔ تاریخ کا گہرا مطالعہ یہ بھی منکشف کرتا ہے کہ ایک ہی فرقے نے مختلف سیاسی ادوار میں حسب ضرورت روپ دھارے ہیں یا بعض عقائد کو اگر حکومتی سرپرستی حاصل نہ ہوتی تو شائد آج وہ کسی اور روپ میں ہوتے مثلاً خلق قرآن کا عقیدہ اور اس میں علماء کی تکالیف جنھیں المحنۃ کہا جاتا ہے، یا معتزلہ کی موافقت و مخالفت کو ہی لے لیں کہ اس تحریک کو بھی چنداں حکومتی سرپرستی حاصل رہی اور اس کے مخالفین کو بھی۔ اس کی دوسری بڑی مثال وہابیت کی ہے، جس کے بارے میں اعترافات سامنے آئے ہیں کہ یہ ایک تعبیر اسلام تھی جو سیاسی مقاصد کے حسول کے لیے اختیار کی گئی تھی۔ پہلے امریکہ و یورپ نے ایران کی شیعیت کو دنیا کے لیے سب سے بڑا خطرہ قرار دی اور پھر وہابیت کو، اور اس کے خاتمے و تضعیف کی کوششیں شروع کیں۔

تکفیر نے کیسے جنم لیا؟

یہاں تک تو معاملہ صرف دو دائروں میں تھا یعنی سب مسلمان ہیں لیکن اس دائرے کی نسبت سے ہر مسلک کا ایک دائرہ جو تھوڑا یا زیادہ اس بڑے دائرے کے باہر ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ۔ اپنائیت کے ساتھ غیریت بھی تھی لیکن اس پر اپنائیت غالب تھی۔ بعد ازاں یہ ہوا کہ لوگوں پر حکم اپنائیت کی بجائے غیریت کو سامنے رکھ کر لگایا جانے لگا یعنی کون ہمارا کتنا غیر ہے۔ اس طرز فکر نے تکفیریت کو کو جنم دیا اور فرقوں نے اپنی اور غیروں کی شناخت کے لیے کچھ ایسے امور مقرر کر لیے جن کا درج بالا آیات و احادیث سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مثلاً بعض فرقوں کے نزدیک امامت منصوص من اللہ کا انکار کفر قرار دے لیا گیا، اور بعض کے نزدیک اس کا اقرار کفر ہے کیوں کہ ان کے خیال میں

امام کو منصوص من اللہ ماننا گویا ختم نبوت کا انکار ہے، حالانکہ دونوں امور کو قرآن مجید سے ثابت کرنا ممکن نہیں اور نا ہی یہ دین کا مطالبہ ہے، اسی طرح صحابہ کرام کو معصوم عن الخطاء ماننا نہ قرآن کا تقاضا ہے اور نا حدیث کا، اسلام لے آنے سے ان کی ما قبل اسلام کی زندگیاں دھل گئیں، بہر حال وہ انسان تھے جن کی زندگیوں کے بعض گوشے کسی کی نظر میں نادرست ہو سکتے ہیں ان کو تقریبا سب ہی اکابر علماء نے بیان بھی کیا ہے، لیکن اس امر میں کسی کا اختلاف نہیں کہ کسی بھی مسلمان کے خلاف دریدہ دہنی، سب و شتم، فسق و فجور میں داخل ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: (سباب المؤمن فسق و قتاله الكفر) یعنی کسی مؤمن کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے لڑنا کفر ہے۔ یہ حدیث صحیح ہے، ناکہ صحابہ کرام رض یا اہل بیت عظام کے خلاف ناپسندیدہ الفاظ کا استعمال، اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، تاریخ و حدیث کی کتب سے یہ امر ثابت ہے کہ صحابہ کرام رض نے باہمی مشاجرات کے نتیجے میں کبھی ایک دوسرے کے دین پر طعن نہیں کیا اور کبھی اپنے کو غیر نہیں قرار دیا۔

جب یہی تاریخی واقعات بے حقیقت آمیزشوں کے ساتھ عقیدہ و عمل کی بنیاد قرار پائے تو ساتھ ہی ان پر 'اپنے' اور 'غیر' کے احکام بھی منطبق ہونے لگے۔ افسوس اس پر ہے کہ ان فکری مغالطوں کو دور کرنے کی بجائے انھیں اصول بنا لیا گیا اور یہی 'کفر' و "ایمان" کا میزان ٹھہرا۔ فرقہ واریت میں موجودہ شدت اسی طرز عمل کا نتیجہ ہے۔

ایک دوسرے سے عدم واقفیت

فرقہ واریت اور مسلکی عدم آہنگی کی ایک بڑی وجہ لوگوں کی ایک دوسرے کے عقائد و نظریات سے عدم واقفیت بھی ہے، خود ایک ہی مکتبہ فکر کے ماننے والوں کو علم نہیں ہوتا کہ کون سے ایسے خود اختیار کردہ عقائد و اعمال ہیں جن کو چھوڑنے یا نظرانداز کرنے سے دین یا متعلقہ مذہب پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس سے بڑھ کر یہ امر ہے کہ دینی امور عقائد و اعمال میں فرض، واجب، جائز، مستحب، سنت مؤکدہ، مباح، اور غیر مباح وغیرہ کی تمیز بھی لوگوں میں باقی نہیں رہی ہے، وہ ہر امر اور ہر عقیدے کو لابد ہی سمجھتے ہیں نیز ان کے بارے میں شدت پسند واقع ہوتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے

فرق اسلامیہ کے ماخذوں کو نہ پڑھنا بلکہ رد میں لکھی گئی کتابوں سے اصل عقائد و نظریات کو جاننے کا دعوی کرنا اور انھیں معلومات پر گمراہی کا فیصلہ کرنا بھی بڑی آفت ہے۔ مختلف مدارس اور اسکولوں میں بھی ان امور پر توجہ نہیں دی جارہی ہے، بلکہ بسا اوقات اساتذہ ان غلط فہمیوں میں اضافے کا سبب بن رہے ہوتے ہیں۔ نیز وہ علوم آلیہ پڑھاتے ہوئے بھی کسی نہ کسی طرح دوسرے فرقے کی گمراہی کا بیان چھیڑ دیتے ہیں جو نفرتوں کو فروغ دیتا۔

استعمار مخالف تحریکیں اور مذہبی سطح پر تناؤ

۱۹۲۰ء کے بعد دنیا بھر کے اسلامی خطوں میں استعماریت کے خلاف جو جد وجہد شروع ہوئی اس میں غیر مسلم قابضین کے خلاف جہاد کے فلسفے سے کام لیا گیا اور جتنی تحریکیں چلیں ان میں مسلم و غیر مسلم کے خانوں میں رہ کر حکومت و ریاست کے خد و خال طے کرنے کی سعی بلیغ کی گئی۔ اگلا سوال یہ پیدا ہوا کہ استعماریت کے خاتمے کے بعد ملک میں قانون کون سا نافذ ہوگا اور نظام حکومت کیا ہوگا؟ ان علاقوں میں پہلے سے انگلش، فرنچ، پرتگیزی وغیرہ قوانین رائج تھے۔ ان کی جگہ اسلامی نظام حکومت اور اسلامی قوانین نے لینا تھی جو اس وقت نہ مرتب شکل میں موجود تھے اور نہ ہی کوئی مرتب نظام حکومت موجود تھا جسے خالص اسلامی قرار دیا جاسکے۔ نہ جج صاحبان اسلامی قوانین میں تربیت یافتہ اور حذاقت کے حامل تھے اور نہ ہی وکلاء یعنی محامیین ہی اس لائق تھے چنانچہ ایک خلاء پیدا ہوا، دوسری طرف یہ بحث شروع ہوگئی کہ کون سے فقہی مکتب کے مطابق قوانین بنائے جائیں گے، یہ پھر مابہ النزاع امور میں سے قرار پایا اور مسلکی اضطراب کا سبب بنا کیوں کہ مختلف اسلامی ممالک میں مختلف مکاتب فکر کے پیروکاروں کی اکثریت ہے۔ چنانچہ سماجی سطح پر ان مکاتب فکر کے درمیان تناؤ پیدا ہوا اور شدت اختیار کرتا گیا۔ یہی کیفیت پاکستان میں نظام اسلام کے نفاذ کے نعرے نے پیدا کی۔

پاکستان میں فرقہ وارنہ بنیادیں

پاکستان میں اسلامی نظام حکومت و قانون کے نفاذ کے نعرے اور انقلاب ایران میں بعد زمانی نہیں پایا جاتا۔ انقلاب ایران کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکا اور دیگر مغربی طاقتوں نے مان لیا کہ اب اس خطے

میں ان کے مفادات کا تحفظ ممکن نہیں ہو گا، دوسرے یہ کہ انقلاب اسلامی ایران کے نتیجے میں کہیں مشرق وسطی کی ریاستوں میں بادشاہت کے خلاف تحریک شروع نہ ہو جائے۔ ان امور کے پیش نظر دو بڑے فیصلے کیے گئے (۱) ایک تو یہ کہ شیعیت کو دہشت گردی اور مسلمانوں کے ''غیر'' کے طور پر متعارف کروایا جائے چنانچہ اس کام کے لیے بے دریغ پیسہ صرف کیا گیا (۲) ایسی قوتیں تشکیل دی جائیں جو ایران کے زیر اثر مختلف ممالک میں موجود طبقات کو کلی طور پر دبا سکیں، یہ دونوں طرف سے مسلح جتھوں اور گروہوں کی شکل میں ایسے علاقوں میں پھیل گئے اور اپنے اپنے دفاع کے نام پر مسلح اور متشدد ہوتے گئے۔ اسی موقع پر جند، جیش، سپاہ، لشکر جیسے لاحقے مختلف جماعتوں کے عسکری بازؤں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ان کو تقویت اسی مذہبی لٹریچر سے ملی جو ۱۹۲۰ء کے بعد سے اب تک غیر مسلموں کے خلاف جہاد اور مسلمانوں کی ذمہ داریوں سے متعلق وجود میں آیا اور آرہا ہے۔ غور کریں تو علاقائی اور بین براعظمی نیز بین الاقوامی سطحوں پر جو تنظیمیں پائی جاتی ہیں ان کے پس پشت یہی لٹریچر موجود ہے، یا وہ لٹریچر جو اس سے متاثر ہو کر وجود میں آیا۔

علماء کی ذمہ داریاں

ایک مہلک فکری تبدیلی یہ بھی لائی گئی کہ (مسلمانوں میں سے غیر) کو (مسلمانوں کا غیر) قرار دے کے اس کے احکام بھی غیر مسلموں والے قرار دینے کی کوشش کی گئی۔ کسی مسلمان کو کافر قرار دینا ایک تو امر عظیم ہے چنانچہ علماء محققین کا کہنا یہ ہے کہ جب تک وجہ بھی کسی کو دائرہ اسلام میں قرار دینے کی موجود ہو، خواہ وہ کسی دوسرے فرقے کا ضعیف قول کیوں نہ ہو اس کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔ کسی کو کافر کہنے کے سنگین نتائج مرتب ہوتے ہیں جن میں قتل وقید، زوال ملکیت، مسلم عورت سے کیے گئے نکاح کا فسخ ہو جانا، ایسے شخص کے ذبیحہ کا ناجائز ہونا، اس کا وراثت سے محروم ہونا، اعمال کا فاسد ہونا، اس کی ولایت کا ساقط ہونا، نہ نماز جنازہ پڑھی جائے گی اور نہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے گا، اس پر لعنت کو بھی جائز رکھا گیا ہے نیز وہ ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔ یہ انتہائی دور رس اور اہم اثرات ہیں جو کسی مسلمان کی تکفیر سے حاصل ہو سکتے ہیں، جب کہ عوام الناس یہ فیصلہ بلا غور فکر اور شرائط کو جانے بغیر کر ڈالتے ہیں، غور کریں تو معاشرتی طور پر پہلا اثر اس

لیے غالب آتا جارہا ہے کہ ذمہ دار علماء تکفیریت، اس کے شرائط و نتائج پر کما حقہ بات نہیں کرتے اور شاگرد بھی لا علم رہتے ہیں۔ علماء، واعظین، و مدرسین وغیرہ کو امام غزالی کی یہ نصیحت بار بار دہرانا چاہیے اور طلاب کے ذہن نشین کراوانا چاہیے: "جس رائے کی طرف مائل ہونا اولی ہے وہ یہ ہے کہ جب تک ممکن ہو تکفیر سے اجتناب کیا جائے، اس لیے کہ قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے والوں اور لا الہ الا اللہ کا اقرار کرنے والوں کے خون اور مال کو مباح قرار دینا خطاء ہے، اور ہزار کافروں کی زندگی نہ لینے میں خطاء کرنا ایک مسلمان کا خون بہانے سے بدرجہا بہتر ہے"۔[4] کیوں کہ کسی انسان کو قتل کرنا گویا پورے عالم انسانیت کو قتل کرنا ہے[5] نا کہ ایک مؤمن کو جو ایمان لانے کی وجہ سے دوسرے انسانوں پر اک گونا فوقیت رکھتا ہے۔ اسی لیے احادیث میں قتل مؤمن کی حرمت وشناعت پر بہت سے فرامین نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موجود ہیں۔ چنانچہ احادیث صحیحہ میں وارد ہے کہ :"قتل المؤمن أعظم عند الله من زوال الدنيا" و في بعض طرق "أشد عند الله"۔ یعنی کسی مؤمن کو قتل کرنا اللہ کے نزدیک دنیا کے زوال سے بڑھ کر ہے، بعض روایات میں ہے کہ "دنیا کے زوال سے شدید تر ہے"[6]۔ جب کہ بعض روایتوں میں "اکبر" کی لفظ آئی ہے، یعنی زیادہ بڑا گناہ ہے[7]۔

سیاسی مفادات کا عنصر

ان سب امور کو جب ہم سامنے رکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے فرقہ واریت اور مسلکی عدم آہنگی کے پس پشت دیگر عوامل کے علاوہ سیاسی مفادات، ان سے جڑے ہوئے معاشی مفادات، عدم علم و تفحص، دوسرے مسالک کے پیروکاروں سے عدم آمیزش اور میل جول ترک کرنا، تکفیر کی اہمیت اور

---

4 الاقتصاد في الاعتقاد، ۲۳۳، ۲۳۴

5 القرآن، ۵: ۳۲

6 أخرجه النسائی، ۳۹۹۰، وابن أبی عاصم، الزهد، ۱۳۹، وابن الملقن، البدر المنیر، ۸: ۲۴۶، والجامع الصغیر للسیوطی، ۶۰۷۷، وصححه الألباني في صحیح الجامع، ۴۳۶۱، المقدسي، صحاح الأخبار، ۱۹۸۵۴۔۱۹۸۴۷، ج۵، ص ۴۹۴، وغیرها من الکتب

7 النسائی، ۸: ۸۳

اس کی پیچیدگیوں سے عدم واقفیت، تکفیر کے شرعی اثرات جو غیر قطعی الثبوت ہونے کی بناء پر تکفیر کرنے والے پر مرتب ہوتے ہیں، ایک مومن و مسلم کی جان و مال، عزت و آبرو کی حرمت اور اس کا پاس و لحاظ ہر دوسرے مسلمان پر لازم ہے۔ جب ایک شخص کلمہ پڑھ لیتا ہے تو اس کی جان و مال، عزت و آبرو دوسرے مسلمان پر حرام ہو جاتی ہے۔ نیز یہ کہ کسی کو کافر قرار دینے سے خود کے کافر بن جانے کا اندیشہ بہت قوی ہے۔ جب ایک مسلمان شخص دوسرے مسلمان کو کافر کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے پہلا فرد دوسرے کے اسلام کو کفر قرار دیتا ہے، اور اسلام کو کفر کہنا خود کفر ہے۔ یہ وہ تعلیمات ہیں جنھیں عام کرنے اور ان کے ذریعے ناپختہ ذہنوں کو درست کرنے کی مخلصانہ کوششیں بار آور ہوں گی۔

افسوس کہ یہ معاملات صرف ہمارے ملک تک محدود نہیں ہیں بلکہ یہ امت مسلمہ کا عموم بلوی ہے، اور ہر ملک میں یہ تفریق بری طرح اثر انداز ہو رہی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر سعودی عرب و یمن، شام میں اندرونی جنگ، عراق میں کرد اور شیعہ، بحرین میں شیعہ اور غیر شیعہ تنازع وغیرہ ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

ان سب کا حل ایک ہی ہے وہ یہ کہ ہر سطح پر مسلمان ایک امت و وحدت میں تبدیل ہوں اور ان دو امور کو سمجھیں کہ دنیا کی تاریخ میں ہر علم کا ارتقاء، اور اس کی نتیجے میں قوموں کا ارتقاء اس اعتراف پر مبنی رہا ہے کہ انسان کی بتائی ہوئی ہر تشریح چیلنج بھی کی جاسکتی ہے اور تبدیل بھی۔ اسی کے نتیجے میں بنی نوع انسان اس مقام تک پہنچی ہے، اور اسی کے نتیجے میں تمام مذہبی اور دنیاوی علوم کی ترقی ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی بھی علم میں انسانوں کی مرتب کردہ کوئی بھی تشریح حرف آخر نہیں ہے لہذا کسی ایک تشریح کو ہی اسلام حقیقی ماننا اور دوسروں کو گمراہ سمجھنا غلط بھی ہے اور فتنے کا سبب بھی۔

مذہبی آزادی اور پر تشدد واقعات

اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات ومباحث

جب بھی پاکستان میں مذہبی آزادی یا مذہبی رواداری سے متعلق مسائل کا تذکرہ ہوتا ہے تو اسلامی نظریاتی کونسل کا نام بھی سامنے آتا ہے۔ بالخصوص جب اقلیتوں کے حوالے سے کوئی حادثہ رونما ہو تو ملک کے حکام اور عوام دونوں اسلامی نظریاتی کونسل کی طرف دیکھتے ہیں، تاکہ متعلقہ امور پر اس وقیع ادارے سے رائے لی جائے۔ اسلامی نظریاتی کونسل وقتاً فوقتاً ان موضوعات پر اپنی سفارشات پیش کرتی رہتی ہے۔ حالیہ کچھ عرصے کے دوران چند ایسے واقعات رونما ہوئے جو شدید نوعیت کے تھے اور جن کی وجہ سے ملک کا بین الاقوامی امیج متأثر ہوا۔ اس صورتحال میں اسلامی نظریاتی کونسل نے ملک میں مذہبی رواداری کو یقینی بنانے اور اقلیتوں کے خلاف واقعات کی روک تھام کے لیے عمدہ سفارشات پیش کیں اور اپنے اجلاسوں میں اس موضوع پر سیرحاصل بحث کی جو خاصی اہمیت کی حامل ہے۔ کونسل کی ان سفارشات و مباحث میں سے کچھ نمایاں چیزوں کو یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

(ا) قومی پالیسی برائے بین المذاہب ہم آہنگی

پاکستان ایک کثیر الثقافتی ملک ہے اور یہاں مختلف مذاہب، ثقافتوں اور زبانوں کے لوگ رہتے۔ عام طور پہ یہ ساری اکائیاں پرامن زندگی گزارتی ہیں اور بقائے باہمی پر یقین رکھتی ہیں۔ لیکن بعض اوقات کچھ مسائل بھی جنم لیتے ہیں جس سے امن متاثر ہوتا ہے۔ سال 2017-18 کے دوران اسلامی نظریاتی کونسل نے بین المذاہب مکالمہ اور تعاون کے بارے قومی پالیسی پر ایک مسودہ منظور کیا تھا جس کے تحت بہت سی اہم تجاویز پیش کی گئی تھیں۔

اس ضمن میں پہلے پاکستان میں اقلیتوں سے متعلق مسائل و انتظامی پالیسیوں کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا جو نکات کی صورت درج ذیل ہے جس سے ملک کی واقعاتی صورتحال کا پتہ چلتا ہے:

1– پاکستان نے اپنے قومی پرچم میں اقلیتوں کو شامل کیا ہے جو کہ ملک کی تمام نئی اور پرانی اقلیتوں کے تحفظ، خوشحالی اور شمولیت کے سلسلے میں ایک وضع شدہ پالیسی کا نتیجہ ہے۔

2- کچھ اقلیتوں کی ملازمتوں کی نوعیت برطانوی راج کا نتیجہ ہے۔ ملک پاکستان ان کی اس تکلیف دہ حالت کا ذمہ دار نہیں ہے۔

3– پولیس کی ناکامیاں خاص طور پر اقلیتوں سے متعلق نہیں ہیں۔ یہ ناکامیاں عمومی نااہلی/ غفلت اور لوگوں کا پولیس کے ساتھ صحیح رویہ نہ رکھنے کو ظاہر کرتی ہیں۔

4– نفرت انگیز تقاریر کے واقعات کو مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یہ زیادہ تر بین المسالک سرگرمی ہے جو کہ ایک قابل تشویش معاملہ ہے اور اس کا انتظامی اور سیاسی طور پر تدارک ہونا چاہیے۔ اس طرح کی نفرت انگیز تقاریر شاذونادر ہی اقلیتوں کے خلاف کی جاتی ہیں۔

5– بنیادی چیلنج قانون کے مؤثر نفاذ کو یقینی بنانا ہے۔

6– ملک اور آئین کے نظریاتی تقدس پر سمجھوتہ کر کے میڈیا پر منفی پروپیگنڈا نہیں ہونا چاہیے۔

7– جبری مذہب کی تبدیلی کا مسئلہ باعث تشویش ہے لیکن ہر معاملے کے حقائق کو کسی نہ کسی طرح توڑ مروڑ کر نہیں پیش کرنا چاہیے۔ اس طرح کے معاملات میں عدالتوں کو اپنا فیصلہ کن

کردار ادا کرنا ہو گا۔

8- اقلیتوں کو باقی شہریوں کی طرح پوری آزادی ملنی چاہیے اور یہ ریاست کی ذمہ داری بنتی ہے کہ ان کے جملہ حقوق کو یقینی بنائے جو انہیں آئین پاکستان میں دیئے گئے ہیں۔

بین المذاہب مکالمہ و تعاون کو کامیاب بنانے کے لیے حکمت عملی

اس مسودے میں کونسل کی جانب سے کچھ تجاویز بھی پیش کی گئیں جو اس مقصد کو کامیاب بنانے میں کردار ادا کر سکتی ہیں۔ کیونکہ اسلامی نظریاتی کونسل کے مطابق روایتی طریقہ کار اپنانے کے ذریعے ان مقاصد کا حصول ممکن نہیں ہے تاہم قومی اور بین الاقوامی سطح پر حسب ذیل نئی اور غیر روایتی حکمت عملیوں کے ذریعے یہ اہداف حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پہ یہ اقدامات ناگزیر ہیں:

1- پارلیمنٹ کے ایکٹ کے ذریعے دستوری ادارے کی حیثیت سے قومی کمیشن برائے اقلیات (این سی ایم) کا قیام۔

2- وزارت مذہبی امور و بین المذاہب مکالمہ اور تعاون این سی ایم کو اعتماد میں لے گی اور بین المذاہب تعلقات کو مضبوط کرنے کے لیے ذرائع و وسائل تجویز کرے گی۔

3- این سی ایم اپنے ممکن منصوبے تیار کرے گی تاکہ کسی ناخوشگوار صورتحال سے نبٹا جائے، علماء اور غیر مسلم کمیونٹی کے قائدین کے ساتھ مشاورت کرے گی تاکہ مذہبی برداشت کو فروغ دیا جائے، امن قائم کیا جائے اور معاشرے میں مکالمہ اور تعاون کی فضا قائم کی جائے۔

4- این سی ایم صوبائی اور وفاقی حکومتوں کے ذریعے ضلعی بین المذہب مکالمہ اور تعاون کی کمیٹیوں کے ساتھ رابطہ کاری کرے۔

5- این سی ایم وفاقی دارالحکومت اور صوبوں میں کسی جگہ کا دورہ کر سکتی ہے، ملاقات کر سکتی ہے، اجلاسوں کا انعقاد کر سکتی ہے، جب کبھی حقائق معلوم کرنے کی ضرورت پڑے۔

6- امن اور برداشت کے مشترکہ نصب العین کے لئے مختلف مذہبی کمیونٹیوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا آپس میں انضمام کرانے کے لیے قومی بین المذاہب مہمات کا آغاز کیا جائے۔

7- ایسے افراد کی نشاندہی کی جائے گی جنہوں نے بین المذاہب مکالمہ اور تعاون کی سرگرمیوں

میں کردار ادا کیا ہو اور ایسے افراد کی معاونت کی جائے گی اور انہیں رابطہ کار ذرائع کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔

8– اقلیتوں کے خلاف تشدد، ان کے خلاف امتیازی سلوک اور ان کی نقل مکانی وغیرہ کے بارے میں صوبائی حکومتوں سے معلومات طلب کی جائیں گی۔

9– وفاقی دارالحکومت اور صوبوں میں بین المذاہب مکالمہ اور تعاون کے بارے میں سیمیناروں، ورکشاپوں اور مشاورتی اجلاسوں کا انعقاد کیا جائے گا۔

10– اقلیتوں کی شکایات پر بروقت ردِ عمل دینے اور ناخوشگوار واقعات رونما ہونے کی صورت میں فوری اقدام کرنے کے لیے وزارت مذہبی امور و بین المذاہب مکالمہ اور تعاون میں ٹال فری ٹیلی فون نمبر کے ساتھ ایک مرکز شکایات قائم کیا جائے گا۔

11– متعلقہ وفاقی وزارتوں/محکموں اور صوبوں کے ساتھ مسائل اٹھائے جائیں گے تاکہ کسی ناگزیر واقعے سے نبٹنے کے لیے اقدامات اٹھائے جائیں۔

12– اقلیتوں کے لیے قومی ثقافتی ایوارڈز کی بحالی۔

13– مالی معاونت، چھوٹے ترقیاتی منصوبوں اور اسکالر شپ، اقلیتوں کے لیے ملازمتوں میں پانچ فیصد کوٹے وغیرہ پر عملدرآمد کے ذریعے اقلیتوں کو قومی دھارے میں لایا جائے گا۔

14– حکومتی حلقوں، بیرون ملک وفود یا اسٹوڈنٹ ویزوں کے تبادلے وغیرہ جیسے تمام شعبوں میں ہر سطح پر اقلیتوں کی نمائندگی/شرکت کو یقینی بنایا جائے گا۔

15– آگاہی پیدا کرنے کے لیے ذرائع ابلاغ اور مقامی ابلاغی نظام کو متحرک کیا جائے گا۔

16– مساوی بنیادوں پر قدرتی آفات، ہنگامی حالات، حادثات اور تصادم سے متاثرہ اقلیتوں کی معاونت بین المذاہب مکالمہ اور تعاون کی قومی پالیسی کا بنیادی حصہ ہو گا۔

17– بین المذاہب مکالمہ اور تعاون کی قومی پالسی سے متعلق موجودہ قوانین، اگر کوئی ہوں، کی نظرثانی کی جائے گی تاکہ ان قوانین کے موجودہ اثرات کو تقویت بخشی جائے اور ایسے قوانین کی نشاندہی کی جائے جن میں ترمیم یا توسیع درکار ہو۔

(۲)اقلیتوں کا چارٹر آف ڈیمانڈ

سال 2007ء کے دوران اقلیتوں نے حکومت سے کچھ مطالبات کیے تھے جو آئین اور انتظامی حوالے سے بعض ترامیم سے متعلق تھے۔ وہ چارٹر آف ڈیمانڈ اسلامی نظریاتی کونسل کو بھیجا گیا جس پر کونسل نے یہ فیصلہ دیا:

مطالبہ 1: آئین میں قرارداد مقاصد کی جگہ قائداعظم کی تقریر کو لکھا جائے۔

فیصلہ: تقاریر کو آئین کا حصہ نہیں بنایا جا سکتا، قائداعظم کی اس تقریر میں جو اصول بیان ہوئے تھے، وہ آئین کا حصہ بنادیے گئے ہیں۔

مطالبہ 2: شریعت کے تحت بنائے گئے قوانین کا اطلاق غیر مسلموں پر نہیں ہونا چاہیے۔

فیصلہ: اقلیتوں کا یہ مطالبہ درست ہے کہ غیر مسلموں کے شخصی معملات کا ان کے شخصی قوانین کے تحت فیصلہ کیا جانا چاہیے۔

مطالبہ 3: اقلیتوں کے شخصی قوانین میں حالات کے مطابق ترمیم ہونی چاہیے۔

فیصلہ: اقلیتوں کا یہ مطالبہ جائز ہے لہذا ان کے شخصی قوانین میں حالات کے مطابق مناسب ترمیم ہونی چاہیے۔

مطالبہ 4: اقلیتوں کو اسلامی نظریاتی کونسل میں مناسب نمائندگی دی جائے۔

فیصلہ: چونکہ وزارت مذہبی میں اقلیتوں کے مسائل کے لیے پہلے سے ایک الگ ڈیسک بنا ہوا ہے، لہذا کونسل میں اقلیتوں کو نمائندگی دینے کی ضرورت ہے اور نہ الگ ڈیسک بنانے کی ضرورت ہے۔

(۳) پاکستان کی اقلیات کے بارے میں برطانوی پارلیمانی وفد کی رپورٹ

27 ستمبر تا 3 اکتوبر، 2019ء کے دوران ایک برطانوی پارلیمانی وفد نے مسٹر جم شینون (چیئرمین، اے پی جی فار مینارٹیز) کی سربراہی میں پاکستان کا پانچ روزہ دورہ کیا تھا۔ وفد کا مقصد پاکستان میں انسانی حقوق اور خاص طور پر اقلیتوں کے حقوق کی صورتحال کا جائزہ لینا تھا۔ برطانوی وفد نے مختلف حکومتی نمائندوں اور تنظیموں، مسیحی کمیونٹی کے سربراہان اور انسانی حقوق کے لیے کام کرنے والی مختلف این جی اوز سے ملاقاتیں کیں۔ علاوہ ازیں چیئرمین کونسل سے بھی خصوصی ملاقات کی۔ اس دوران مختلف سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں اور اداروں نے برطانویں وفد کی بھرپور معاونت کی جس میں اسلامی نظریاتی کونسل، اسلام آباد، بھی شامل ہے۔

برطانوی وفد نے اپنا دورہ مکمل کرنے کے بعد ایک رپورٹ مرتب کی اور وفد کے سربراہ مسٹر جم شینون (Mr. Jim Shanoon) نے یہ رپورٹ چیئرمین کونسل کو ارسال کی اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ اس رپورٹ کے بارے میں اپنے خیالات سے آگاہ فرمائیں، اس کے علاوہ ایسے اقدامات کی نشاندہی بھی کریں جو مستقبل میں اٹھائے جاسکیں۔ اس کے بعد وزارت انسانی حقوق کی طرف سے بھی مراسلہ موصول ہوا جس میں انہوں نے اس رپورٹ کے بارے میں کونسل سے ضروری کاروائی کی درخواست کی تھی۔

رپورٹ کا خلاصہ

رپورٹ میں پاکستان کی اقلیتوں اور دیگر انسانی حقوق سے متعلق درپیش مسائل کا جائزہ لیا گیا، مثلاً مذہبی انتہا پسندی، فرقہ وارانہ فسادات واختلافات، توہین رسالت، جبری تبدیلی مذہب، وغیرہ۔ رپورٹ میں مختلف عنوانات کے تحت سفارشات بھی دی گئیں کہ ملک میں اقلیتوں کی صورتحال کو بہتر بنانے کے لیے یہ اقدامات کیے جانے چاہیئں۔

اسلامی نظریاتی کونسل کے شعبۂ تحقیق کا تبصرہ

برطانوی وفد کی رپورٹ کا کونسل کے شعبہ تحقیق نے تفصیلی جائزہ لیا۔ اس کے مطابق رپورٹ میں جو صورت حال بیان کی گئی اس میں زیادہ تر ایسے مسائل ہیں جن کا تعلق انتظامی امور سے ہے۔

مزید یہ کہ پاکستان کے آئین میں اقلیتوں کے حقوق کو تحفظ دیا گیا ہے اور کونسل نے ہمیشہ اقلیتوں کے جائز حقوق کے تحفظ کی حمایت کی ہے، اسلام میں بھی اقلیتوں کے حقوق کی ضمانت موجود ہے، ایک اسلامی ریاست غیر مسلموں کی عبادت گاہوں اور دیگر تمام شہری حقوق کے تحفظ کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ کونسل نے سپریم کورٹ کے فیصلہ (بتاریخ 19/جون 2014ء جناب جسٹس تصدق حسین جیلانی کی سربراہی میں) کی بھرپور حمایت اور تائید کی ہے جس میں وفاقی حکومت کو ہدایت کی گئی ہے کہ ایک ٹاسک فورس تشکیل دی جائے جس کے ذمہ مذہبی رواداری کے قیام کا لائحہ عمل تشکیل دینے کا کام ہو۔ سپریم کورٹ کے فیصلے کے دیگر اہم نکات درج ذیل ہیں:

1۔ مذہبی اور سماجی رواداری و ثقافت پر مبنی نصاب
2۔ مذہبی آزادی اور دوسرے کے اعتقاد کی تعظیم
3۔ نفرت آمیز مواد کے والے سے قانون سازی
4۔ اقلیتوں کے حقوق کے لیے قومی کونسل
5۔ مخصوص پولیس فورس جو اقلیتوں کی عبادت گاہوں کی حفاظت کرے
6۔ اقلیتوں کے لیے تمام محکموں میں مناسب کوٹہ
7۔ عدالت عظمی کے فیصلے پر اس کی صحیح روح کے مطابق عمل درآمد

پاکستان کی اقلیتوں اور برطانوی پارلیمانی وفد کے دورے کی رپورٹ کے حوالے سے پاکستان کا آئین اقلیتوں کے بارے میں بہت واضح ہے۔ پاکستان کے آئین میں اقلیتوں کے حقوق کی ضمانت موجود ہے۔ ایک اسلامی ریاست غیر مسلموں کی عبادت گاہوں اور دیگر تمام شہری حقوق کے تحفظ کی

ذمہ دار ہے۔ نیز پاکستان کے قانون میں توہین ریاست کے غلط استعمال کرنے والوں کے لیے سزا کی گنجائش موجوں ہے اور عدالتی اسی طرح کے کیسوں کی درست چھان بین کرتی ہیں۔ نیز احمدی آئینی تقاضے کے مطابق خود کو مسلمان ظاہر کرنے پر اصرار نہ کریں تو وہ اقلیتوں کے سارے حقوق حاصل کر سکتے ہیں بشمول سیاسی نمائندگی کے، پھر حکومت پاکستان اقلیتوں کے لیے مزید اقدامات اٹھا رہی ہے۔ مثلاً:

1- 1500 سکھوں کو ننکانہ صاحب آنے کے لیے سرحد عبور کرنے کی اجازت۔

2- کرتارپور کی راہداری اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

3- سیالکوٹ میں 1947 سے بند کیا گیا ہزار سالہ پرانا مندر کھول دیا گیا ہے۔

4- بلوچستان ژوب میں کئی دہائیوں سے بند مندر کھول دیا گیا ہے، نیز پاکستان میں اقلیتوں کو جس قدر حقوق حاصل ہیں، اتنے کسی دوسرے ملک میں حاصل نہیں ہیں۔

5- مثلاً یونین کونسل سے لیکر قومی اسمبلی تک مخصوص نشستیں۔

6 - میڈیکل کالج اور دیگر تعلیمی اداروں میں مخصوص کوٹہ بھی ہے اور وہ میرٹ کی بنیاد پر بھی مسلمانوں کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔

7- ملازمتوں میں بھی مخصوص کوٹہ ہے، اقلیتی برادری کی عبادت گاہوں کو بھی گورنمنٹ فنڈ جاری کرتی ہے۔

8- اقلیتی نمائندوں کا اضافی فنڈ جبکہ عام ایم پی اے بھی اس فنڈ میں بھی شریک ہیں۔

9- اقلیتوں کے نمائندوں کو مسلم نمائندوں سے زیادہ فنڈ ملتا ہے۔

فیصلہ:

اسلامی نظریاتی کونسل نے بطور ادارہ اس وفد کی رپورٹ پر جو فیصلہ دیا اس کے نکات درج ذیل ہیں:

(الف) برطانوی پارلیمانی وفد کی رپورٹ میں انسانی حقوق بطور خاص اقلیتوں کے حوالے سے جن مسائل کی نشاندہی کی گئی، ان میں تو بعض مسائل واقعتاً موجود ہیں، جن میں اصلاح کی گنجائش

ہے، تاہم رپورٹ سے ابھرنے والا منفی تاثر درست نہیں۔ حکومت پاکستان ریاستی و حکومتی ادارے اور پاکستانی عوام کا بحیثیت مجموعی ہمیشہ سے اقلیتوں کے بارے میں مثبت رویہ رہا ہے، جس کو نمایاں کرنے کی ضرورت ہے۔

(ب) کونسل نے ہمیشہ اپنی آئینی حدود میں رہتے ہوئے پاکستان کی غیر مسلم اقلیتوں کے بارے میں جائز حقوق کی حمایت کی ہے۔ آئین پاکستان میں بھی اقلیتوں کو جملہ حقوق اور مکمل آئینی و قانونی تحفظ حاصل ہے۔

(ج) غیر مسلم اقلیتوں کے تحفظ کے لیے عدالتی فیصلے بھی موجود ہیں، اس ضمن میں سپریم کورٹ آف پاکستان کا فیصلہ (مؤرخہ 19 جون 2014ء) نہایت اہم ہے اور کونسل نے اپنے اجلاس میں اس فیصلے کو سراہا اور اس کی مکمل تائید و حمایت کی، کونسل سپریم کورٹ کے فیصلے پر مناسب اور مؤثر عملدرآمد کرنے کی سفارش کرتی ہے۔

(د) غیر مسلم اقلیات کو پاکستان کی پارلیمنٹ اور وفاقی کابینہ میں بھی نمائندگی حاصل ہے، سیاسی جماعتوں میں بھی نمائندگی حاصل ہے، جہاں سے وہ اپنے حقوق کے تحفظ کی بات کر سکتے ہیں اور اپنے جائز مطالبات کے لئے یہ فورمز بھی استعمال کر سکتے ہیں۔

(ھ) جن حلقوں کی طرف سے پاکستان میں غیر مسلم اقلیات کے حاصل شدہ حقوق و مراعات کے ضمن میں شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ پاکستان میں اقلیات محفوظ نہیں ہیں یا ان پر ظلم و ستم روا رکھا جا رہا ہے اور انہیں ان کے جائز حقوق سے محروم رکھا جا رہا ہے، یہ کاوشیں کونسل کی نظر میں قابلِ افسوس اور قابلِ مذمت ہیں۔

(و) کونسل متعلقہ وزارت کے لیے تجویز کرتی ہے کہ پاکستان کی غیر مسلم اقلیات کے بارے میں باقاعدہ ڈاکومنٹیشن ہونی چاہیے، جس میں تمام حقائق کو غیر جانبدار انداز میں درج کیا جائے اور وہ تمام حقوق جو آئینی و قانونی طور پر اقلیات کو حاصل ہیں، ان کی تفصیل درج ہو،

اور جو مطالبات اور مسائل ابھی مختلف فورمز پر زیرِ غور ہیں۔ان کی فہرست بھی درج کی جانی چاہیے اور ڈاکومنٹیشن کو ایک کتابچہ کی صورت میں شائع کیا جائے، اس کی اشاعت سے مجموعی صورتِ حال پر خوشگوار اثر پڑے گا اور اچھا تاثر قائم ہو گا۔

(ز) جن اقلیات نے ابھی تک اپنی آئینی حیثیت خود تسلیم نہیں کی، ان کے بارے میں دنیا کو یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ یہ مسلم نہیں ہیں، یہ اقلیات اپنی آئینی حیثیت تسلیم کر کے تمام حقوق اور مراعات جو دیگر اقلیات کو حاصل ہیں وہ حاصل کر سکتی ہیں۔

(۴) سانحہِ سیالکوٹ کے بعد اسلامی نظریاتی کونسل کی کاوشیں

3دسمبر 2021ء کو سیالکوٹ کی ایک فیکٹری میں سری لنکن شہری پر نتھا یا کمارا کو توہینِ مذہب کے الزام میں ایک ہجوم نے قتل کر دیا تھا اور بعد میں اس کی لاش کو جلا دیا گیا تھا۔ اس واقعے کے رونما ہونے کے بعد پوری دنیا میں ایک شور مچ گیا اور پاکستان پر شدید دباؤ پڑا کہ وہاں اقلیتوں کی صورتحال تشویشناک ہے۔ اس افسوسناک واقعے نے پاکستانی عوام کو بھی تکلیف میں مبتلا کیا۔ اس واقعے کے بعد ملک کے مختلف سماجی، مذہبی اور قانونی شعبوں میں غور وفکر شروع ہوا کہ اس طرح کے واقعات کیوں رونما ہو رہے ہیں اور ان کا سدباب کیسے کیا جاسکتا ہے۔ اسی تناظر میں اسلامی نظریاتی کونسل نے بھی اجلاس کیے اور علما سمیت ملک کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات کو مدعو کر کے ان سے آراء لیں اور سخت گیر مذہبی عنصر کا درجہ حرارت کم کرنے کے لیے تجاویز طلب کیں۔ کونسل کی طرف سے اس موضوع پر مرتب کی جانے والی سفارشات و مباحث بہت ہی اہم نوعیت کی ہیں جن پر توجہ دینی ضروری ہے۔

کونسل کی سرپرستی میں علماو مشائخ کا ایک وفد سری لنکن ہائی کمیشن بھی گیا اور وہاں انہوں نے پریس کانفرنس کی۔ علماء کرام نے واقعہ پر گہرے دکھ اور رنج کا اظہار کیا اور اس کی شدید الفاظ میں مذمت کرتے ہوئے اس کو مذہبی تعلیمات کے سراسر منافی قرار دیا۔

سری لنکن سفارت خانے میں پریس کانفرنس

علما نے اپنی پریس کانفرنس میں کہا کہ ہم آج سری لنکن سفارت خانے میں 3 دسمبر کے اندوہناک واقعہ پر اظہار تعزیت اور اظہار یکجہتی کرنے آئے ہیں۔ سیالکوٹ کا حالیہ سانحہ ایک المیہ ہے، جس کی وجہ سے پاکستان سمیت دنیا بھر میں غم و غصہ پھیل گیا ہے۔ ہجوم کی صورت میں بے رحمانہ انداز میں ایک انسان کو مارا پیٹا گیا اور بالآخر موت کے گھاٹ اتار کر اس کی لاش جلائی گئی، ماورائے عدالت قتل کا یہ ایک بھیانک اور خوفناک واقعہ ہے۔ بغیر ثبوت کے توہین مذہب کا الزام لگانا غیر شرعی حرکت ہے۔

- یہ پوری صورتحال قرآن و سنت، آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان اور ملک ملک میں رائج جرم و سزا کے قوانین کے سراسر خلاف ہے۔ان کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے اسلامی نظریات کونسل کے چیئرمین سمیت پاکستان بھر کے مستند علماء نے بھرپور طریقے سے اس کی مذمت کی ہے۔
- عاقبت نااندیش عناصر کا یہ اقدام ملک و قوم، ایلام اور مسلمانوں کی سبکی کا باعث بنا ہے۔
- علاوہ ازیں پیغام پاکستان کی قومی دستاویز جس میں ایسے ہر قسم کے مسلح اقدام کی نفی کی گئی، یہ اقدام اس سے سراسر انحراف ہے۔ پیغام پاکستان کو پاکستان کے تمام مکاتب فکر کے علماء کرام اور مدارس بورڈز کی تائید حاصل ہے۔
- ان شر پسند افراد کے خلاف رائج ملکی قوانین کے مطابق سخت سے سخت قانونی اقدامات کئے جائیں۔
- اس تکلیف دہ واقعہ میں اید کی ایک کرن یہ تھی کہ نوجوان ملک عدنان نے اپنی جان کی پرواہ کئے بغیر اس قتل ہونے والے بے گناہ شخص کو بچانے کی بھرپور کوشش کی، اس نوجوان کا یہ اقدام قابل تحسین بھی ہے اور قابل تقلید بھی۔
- وزیراعظم پاکستان نے اس نوجوان کی حوصلہ افزائی کے لیے تمغہ شجاعت دینے کا اعلان کر کے ایک بہت مستحسن اقدام کیا ہے۔
- آج کا نمائندہ اجتماع قرار دیتا ہے کہ اسلام میں تشدد اور انتہا پسندی کی کوئی جگہ نہیں ہے لہذا علماء کرام اعتدال پسندی کو فروغ دیں، انتہا پسندی کو روکنے کے لیے معاشرے میں اپنا بھرپور کردر ادا کریں تاکہ ملک پاکستان امن اور آتشی کا گہوارہ بن جائے۔

اسلامی نظریاتی کونسل کا سوالنامہ

کونسل کے شعبہ تحقیق نے سانحہ سیالکوٹ کے اسباب و وجوہات اور اس قسم کے واقعات کے سدِ باب کی حکمتِ عملی جاننے کے لیے چند سوالات مرتب کیے تھے، جو حسب ذیل ہیں:

1– عوام الناس بالخصوص نوجوانوں میں اس قدر سنگ دلی کیسے آئی کہ ایک انسان کی لاش کی تذلیل

کرنے کے ساتھ ساتھ اسے جلانے سے بھی احتراز نہیں کیا گیا؟ اس کی نفسیاتی اور دیگر وجوہات کیا ہیں؟

2– پاکستان میں توہین کے مرتب کے لیے قانون موجود ہونے کے باوجود عوام کی طرف سے از خود سزا دینے کا رجحان کن وجوہات کی وجہ سے پیدا ہوا ہے؟

3– لوگوں کی ذہن سازی کن خطوط پر استوار کی جائے کہ وہ ایسی حرکتوں کا ارتکاب نہ کریں؟

4– عوامی نوعیت کے واعظین سے غیر تحقیقی مضامین بیان کرنے اور ان کی گفتگو سے جذباتیت کا عنصر ختم کرنے کے لیے کیا اقدامات کئے جا سکتے ہیں؟

5– کیا موجودہ عدالتی نظام میں ایسی تبدیلیاں ناگزیر ہیں کہ ان پر ایسا عوامی اعتماد بحال ہو جائے کہ وہ قانون ہاتھ میں لینے جیسے اقدامات نہ کریں؟

6– کیا قانون کو ہاتھوں میں لینے کے خلاف ایسے مناسب نعرے بنائے جا سکتے ہیں جو مستقل طور پر عوامی شعور کا حصہ جائیں؟

7– کیا ایسی وجوہات ہیں کہ لوگ اپنے انتقامی جذبے یا دیگر اپنے کسی مفاد کے پیش نظر اپنے مخالف پر توہین مذہب/رسالت کا غلط الزام لگا دیتے ہیں؟ یا ایسی چیزوں کو توہین کے زمرے میں لے آتے ہیں، جن کا توہین سے کوئی تعلق نہیں ہوتا؟

8– کوئی بھی اہم نکتہ جو کوئی معزز رکن کونسل/ماہر موضوع زیر بحث لانا مناسب سمجھے؟

(۵) مذہبی عدم برداشت اور اقلیتوں کے امور پر اہلِ دانش و علما کی آراء

سانحہ سیالکوٹ کے بعد کو نسل نے کئی اہل دانش و علما کو خصوصی طور پہ مدعو کیا اور ان سے ان سوالات کے تناظر میں آراء طلب کیں کہ کیسے ملک میں مذہبی رواداری کو یقینی بنایا جاسکتا ہے اور اقلیتوں کے لیے ماحول کو سازگار بنایا جاسکتا۔ ان میں سے نمایاں مباحث و آراء پیشِ خدمت ہیں:

نوجوانوں کی صلاحیتوں کا ضیاع تناؤ اور لاقانونیت کو جنم دیتا ہے

ڈاکٹر جہانزیب

سانحہ سیالکوٹ بلاشبہ ایک قومی نقصان ہے جس سے من الحیث القوم ہماری بین القوامی سطح پر سبکی ہوئی ہے۔ بلاشبہ یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے اور جس رخ پر ہم جارہے ہیں مجھے نہیں لگتا کہ اس واقعے کے محرکات یہیں پر ختم ہوجائیں گے۔ ستر کی دہائی سے جو سوچ پروان چڑھ چکی ہے اور جس قسم کی تبدیلی ہمارے لوگوں میں آچکی ہے اس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ میری ناقص رائے میں یہ ہمارے ہی بوئے ہوئے بیج ہیں جس کی فصل ہم کاٹ رہے ہیں۔ مختلف ملکی حالات وضروریات کے نام پر ہم نے نفرت اور تقسیم کے بیج کی آبیاری کی یا اس کو قابو کرنے میں سستی اور کاہلی سے کام لیا۔ نفرت اور تقسیم سے شاید ہمیں وقتی فائدہ ہوا ہو مگر یہ منفی جذبات پھر رکتے نہیں اور نفرت مزید نفرت اور تقسیم مزید تقسیم (در تقسیم) کا باعث بنتی ہے۔ اصل میں انسان میں اللہ نے خیر و شر دونوں کی استعداد رکھی ہے۔ اگر خیر کی آبیاری کی جائے تو خیر کی قوت مضبوط ہوگی اور اگر شر کو کھاد اور پانی مہیا کیا جاتا رہے تو اس سے شر ہی پیدا ہوگا۔ ہمیں وقت پر یہ نہ احساس ہوا اور نہ ہی دلایا گیا کہ جس مادے کو ہم تقویت دے رہے ہیں وہ ہمیں بہت مہنگا پڑے گا۔ اب ہم سب مل بیٹھے ہیں کہ آخر یہ ہوا کیا ہے اور اسے سمجھنے کی کوشش کررہے ہیں۔ گو کہ اس سانحے کو مذہبی رنگ میں دیکھا جارہا ہے مگر میرے خیال میں یہ ایک معاشرتی اور نفسیاتی معاملہ ہے اور اگر ہم نے اسے ٹھیک طور پر نہیں سمجھا تو مزید نقصانات کی قوی اندیشہ موجود ہے۔

ہجوم کی نفسیات

نفسیات کا بنیادی اصول ہے کہ ''کل اپنی اکائیوں کے مجموعے سے کچھ زیادہ ہوتا ہے''، یعنی کل میں کچھ ایسا ہوتا ہے جو اکائیوں میں نہیں ہوتا جیسا کہ چراغاں میں دوڑتی ہوئی روشنیوں کو اگر اکیلے اکیلے دیکھا جائے تو اس میں حرکت کا عنصر نہیں پایا جائے گا۔ اسی طرح جب ہجوم اکٹھا ہوتا ہے تو اس میں موجود عقل منداصحاب کی انفرادی عقل پس پشت چلی جاتی ہے اور ان پر ہجوم کی نفسیات غالب آجاتی ہیں۔ اسی طرح سے ہجوم یعنی (Crowd) جب پر تشدد ہو جائے تو اس کو (Mob) کہتے ہیں۔ ہجوم میں (suggestibility) یا تجویز قبول کرنے کی صلاحیت بہت بڑھ جاتی ہے اور افراد ایک آواز پر کوئی بھی کام کرنے دوڑ پڑتے ہیں۔ اس دوران سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ماند پڑ جاتی ہے اور جذبات غالب آجاتے ہیں۔ انسان ہر وہ کام کرنے پر آمادہ ہوتا ہے جس کا عام حالات میں وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اس بنیادی نکتے کے علاوہ ہجوم کی نفسیات کے بارے میں دو نظریات پائے جاتے ہیں۔ ایک نظریہ کو Contagion Theory کہتے ہیں جس کے مطابق کوئی بھی عمل یا بات ایک متعدی مرض کی طرح ہجوم میں پھیل جاتی ہے۔ اس عمل میں انسان اپنی سوچ کو پس پشت ڈال کر دوسروں کی سوچ پر چلتا ہے اور یہ کیفیت پورے ہجوم میں پھیلی ہوئی ہوتی ہے۔

چونکہ ہجوم زیادہ ہوتا ہے اور اس میں ایک احساس قوت موجود ہوتا ہے اس لیے وہ کوئی بھی کام کر ڈالتا ہے۔ جتنا بڑا ہجوم ہوگا اتنا زیادہ یہ بھی امکان ہوگا کہ کسی بھی غلط کام کا صدور ہو جائے۔ اس ہجوم میں انسانوں کے اندر بہیمانہ جذبات غالب ہو جاتے ہیں اور اپنے آپ پر کنٹرول کمزور پڑ جاتا ہے۔ چونکہ بنیادی طور پر ہجوم ایک دوسرے سے صحیح واقف نہیں ہوتے اس لیے معاشرتی قدروں کی زیادہ پرواہ نہیں کی جاتی۔ ہجوم کی پہلے سے کسی خاص منصوبہ بندی یا ترتیب بھی ضروری نہیں ہوتی بلکہ اکثر و بیشتر پیشگی منصوبہ بندی ہوتی بھی نہیں۔ امکان ہے کہ چند لوگ ہجوم کو استعمال کر لیں۔ اس نظریہ کے مطابق انسانی سوچ انفرادی سوچ کے اصولوں پر تخلیقی یا تنقیدی نہیں ہوتی بلکہ Irrational یا غیر معقول ہو جاتی ہے۔ انسان کی انفرادیت نہیں رہتی اور ایک عمل جسے deindividuation (انسان کا انفرادیت والے کام کے لیے چلے جانا) کہتے ہیں، وقوع پذیر ہوتا ہے اسی لیے ہجوم کی صورت میں کیے

گئے غلط اقدامات کے لیے قانون سازی ایک مشکل عمل ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ جذباتیت کا عنصر ہجوم میں بہت غالب ہوتا ہے اور جہاں جذبات ہوں وہاں عقل ٹھیک طور پر کام نہیں کرتی اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بہت محدود ہو جاتی ہے۔ دوسرا نظریہ جو ہجوم کی نفسیات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے اس کو Emergent Norm Formation Theory کہتے ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق ہجوم کا کوئی منصوبہ طے نہیں ہوتا بلکہ ہجوم کے اندر ہی اندر بغیر کسی اعلان کے لوگ ایک خاص ایکشن یا عمل کی طرف مائل ہو جاتے ہیں جو کہ غلط اور غیر سماجی رویے پر بھی مبنی ہو سکتا ہے۔ افواہوں کا اس قسم کے ماحول میں بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ افواہیں پیدا ہو جاتی ہیں یا پیدا کر دی جاتی ہیں اور بہت تیزی سے پھیلتی ہیں اور لوگوں میں ایک تیز ردعمل پیدا کرتی ہیں اور لوگ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی ایک ایسے عمل میں شریک ہو جاتے ہیں جس میں ان کی قوت فیصلہ، سوچ اور فکر کا بہت کم عمل دخل ہوتا ہے اور ایسے کام کر جاتے ہیں جس پر وہ اکثر بعد میں نادم بھی ہوتے ہیں۔

فرد کی حیثیت اور اجتماعی اخلاقیات

تحقیق سے یہ بات اخذ کی گئی ہے کہ اکثر انسانوں کو اگر غلط کام کرنے کا نسبتاً محفوظ موقع میسر آئے تو وہ گناہ کر لیتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر بیرونی رکاوٹیں یعنی قانون، معاشرتی دباؤ اور لوگوں کا ارد گرد نہ ہونا یا ایک فرد کا نہ پہچانا جانا جیسے عوامل موجود ہوں تو انسان غلط کام کر سکتا ہے (اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ خوف خدا یا مذہب سے حقیقی لگاؤ کتنی ضروری چیز ہے)۔ suicide baiting یا خودکشی پر ابھارنا ایک ایسا عمل ہے جس میں لوگ کسی فرد کو خودکشی کرنے کی کوشش کرنے پر ترغیب دیتے ہیں۔ ایسے ہی ایک تجربے میں ایک بہت اچھی یونیورسٹی کے طالب علموں کو دیکھا گیا کہ وہ اندھیرے کی وجہ سے نہ پہچانے جانے کے سبب ایک شخص کی خودکشی کی کوشش پر اسے خودکشی پر ابھار رہے تھے۔ اگر پہچانے جانے کا خوف ہوتا تو شاید وہ ایسا بالکل نہ کرتے۔ ہجوم میں اکثر یہ صورتحال ہوتی ہے اور چونکہ جرم مشترکہ ہوتا ہے اسی لیے کسی پر ذمہ داری ڈالنا مشکل ہوتا ہے۔ اس قسم کی صورتحال میں موقع کی عکس بندی ایک اچھا عمل ہو سکتا ہے کیونکہ اسی سے بندوں کی پہچان ممکن ہو سکتی ہے اور پکڑے جانے کے خوف سے لوگ غلط کام سے بچیں گے۔

نوجوانوں کی توانائیوں کو محفوظ بنایا جائے

ہمارا ایک اور بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی توانائیاں صحیح طور پر استعمال کرنے کے مواقع میسر نہیں آتے۔ نہ تو ہمارے ہاں کھیلوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور نہ ہی ہم نصابی سرگرمیوں کے مناسب مواقع موجود ہیں۔ نتیجتاً ہماری توانائیوں کے منفی سرگرمیوں کے استعمال کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں کیونکہ توانائی نے کہیں نہ کہیں تو اپنا راستہ بنانا ہوتا ہے۔ ہم نے بحیثیت قوم اداروں کی ترقی پر توجہ نہیں دی، نتیجتاً ہمارے نظام عدل اور انتظامی ڈھانچے پر لوگوں کو اعتماد نہیں ہے جس کی وجہ سے قانون کو ہاتھ میں لینے کو ترجیح دیتے ہیں اور ان کی سوچ میں radicalization (انتہا پسندی) کا رجحان پایا جاتا ہے۔ میرے خیال میں اداروں کو وقعت دینے کی ضرورت ہے تاکہ لوگوں کا اعتماد ریاستی اداروں پر بحال ہو۔ تعلیم اور تربیت ریاست اور خاندان کی بنیادی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ ریاست کو چاہیے کہ بنیادی تعلیم اور تربیت پر زیادہ توجہ دے اور اچھے اساتذہ کو بھرتی کرے اور ان کو زیادہ سہولیات دے تاکہ ان کی عزت بنے اور طالب علموں کے دل ان کی مائل ہوں۔ بنیادی تربیت کا کام والدین اور انہی اساتذہ کا ہے، اعلی تعلیم بھی ایک اہم شعبہ ہے، بدقسمتی سے ہائر ایجوکیشن کمیشن (HEC) نے سائنس اور ٹیکنالوجی پر بہت زیادہ توجہ دی ہے اور سماجی، مذہبی اور آرٹ کے مضامین کو کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی جس کی وجہ سے معاشرے کی سمت میں تبدیلی آتی گئی اور صرف سائنسی ترقی کو ہی ترقی سمجھا جانے لگا، ابھی بھی وقت ہے کہ کمی کا ازالہ کیا جائے اور معاشرتی بگاڑ کو درست کیا جائے۔ چاہے وہ علم ہو، محبت و شفقت ہو یا کوئی اور چیز، اگر اس میں خلا (vacuum) رہ جائے تو عموماً ناپسندیدہ عناصر آکر وہ کمی یا خلا پورا کرتے ہیں اور پھر حالات و نتائج ہماری پسند کے نہیں ہوتے۔ ہمارا ایک بہت بڑا قومی مسئلہ الیکٹرانک اور سوشل میڈیا ہے جس پر ہماری حکومت کا بہت کم کنٹرول ہے اور جس کے کوئی خاص اصول و ضوابط طے نہیں ہیں۔ ٹی وی ایسے رول ماڈل دکھائے جاتے ہیں جن کا واقعتاً معاشرے کی اصلاح اور ترقی میں کردار نہیں ہوتا۔ تشدد کی ترویج ڈرامے اور فلم کے ذریعے بڑے عرصے سے کی جارہی ہے۔ اس طرف اصلاح کی بہت ضرورت ہے۔ منبر و محراب اور اسکول و مدرسے کا معاشرے کو سنوارنے میں بہت بڑا کردار ہے، عوام کو

برداشت کی تعلیم دیناوقت کا بڑا تقاضا ہے،اساتذہ کرام کی تربیت ان خطوط پر ہونی چاہیے کہ وہ یہ ذمہ داری بطریق احسن نبھا سکیں، جب ہم علم کی قدر کریں گے تو اساتذہ مقتدر رہوں گے اور معاشرے کی سمت صحیح ہو گی۔ صبر، برداشت، تعلیم اور تربیت اور اپنی اصل سے جڑے رہنا ہی وہ عناصر ہیں جن کی بدولت ہم ابھی بھی کھوئی ہوئی منزل پا سکتے ہیں، نفرت صرف نفرت کو اور تقسیم مزید تقسیم کو جنم دے گی اور اس کی روک تھام ہم سب کا فرض ہے۔

توہینِ مذہب کا مسئلہ اور قانونی مسائل وخلا

پروفیسر ڈاکٹر مشتاق احمد

متشدد رویوں کی جڑیں

سب سے پہلے تو ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ ہمارے ہاں یہ پر تشدد رویہ آیا کہاں سے ہے؟ اس کی جڑیں واقعی ہماری مذہبی روایت میں پائی جاتی ہیں؟ یا یہ معاشرے میں پائی جانے والی عمومی لاقانونیت اور بے چینی کے بہت سے مظاہر میں ایک مظہر ہے؟ کیا جب قومی مفاد کے نام پر طاقت کے بل بوتے پر ملک کے آئین کو معطل کر دیا جاتا ہے اور اس فعل کا ارتکاب کرنے والے عدالت اور قانون کی گرفت سے بچ جاتے ہیں، باوجود اس کے کہ ملک کا آئین اس فعل کو سنگین غداری سے تعبیر کرتا ہے، تو کیا اس طرح ملک کا طاقتور طبقہ اپنے طرزِ عمل سے پورے معاشرے کو یہ پیغام نہیں دے رہا ہے کہ قانون کو ہاتھ میں لینا کوئی بڑی بات نہیں ہے، اگر آپ اپنے تئیں خود کو درست سمجھتے ہوں؟ کیا عوام تک یہ تاثر صاحبان اقتدار و اختیار کی طرف سے نہیں پہنچا؟! میرے نزدیک یہ مسئلے کی جڑ ہے اور اگر اس مسئلے کو جڑ سے پکڑنا ہے اور اس فساد کو جڑ سے اکھاڑنا ہے تو اس کا واحد مؤثر اور یقینی حل یہ ہے کہ معاشرے کا بالا دست طبقہ قانون کی حکمرانی کا علمبردار بن جائے۔جب تک یہ بالا دست طبقہ خود قانون کی بالادستی تسلیم نہیں کرتا اور قانون کی دھجیاں بکھیرنے کو معمولی کام سمجھتا ہے، عوام سے قانون کی حکمرانی منوانا ممکن نہیں ہے۔

یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ ایک عام انسان جو عام حالات میں کسی چیونٹی کو بھی کچلنے سے

کتراتا ہے، کیسے بھیڑ اور ہجوم کا حصہ بن کر ایسی درندگی کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے جس کا شاید وہ خود بھی تصور نہیں کر سکتا تھا؟! ہجوم کی نفسیات کے خصوصی مطالعے کی ضرورت ہے۔ کیسے ہجوم کا حصہ بن کر کسی فرد کی انفرادی شخصیت پس منظر میں چلی جاتی ہے اور اگروہی شناخت، عصبیت اور نفسیات کو بالاتر حیثیت حاصل ہو جاتی ہے؟! اس کے بعد اخلاقی لاتعلقی کی ڈھال تعمیر کی جاتی ہے کہ گروہ کے ہدف کو ایک ایسا غیر انسانی وجود فرض کر لیا جاتا ہے جس کے ساتھ جتنا سخت سلوک کیا جائے، کم نظر آتا ہے، اور پھر نہ صرف اسے وحشیانہ طریقے سے کچلنا جائز ہو جاتا ہے بلکہ اس کی لاش کو جلا کر بھی تسکین نہیں ملتی!

کم علمی

اس مسئلے کا ایک سبب کم علمی ہے، جیسے چرچ پر حملہ کرنے والے گروہ میں شامل ایک نوجوان کا موقف یہ تھا کہ وہ امریکہ میں ایک پادری کے قرآن جلانے کا "قصاص" لینا چاہتا تھا! اب اس بے چارے کو واقعی یہ علم نہیں تھا کہ ایک کے کیے کی سزا دوسرے کو دینا قصاص نہیں بلکہ ظلم ہے۔ تاہم یہ کم علمی ہی اس کا واحد سبب نہیں ہے۔ بسا اوقات علم کے باوجود بھی ہجوم کا حصصہ بن کر انسان یہ سب کچھ کر گزرتا ہے۔ ایسے میں کیا چیز ہے جو انسان کو روک دیتی ہے، یا روک سکتی ہے؟ مثلاً اس نوجوان نے بتایا کہ جب اس کا ایک ساتھی توڑ پھوڑ کرتا ہوا چرچ کی عمارت پر پہنچا تاکہ وہاں سے صلیب گرادے، تو اچانک ہی رک گیا اور پھر واپس آگیا۔ جب اس سے پوچھا گیا، تو اس نے جواب دیا کہ وہاں انجیل کی آیت میں خدا کا نام لکھا ہوا تھا اور اس کے اوپر میں چڑھ نہیں سکتا تھا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ خدا کے احکام پر چڑھائی کرنے والے خدا کا نام دیکھ کر رک بھی جاتے ہیں!

انسانی حقوق سے متعلق بین الاقوامی رپورٹس کی اہمیت

انسانوں کی وحشت و بربریت کا مظاہرہ جنگوں میں بھی اکثر دیکھنے میں آتا ہے۔ چنانچہ بین الاقوامی ریڈ کراس کمیٹی نے اس موضوع پر ایک اہم تحقیق کی کہ اس وحشت و بربریت کے اسباب معلوم کیے جائیں اور ان کا تدارک کیسے کیا جا سکتا ہے؟ اس تحقیق کو پہلے Roots of Behavior in War کے عنوان سے شائع کیا گیا۔ بعد میں اس میں مزید اضافہ کر کے اس کو Roots of

Restraint in War کا عنوان دیا گیا۔ ہم نے پاکستان کے پس منظر میں اور اسلامی قانون کے اصولوں کی روشنی میں اسی نوعیت کی ایک ابتدائی تحقیق کی ہے جسے ریڈ کراس کمیٹی نے ہی شائع کیا ہے۔اس کا عنوان ہے: Islamic Perspective on the Roots of Restraint in War: A Case Study of Pakistan۔میری تجویز ہوگی کہ پالیسی سازی اور قانون سازی کے لیے اس طرح کی تحقیقات کو مد نظر رکھا جائے۔

محاربہ کے قوانین کا اطلاق

بعض احباب نے مولانا امین احسن اصلاحی اور جاوید احمد غامدی کی رائے پر انحصار کرتے ہوئے یہ تجویز دی ہے کہ ہجوم میں شامل سب افراد کو "محاربہ" کا مرتکب قرار دیتے ہوئے ان پر سورۃ المائدہ کی آیت 32 کا اطلاق کیا جائے اور ان محاربہ کی سزا دی جائے، بجائے اس کے کہ ہر فرد کی الگ فوجداری ذمہداری کا تعین کیا جائے۔انھوں نے اس ضمن میں اہل صنعاء کے متعلق سیدنا عمرؓ کے مشہور قول کا حوالہ بھی دیا جسے فقہ کی کتب میں عموماً "قتل الجماعة بالواحد" (ایک مقتول کے کئی قاتلین کی سزائے موت) کے عنوان کے تحت ذکر کیا جاتا ہے۔تاہم اس رائے میں اس طرف توجہ نہیں دی گئی کہ سورۃ المائدہ کی مذکورہ آیت میں بھی جرم کی ایک نہیں بلکہ چار سزائیں رکھی گئی ہیں اور اگر فقہائے کرام کی تحقیق کو نظرانداز کرکے صرف مولانا اصلاحی اور جناب غامدی کی رائے کو ہی دیکھا جائے، تب بھی اتنی بات تو ماننی پڑے گی کہ سزا اور جرم میں نسبت و تناسب کا خیال رکھنا ضروری ہے۔چنانچہ یہ دیکھنا تو بہرحال ضروری ہے کہ جرم میں کس کا کتنا حصہ تھا اور کس کو کس حد تک ذمہ دار قرار دیا جاسکتا ہے؟اسی طرح سیدنا عمرؓ کے قول سے استدلال کرتے ہوئے بھی یہ تو ضرور دیکھنا چاہیے کہ کیا اس گروہ نے مل کر اس ایک فرد کے قتل کی منصوبہ بندی کی یا موقع پر ہی ہجوم بنا اور کسی ابتدائی منصوبہ بندی کے بجائے بس لوگ لہر اور رو میں بہہ گئے؟اسی سوال کے جواب کے لیے ہمرے ہاں قانون میں بھی "مشترک ادارہ" (common intention) اور "مشترکہ ہدف" (common object) کی اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں۔(دیکھیے، مجموعہ تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ

34اور دفعہ 149)۔ نیز فوجداری قانون کا بنیادی اصول فرد کی انفرادی ذمہ داری کا ہے۔ ہر فرد کو اس کے کیے کی سزا ملنی چاہیے۔ ہجوم کا حصہ بننا بھی جرم ہے اور قتل بھی جرم ہے لیکن قانون بہر حال مباشر اور متسبب کا فرق دیکھتا ہے اور سببِ قریب اور سببِ بعید میں فرق کو بھی اہمیت دیتا ہے۔ چنانچہ پولیس، تفتیش اور پروسیکیوشن سب کی کارکردگی پر نظر رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔

مثلاً پولیس کی جانب سے جناب عمر سعید (ڈی پی او سیالکوٹ) نے بریفنگ دیتے ہوئے واضح کیا کہ تمام ملزمان گرفتار کر لیے گئے ہیں، کوئی مفرور باقی نہیں رہا، اور یہ کہ "پولیس نے صرف تعداد ہی پوری نہیں کی"۔ یہ آخری جملہ خود شاہد ہے کہ پولیس پر لوگوں کو اعتماد نہیں ہے اور اس کے بارے میں یہ تاثر موجود ہے کہ وہ صرف تعداد پوری کرنے کے لیے بہت سارے لوگوں کو گرفتار کر لیتی ہے۔ ان میں سے کئی ایک بے گناہ بھی ہو سکتے ہیں۔ کئی ایک ایسے بھی ہوں گے جو اس سے قبل کسی جرم میں ملوث رہے ہوں گے اور اس بنا پر پولیس کی نظر میں مشتبہ ہوں گے لیکن اس مخصوص موقع پر اس مخصوص جرم میں ان کی شرکت کا ثبوت فراہم کرنا بہر حال پولیس، تفتیش اور استغاثہ کی ذمہداری ہے۔ ثبوت ایسے ہوں جو ان کی جانب سے جرم کا ارتکاب اس طور پر یقینی دیکھائیں کہ شک کی گنجائش باقی نہ رہے، تبھی عدالت سزائیں دے سکے گی، ورنہ پھر ہو گا یہ کہ عدالت عدمِ ثبوت کی بنا پر بری کر دے گی اور لوگ عدالت کو ہی موردِ الزام ٹھہرانا شروع کر دیں گے۔

مسئلہ قوانین کی کمی نہیں

پولیس کی جانب سے یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ ہجوم کے جرم کے متعلق نئی قانون سازی کی جائے کیونکہ پہلے سے موجود قوانین کے ذریعے ایسے جرائم سے نمٹنا مشکل ہے۔ میری رائے اس کے بالکل برعکس یہ ہے کہ پاکستان میں مسئلہ قوانین کی عدم موجودگی یا اقلیت کا نہیں، بلکہ قوانین کی کثرت کا ہے اور میں قانون کے ایک طالب علم کے طور پر یقین رکھتا ہوں کہ کسی نئی قانون سازی کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ اصل ضرورت قوانین کے مؤثر نفاذ کی ہے۔ اس وقت بھی مسئلہ ہ ہے کہ ایک ہی جرم پر کئی قوانین کا بیک وقت اطلاق ہوتا ہے اور اس وجہ سے غیر ضروری پیچیدگیاں پیدا

ہو جاتی ہیں۔ یقین نہ ہو، تو فساد فی الارض کے متعلق مجموعہ تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 311 کے اطلاق کے متعلق عدالتی فیصلے دیکھ لیجیے۔ اسی طرح پولیس ہر معاملے میں دہشت گردی کی دفعات ڈالنا ضروری سمجھتی ہے کیونکہ اس طرح ملزم کی ضمانت مشکل اور بعض اوقات ناممکن ہو جاتی ہے لیکن اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ہر جرم کو دہشت گردی قرار دے کر دہشت گردی کی دہشت ختم کر دی گئی ہے۔ نیز انسداد دہشت گردی کی عدالتوں پر غیر ضروری بوجھ کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ البتہ توہینِ رسالت کی سزا کے متعلق قانون پر نظرِ ثانی کرنے اور اس میں بہتری لانے کی ضرورت یقیناً ہے۔

شدت پسندی کے سدِ باب کے لیے تربیت اور صحیح معلومات کی اہمیت

ڈاکٹر عمیر محمود صدیقی

تکفیر اور توہینِ مذہب سے متعلق درست آگہی کی ضرورت

معاشرے میں شدت پسندی کے بڑھتے ہوئے واقعات کا ایک سبب مشروعات اور ان کی حیثیت سے عدم واقفیت بھی ہے۔ ادلہ سمعیہ کی دلالت و ثبوت کے اعتبار سے تقسیم اور فرض و حرام، واجب و مکروہ تحریمی، سنت مؤکدہ اور اساءت، سنت غیر مؤکدہ و مکروہ تنزیہی، مستحب و خلاف اولی اور مباح سے متعلق شرعی احکامات سے ناواقفیت اکثر اوقات اس تفریق کو بھلا دیتی ہے کہ کس عمل پر عتاب ہو گا اور کس عمل پر سزا و عقاب ہو گا۔ لہذا لوگوں میں شعور و آگہی کی مہم کے ساتھ تکفیر اور توہین رسالت سے متعلق بنیادی مسائل کا علم دینا ضروری ہے۔ دینی مسائل اور قانون سے جہالت، ذاتی دشمنی، زمین کے جھگڑے، لا قانونیت، توہین رسالت کی بین الاقوامی مہم کے مقابلہ میں کچھ نہ کر سکنے کے سبب احساس محرومی اور عدل کا عدم نفاذ لوگوں کو توہین مذہب کا غلط الزام لگانے پر جری کر دیتا ہے۔ جب قوم ایک خاص مرحلہ سے گزر کر Redicalised ہو چکی ہو تو اسے De-Redicalised کرنے کے لیے مثبت سر گرمی اور درست علم فراہم کرنا ہو گا۔ اسی طرح ایسے واقعات کے تناظر میں ان لوگوں پر سوشل میڈیا اور مین اسٹریم میڈیا پر پابندی لگا دی جائے جو لوگوں کو مزید شدت پسند بنانے کے لیے توہین رسالت کے قانون کو ختم کرنے پر زور لگاتے ہوئے فرانس

اور دیگر ممالک میں ہونے والے توہین مذہب کے واقعات کو آزادی اظہار کے نام پر صرف برداشت کرنے کا درس دے رہے ہیں۔

توہین کا قانون موجود ہونے کے باوجود از خود سزا کے رجحان کا سبب

اس موضوع پر سب سے اہم اور بنیادی نکتہ یہی ہے اور بندہ کے خیال میں از خود سزا دینے کے رجحان میں اضافہ کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ لوگوں کو عدالتوں پر اعتماد نہیں رہا۔ عوامی سطح پر یہ بات زبان زد عام ہے کہ حکومت و عدالت ایسے مجرموں کو سزائیں نہیں دیتی، ہمارا عدالتی نظام انتہائی سست اور فرسودہ ہو چکا ہے۔ ماضی میں گستاخی کے حقیقی یا کم از کم ایسے مشکوک مجرم جن کو تین تین نچلی عدالتوں نے سزائیں دی وہ اوپر اوپر عدالتوں میں نہ صرف بری ہوئے بلکہ ماضی میں انہیں فخریہ انداز میں آزاد کیا گیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ غیر ملکی مداخلت، حکومتوں کا عدالتوں پر اثر انداز ورنا اور غیر ملکی پریشر یہ وہ بنیادی اسباب ہیں جن کی بنا پر کم از کم توہین کے معاملہ پر عوام میں عدالت پر بھروسہ نہیں رہا۔ اگر ماضی میں گستاخی کے حقیقی مجرموں کو عدالتی سزائیں دی گئی ہوتیں تو آج عدالتی سسٹم پر عوامی بداعتمادی کی فضا ہر گز نہ ہوتی۔ لہذا توہین کے معاملہ میں قانون کی پاسداری اور از خود سزا کے رجحان کے خاتمہ کا واضح اور صاف راستہ صرف اور صرف یہی عدالتیں ان جیسے حساس معاملات میں speedy اور quickly فیصلے کریں اور مداخلت و پریشر سے پاک منصفانہ فیصلے صادر کریں، جب تک یہ نہیں کیا جائے۔ گا عوام کا موجودہ عدالتی سسٹم پر اعتماد بحال نہیں ہو سکے گا اور از خود سزا دینے کا رجحان برقرار رہے گا۔ (یہاں یہ واضح رہے کہ بالفرض عدالت اور حکومت فوری اور درست فیصلے نہ بھی کریں تب بھی از خود سزا دینے اور قانون ہاتھ میں لینے کی پھر بھی شرعاً اجازت نہیں دی جا سکتی کیونکہ اسلام کسی صورت بھی انارکی ای فساد و انتشار کی اجازت نہیں دیتا۔ عدالتی کمزوریوں کے باوجود عوام کی ذمہ داری ایسی صورت میں صرف اس حد تک ہے کہ وہ کسی بھی مجرم کو پکڑ کر قانون کے حوالے کر دیں۔ اس سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے)۔

عوام میں قانون کی پاسداری کے شعور کے لیے مناسب نعروں کی تجویز

قانون کی پابندی اور پاسداری کے لیے عوام میں شعور بیدار کرنے کی غرض سے مختلف اسباب اختیار کئے جاسکتے ہیں جن میں مناسب اور سنجیدہ نعرے بھی شامل ہیں مگر قانون پر عملدرآمد کے سلسلے میں ہر اسٹیک ہولڈر کو اپنی ذمہ داریاں ادا کرنا ہوں گی جن میں والدین، اسکول، مدرسہ، مکتب، کالج یونیورسٹی، دینی جامعات اور مساجد کے منبر و محراب اور میڈیا سب شامل ہیں، ان سب ذرائع کو اختیار کرکے کمپین کی شکل میں مستقل بنیادوں پر تعمیری اور مثبت کام کی ضرورت ہے۔

ذاتی مفاد اور ذاتی انتقام کے پیش نظر توہین مذہب کے الزام کا سد باب

ہمارے معاشرے میں جس طرح دیگر مقدمات مثلاً 302 جیسے مقدمات میں جھوٹ، غلط بیانی اور جعلسازی کا رجحان ہے اسی طرح توہین مذہب کے مقدمات میں بھی ذاتی مخاصمت، عصبیت، ذاتی انتقام اور سیاسی مفادات جیسے اسباب بھی پائے جاتے ہیں مگر اس سلسلے میں بھی گزارش یہ ہے کہ اس رجحان کے سد باب میں بھی عدالتی کمزوری واضح ہے کیونکہ جب ہم عدالتی نظام کی کمزوری کی بات کررہے ہیں تو یہ بات دو طرفہ ہے، یکطرفہ نہیں ہے یعنی جہاں توہین کے حقیقی مجرمین کو سزائیں نہیں دی جاتیں تو دوسری طرف اگر کسی پر توہین مذہب کا جھوٹا اور غلط الزام لگایا گیا تو اتنا سنگین الزام لگانے والوں کو بھی سزائیں دینے کی کوئی قابل قدر عدالتی کارکردگی سامنے نہیں آئی لہذا عدالتی کمزوری دو طرفہ ہے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ توہین کے مرتکب کو بھی سخت اور کڑی سزا دی جائے اور جھوٹا الزام لگانے والے کو بھی عبرتناک سزا دی جائے۔ ہر صورت میں عدالتی رٹ مضبوط اور فعال نظر آنی چاہیے۔ اور مذکورہ خطوط پر استوار ایک مضبوط، منصفانہ اور توانا عدالتی نظام ہی دراصل مذکورہ خرابیوں کا سد باب کرسکتا ہے۔

سانحہ سیالکوٹ پر اسلامی نظریاتی کونسل کا اعلامیہ (تجاویز)

اسلامی نظریاتی کونسل نے سانحہ سیالکوٹ پر تفصیلی بحث کے بعد اہل دانش و علماء کے سامنے ایک اعلامیہ پیش کیا جسے چند اصلاحات کے بعد بطور فیصلہ منظور کیا گیا، اس کا متن حسب ذیل ہے:

- اسلامی نظریاتی کونسل اور ماہرین موضوع کے ساتھ ہونے والے برین سٹارمنگ سیشن/فکری نشست میں سانحہ سیالکوٹ کو انتہائی قابل مذمت قرار دیا گیا۔ کونسل نے مطالبہ کیا کہ اس سانحہ میں ملوث تمام ملزمان کو قانونی عمل کے ذریعے قرار واقعی اور فوری سزا دی جائے۔
- اس اجلاس نے قرار دیا کہ پاکستانی حکومت نے اس مشکل صورت حال کو انتہائی دانش مندی کے ساتھ نمٹایا جس پر سری لنکن حکومت اور عوام نے اطمینان کا اظہار کیا۔
- وزیر اعظم اسلامی جمہوریہ پاکستان عمران خان نے ملک عدنان کو سند توصیف اور تمغہ شجاعت دینے کا جو اعلان کیا اسے مستحسن اقدام قرار دیا۔
- کونسل نے فیصلہ کیا کہ متشددانہ رجحانات کی وجوہات، اسباب اور انسداد کے لیے ماہرین موضوع کے ساتھ تسلسل سے فکری نشستوں کا سلسلہ جاری رکھا جائے گا تاکہ حکومت، ریاست، پالیسی ساز اور قانون ساز اداروں کے سامنے طویل المیعاد اور جلد روبعمل لانے والی تجاویز اور آرا تشکیل دی جا سکیں اور عملی اقدامات اٹھائے جا سکیں۔
- کونسل پہلے بھی قرار دے چکی ہے کہ قانون کی موجودگی اور قانون کی تشکیل سے زیادہ مسئلہ قانون پر عملدرآمد اور ملوث افراد کو سزا کی یقینیت نہ ہونا ہے۔ اس بات کو یقینی بنایا جائے کہ سانحہ سیالکوٹ یا دیگر ایسے واقعات میں ملوث افراد کو سزا ہوتی نظر آئے۔
- کونسل کے اجلاس اور ماہرین موضوع نے متفقہ طور پر باور کیا کہ موجودہ عدالتی نظام میں کافی حد تک اصلاح کی اس انداز سے گنجائش موجود ہے کہ ان اداروں پر عوامی اعتماد بحال ہو سکے۔
- ملک میں بڑھتے ہوئے تشدد کے اسباب میں سے ایک سبب سوشل میڈیا پر ایسے مواد کی موجودگی اور تشہیر ہے جو اسلام، اسلامی عقائد اور نظریہ پاکستان کے خلاف ہیں۔ اگرچہ کونسل دیگر اداروں سے مل کر اس حوالے سے کام کر رہی ہے تاہم اس کے انسداد کے لیے مربوط حکمتِ عملی کی ضرورت ہے۔
- پاکستان کے مذہبی، سیاسی اور حکومتی قائدین نے بر وقت اور درست انداز میں اس واقعہ کی

مذمت اور دوست ملک سری لنکا کے ساتھ اظہار یکجہتی کرتے ہوئے جو اقدامات کئے ہیں، وہ قابل تحسین ہیں، اس سے پاکستان کا اصل چہرہ دنیا کے سامنے آیا۔

- اسلامی نظریاتی کونسل اور مقتدر اداروں کی بروقت سہولیات کاری سے پاکستان کی نامور مذہبی قیادت نے نہ صرف سری لنکن سفارتخانہ کا دورہ کیا اور ہمدردی کے پیغامات سے سری لنکن ہائی کمیشن کو آگاہ کیا بلکہ ملک بھر میں علماء و مشائخ سے رابطوں کے ذریعے اس واقعہ پر بھرپور یوم ندامت منایا گیا، جس سے دونوں طرف اطمینان و سکون کی کیفیت سامنے آئی۔
- جمعیت علمائے سری لنکا کی طرف سے جناب طاہر محمود اشرفی معاون خصوصی وزیر اعظم برائے بین المذاہب ہم آہنگی و مشرقی وسطیٰ امور کے نام تحسینی خط بھیجا گیا جس میں ملک بھر کے علماء ومشائخ اور مذہبی قائدین کا شکریہ ادا کیا گیا جس سے ملک قوم کی عزت میں نمایاں اضافہ ہوا۔
- پنجاب پولیس اور ملکی سلامتی کے اداروں نے اس سلسلے میں بہت محنت اور پیشہ وارانہ انداز میں کام کیا ہے اور تمام ملوث عناصر کو گرفتار کیا ہے، یہ ساری قانونی کاروائی قابل ستائش ہے۔
- اس اجلاس میں قرار دیا گیا کہ عوام میں یہ رجحان بیدار کرنے کی اشد ضرورت ہے کہ قانون اپنے ہاتھ میں نہ لیا جائے، ایسا کرنا قرآن و سنت، شریعت، آئین پاکستان اور متفقہ دستاویز پیغام پاکستان کے خلاف ہے اور اگر کوئی قانون ہاتھ میں لیتا ہے تو ریاست کو اس کے خلاف فوری اقدام کرنا چاہیے۔
- پیغام پاکستان کی صورت میں 2017ء میں ایک ایسا متفقہ اعلامیہ موجود ہے جس کو تمام مکاتبِ فکر اور مدارس بورڈ کی تائید حاصل ہے، کونسل کا یہ اجلاس تجویز کرتا ہے کہ یہ متفقہ اعلامیہ پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ اس سے پارلیمانی تائیں اور منڈیٹ حاصل ہو اور روبعمل کرنے کے لیے قانون سازی کی ضرورت ہو تو ضروری اقدامات کیے جاسکیں۔
- پاکستان کے مستند اہل علم نے جس طرح اس واقعہ کی درست انداز میں مذمت کرتے ہوئے ایسے ناجائز اقدامات کی حوصلہ شکنی کی ہے، اسی بیانیہ کو عوام الناس میں رائج اور راسخ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ ایسی ناجائز اور پر تشدد کاروائیوں کا سد باب ہو سکے۔

مذہبی آزادی اور اقلیتوں کے حقوق سے متعلق اہم عدالتی فیصلے

پاکستان میں اقلیتوں کے لیے عدلیہ کا کردار ہمیشہ متوازن اور بہتر رہا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مذہبی تنازعات میں عدالتوں کی جانب رجوع بہت کم کیا جاتا ہے۔ ایسے ہی خود اقلیتی برادریوں کے ارکان بھی بہت کم عدالتوں کا رخ کرتے ہیں جس کی اپنی وجوہات ہو سکتی ہیں، ان میں سے لاعلمی، معاشی مسائل یا پراسس سے عدم واقفیت بھی چند اسباب ہیں۔ تاہم عدالتوں کی جانب سے سے متعدد بار کئی مسائل پہ اچھے فیصلے دیے گئے۔ ان میں سے دو فیصلوں کو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) جسٹس تصدق جیلانی کا فیصلہ

سپریم کورٹ آف پاکستان نے 2014ء میں اقلیتوں کے تحفظ اور ان کے حقوق کے حوالے سے ازخود نوٹس لیتے ہوئے ایک فیصلہ سنایا تھا جس میں حکومت کو اقلیتی برادریوں کے حقوق کو یقینی بنانے کے لیے کچھ احکامات دیے گئے تھے اور ساتھ ہی اقلیتوں کے تحفظ کے لیے قومی کمیشن بنانے کا حکم بھی دیا تھا۔

اس مقدمے کی سماعت تین ججز نے کی تھی: چیف جسٹس تصدق حسین جیلانی، جسٹس شیخ عظمت سعید، جسٹس مشیر عالم۔

مقدمے کی بنیاد

عدالت نے جن مسائل و اسباب کی وجہ سے ازخود نوٹس لیتے ہوئے یہ فیصلہ سنانا تھا وہ یہ تھے:

1– یہ اعتراض ہے کہ ہندو لڑکیوں زبردستی اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے جس کے متعلق فوجداری مقدمات بھی رجسٹرڈ کیے گئے ہیں لیکن ان میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکی۔

2– صوبائی اور وفاقی حکومتوں کی جانب سے پشاور میں چرچ دھماکے کے متاثرین کے لئے اعلان کردہ معاوضے کی ادائیگی تاحال نہ کی جاسکی ہے۔

3– یہ الزام کہ کیلاش قبیلہ اور اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھنے والوں کو دھمکیوں کا سامنا ہے کہ وہ یا تو اپنے فرقے سے منحرف ہوں یا موت قبول کریں۔

4– نادرا اور لوکل کونسل اتھارٹی میں ہندوؤں کی شادیوں کی عدم رجسٹریشن کے متعلق شکایات۔

5– مسیحی شادیوں کی عدم رجسٹریشن کے متعلق شکایات۔

فیصلے کے اہم نکات

یہ ایک تفصیلی فیصلہ تھا جس میں زیادہ تر اِس پہلو پر توجہ دی گئی کہ قومی ریاست میں اقلیتوں کے حقوق کیا ہیں اور انہیں دنیا میں کس طرح یقینی بنایا جاتا ہے۔ پاکستان کے تناظر میں فیصلے کے چند اہم نکات یہ تھے:

مذہبی آزادی کا حق:

مذہبی آزادی کا حق ہر شہری کو تین مختلف قسم کے حقوق دیتا ہے۔ یعنی مذہب اختیار کرنے کا حق، مذہبی عبادت کا حق اور مذہبی تبلیغ کا حق۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آئین کا آرٹیکل 20 صرف نجی طور پر مذہب پر عمل کرنے کا حق نہیں دیتا بلکہ نجی اور عوامی دونوں سطح پر مذہب پر عمل پیرا ہونے کا حق دیتا ہے۔ مزید یہ کہ یہ نہ صرف مذہب پر عمل پیرا ہونے اور اختیار کرنے کا اضافی حق دیتا ہے بلکہ اپنے مذہب کی دوسروں کو تبلیغ کا بھی حق دیتا ہے۔ یہاں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ تبلیغ کا یہ حق صرف مسلمانوں تک محدود نہیں کہ وہی اپنے مذہب کی تبلیغ کریں بلکہ یہ حق دوسرے مذاہب کے لوگوں کو بھی حاصل ہے کہ وہ نہ صرف اپنے مذہب کے لوگوں کو اس کی تبلیغ کریں بلکہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کو بھی تبلیغ کریں۔ اس حق کو اس تناظر میں نہیں دیکھنا چاہیے کہ اس سے لوگوں

کی مذہبی تبدیلی کی حوصلہ افزائی ہو گی بلکہ اس اہم پہلو یہ ہے کہ اس سے زبردستی مذہب کی تبدیلی یا دوسروں پر اپنے نظریات تھوپنے کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے کیونکہ جب سب شہریوں کو تبلیغ کا حق حاصل ہے پھر کسی شہری کو دوسروں کو زبردستی مذہب کی تبدیلی یا ان پر اپنے عقائد نافذ کرنے کا حق حاصل نہیں۔

پاکستان میں اقلیتوں کے حقوق کی پاسداری

تاہم جو سوال زیر غور ہے وہ یہ ہے کہ آیا ملک میں اقلیتوں کو جو حقوق دیے گئے ہیں ان کی حقیقتاً پاسداری ہو رہی ہے یا نہیں؟

اس سوال کا بہترین انداز میں حوصلہ افزا جواب اس صورت میں دیا جا سکتا ہے جب ملک کے سماجی و سیاسی حالات کو مد نظر رکھا جائے۔ پاکستان ایک ناپختہ جمہوری عمل کا حامل ملک ہے اور دوسرے ممالک کی طرح (جو غریب ہیں) سیاسی اور سماجی مسائل سے نبرد آزما ہے۔ زیادہ تر سیاسی ادارے ابھی ارتقا کے مراحل میں ہیں۔ تاہم جمہوری حکومت کی چیدہ چیدہ خصوصیات میں مکمل دیانتداری اور روزمرہ زندگی میں مساوات و انصاف کے بنیادی اصولوں کی پاسداری بلا امتیاز رنگ و نسل، ذات پات اور مذہب شامل ہیں۔

جمہوریت کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ مندرجہ بالا مسائل سے احسن طور پر نمٹا جائے۔ جمہوریت غیر مخلوط نعمت نہیں۔ ایک جانب یہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کرتی ہے اور دوسری جانب یہ ایک ایسا پلیٹ فارم مہیا کرتی ہے جہاں عدم برداشت اور نفرت کے وہ انحرافی راستے وا کرتی ہے جو معاشرتی تقسیم اور تشدد کا باعث بنتے ہیں۔ عدم برداشت اور نفرت نے بے لگام ذرائع ابلاغ کے ذریعے عوام میں اپنی جڑیں بنائی ہیں۔

آئینی تحفظ

فرقہ وارانہ فسادات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا آئین صرف تحریری تحفظ دیتا ہے۔ اس بات

کی ضمانت کوئی نہیں ہے کہ ان حقوق کا عملاً تحفظ کیا جائے گا۔اس لیے ضروری ہے کہ متعلقہ حکومت اور ادارے ان کی پاسداری کے لیے عملی اقدامات کریں جو اس امر کو یقینی بنائے کہ ان حقوق کو تحفظ ملے اور عملی طور پر وہ ان سے مستفید ہو سکیں۔

تشدد ایک بین الاقوامی مسئلہ

کوئی معاشرہ یا قوم تعصب، فرقہ واریت، مذہبی عصبیت اور اس کے نتیجے میں ہونے والے تشدد سے عاری نہیں ہوتا۔1526ء میں بشپ آف لندن کو دہشت گردی کے الزامات کا سامنا کرنا پڑا تھا کیونکہ وہ پارلیمنٹ ہاؤس کو اس لیے اڑانا چاہتے تھے کہ پروٹسٹنٹس(Protestants) نے پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کرلی تھی۔ شیکسپیئر کے آخری ڈرامے ''ہنری ہشتم'' میں اس کا پاپائے اعظم یہ پیشین گوئی کرتے ہوئے ملتا ہے۔ ''مستقبل کی الزبتھ امن، فراوانی، محبت اور دہشت گردی کے مناسب اقدامات کے ملے جلے امتزاج سے حکمرانی کرے گی''۔ شمالی اور جنوبی آئر لینڈ کی اقوام ایک دوسرے سے باہم متصادم رہیں اور عقیدے کی بنیاد پر تشدد کو عام کیا۔

عدالتوں کا ذمہ داری

ایک آزادانہ جمہوریت میں عدالت عظمی جو کہ ملک کی سب سے بڑی عدالت ہے، کو یہ اختیار حاصل ہوتا ہے کہ وہ اس آئین کا تحفظ اور دفاع کرے جس میں شہریوں کو بنیادی حقوق مہیا کیے گئے ہیں۔اس لیے عدالتوں کو ان مقدمات کا فیصلہ کرتے وقت جن میں دورانِ مذہب اور بین العقائد تصادم کا عنصر موجود ہو، یہ امر ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ ہر عقیدے کے پیروکاروں میں کچھ ایسے پیروکار ہوتے ہیں جو مذہب کی تشریح کرتے ہوئے تنگ نظری سے کام لیتے ہیں۔ یہ لوگ جوشیلے پرچار کرتے ہوئے بھول جاتے ہیں کہ تمام عقائد کا پیغام مشترک اور انسانیت کی فلاح کے لیے ہے۔

تجاویز

اِس فیصلے میں عدالتِ عظمی نے اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے حکومت کو ان تجاویز پر

عمل کرنے کا حکم دیا:

1- وفاقی حکومت کو ایک ٹاسک فورس تشکیل دینی چاہیے جس کے ذمہ مذہبی رواداری کے قیام کا لائحہ عمل تشکیل دینے کا کام ہو۔

2- سکول اور کالج کے درجات پر ایسا مناسب نصاب تشکیل دیا جائے جو مذہبی اور سماجی رواداری کی ثقافت کو فروغ دے۔ 1981ء میں اقوام متحدہ نے اپنی ایک بنیادی قرارداد میں یہ قرار دیا کہ "بچے کو مذہب اور اعتقاد کی بنیاد پر کسی بھی قسم کے تعصب سے محفوظ رکھا جائے گا اور اس کی نشو نما سمجھداری، رواداری، افراد کے مابین دوستانہ روابط، امن اور آفاقی بھائی چارے، مذہبی آزادی اور دوسرے کے اعتقاد کی تعظیم اور اس شعور کے ساتھ کی جائے گی کہ اس کی صلاحیتیں اور توانائی اپنے ساتھیوں کی مدد کے لیے وقف ہوں گی"۔ (اقوام متحدہ کی قرارداد برائے خاتمہ عدم برداشت اور تعصب بر بنائے مذہب اور اعتقاد)۔

3- وفاقی حکومت ایسے مناسب اقدامات اٹھائے جن کی بنا پر سوشل میڈیا پر نفرت انگیز تقاریر کی حوصلہ شکنی کو یقینی بنایا جائے اور مرتکب افراد ک قانون کے مطابق سزا کے دائرہ میں لایا جائے۔

4- اقلیتوں کے حقوق کے لیے قومی کونسل تشکیل دی جائے جس کے دائرہ اختیار میں منجملہ اور چیزوں کے یہ بھی شامل ہو کہ آئین اور قانونکے تحت اقلیتوں کو حاصل حقوق اور تحفظات کو عملی طور پر تسلیم کیا جائے۔ کونسل کو یہ ذمہ داری بھی سونپی جائے کہ وہ وفاقی اور صوبائی حکومتوں کی جانب سے اقلیتوں کے حقوق کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے پالیسی سفارشات مرتب کرے۔

5- ایک مخصوص پولیس فورس تشکیل دی جائے جسے اقلیتوں کی عبادت گاہوں کے تحفظ کے لیے پیشہ ورانہ تربیت دی گئی ہو۔

6- فاضل اٹارنی جنرل پاکستان فاضل ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل پنجاب، خیبر پختونخوا اور بلوچستان کی جانب سے وفاقی صوبائی اداروں میں تعیناتی کے لیے اقلیتوں کا کوٹہ مختص کرنے کے

متعلق بیانات کے تناظر میں وفاقی حکومت اور صوبائی حکومتوں کو یہ ہدایات جاری کی گئیں کہ وہ متعلقہ پالیسی ہدایات جو تمام محکموں میں اقلیتوں کا کوٹہ مختص کرنے کے متعلق ہیں کے نفاذ کو یقینی بنائے۔

7- ان تمام مقدمات جن میں قانون کے تحت ضامن حقوق کی خلاف ورزی اور اقلیتوں کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی عمل میں لائی گئی ہو متعلقہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کو فوری اقدامات اٹھانے چاہئیں جن میں مرتکب افراد کے خلاف اندراج فوجداری مقدمات بھی شامل ہیں۔

8- دفترِ عدالت ایک علیحدہ فائل تیار کرے گا جسے بینچ کے تینوں اراکین کے روبرو پیش کیا جائے گا جس کا مقصد اس امر کو یقینی بنانا ہو گا کہ فیصلہ ہذا کو اس کی اصل روح کے مطابق مؤثر بنایا جائے اور مذکورہ بینچ ملک میں اقلیتوں کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی سے متعلق شکایات اور درخواستوں کو بھی سنے گا۔

یہ فیصلہ اقلیتی حقوق سے متعلق ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور ماہرین کے مطابق اگر قائداعظم کے وژن کی روشنی میں سن 2014 کے اس تاریخی فیصلے پر عمل کیا جائے تو پاکستانی اقلیتوں کے تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

(۲) توہینِ مذہب سے متعلق مقدمات پر سپریم کورٹ کا ایک اہم فیصلہ

یہ اصل میں ایک ملزم کی جانب سے ضمانت کی درخواست پر فیصلہ ہے۔ ملزم سلامت منشا مسیح پر الزام تھا کہ اس نے لاہور کے ایک پارک میں مسیحیت کی تبلیغ کرتے ہوئے توہینِ رسالت اور توہینِ قرآن کا ارتکاب کیا اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات مجروح کیے۔ چنانچہ اس کے خلاف مجموعۂ تعزیراتِ پاکستان کی دفعات 295-اے، 295-بی اور 295-سی کے تحت مقدمہ چلایا گیا۔ اس کی ضمانت کی درخواست ماتحت عدالتوں سے مسترد ہو گئی تھی جس کے بعد بالآخر معاملہ سپریم کورٹ تک پہنچا جہاں مقدمے کی سماعت جسٹس قاضی فائز عیسیٰ اور جسٹس سید منصور علی شاہ نے کی۔ فیصلہ جسٹس قاضی فائز عیسیٰ نے لکھا ہے اور حسبِ سابق پاکستانی قانون کی نصوص اور عدالتی نظائر کے

تجزیے کے علاوہ انھوں نے اس معاملے میں قرآن وسنت میں مذکور اسلامی احکام اور فقہائے کرام کے بیان کردہ اصولوں کا بھی حوالہ دیا ہے۔ سپریم کورٹ کے سامنے سوال یہ تھا کہ ملزم کو ضمانت پر رہا کیا جائے یا نہیں۔ سپریم کورٹ نے ضمانت منظور کی لیکن اس سوال کا جواب دیتے ہوئے سپریم کورٹ نے توہینِ رسالت کے مقدمات کے لیے چند اہم اصول بھی طے کیے ہیں۔ یہ فیصلہ کئی لحاظ سے بہت اہم ہے اور واضح کرتا ہے کہ ہمارے قانونی نظام میں بھرپور گنجائش موجود ہے کہ فیصلے اسلامی اصولوں کی روشنی میں کیے جائیں۔

یہ فیصلہ انگریزی میں ہے، جس کا ترجمہ پروفیسر ڈاکٹر مشتاق احمد نے کیا ہے۔

فیصلہ

1- اس درخواست کے ذریعے درخواست گزار پولیس تھانہ ماڈل ٹاؤن لاہور میں مجموعۂ تعزیراتِ پاکستان (’پی پی سی‘) کی دفعات 295-اے، 295-بی اور 295- سی کے تحت درج شدہ ایف آئی آر نمبر 61، مؤرخہ 13 فروری 2021ء، سے بننے والے مقدمے میں بعد از گرفتاری ضمانت چاہتا ہے۔ دفعہ 295-اے اس جرم کے بارے میں ہے جو ''دانستہ اور بدنیتی کے ساتھ شہریوں کے کسی طبقے کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرے۔ اس طبقے کے مذہب یا مذہبی عقائد کی توہین کرے یا اس کی کوشش کرے''۔ دفعہ 295-بی قرآن مجید کے کسی نسخے کی قصداً توہین، اسے نقصان پہنچانے یا بے حرمتی کرنے کو جرم قرار دیتی ہے۔ اور دفعہ 295- سی ''حضرت محمد ﷺ کے مقدس نام کی توہین'' کو جرم قرار دیتی ہے۔ 295-اے کے جرم پر دس سال تک کی سزا دی جاسکتی ہے، دفعہ 295-بی عمر قید کی سزا مقرر کرتی ہے، جبکہ 295- سی سزائے موت مقرر کرتی ہے۔

2۔ اس مقدمے کی بنیاد بننے والے واقعے کی اطلاع پولیس کو 13 فروری 2021ء کو رات 11 بج کر 20 منٹ پر دی گئی اور ایف آئی آر رات 11 بج کر 30 منٹ پر درج کی گئی۔ شکایت کنندہ (مسئول علیہ نمبر 2) نے، جو خواجہ رفیق شہید انٹر میڈیٹ کالج واقع والٹن روڈ لاہور

('کالج') کا طالب علم ہے، قرار دیا کہ وہ تین دیگر طلبہ، اپنے دوستوں ('چار دوست')، کے ساتھ ماڈل ٹاؤن پارک ('پارک') آیا ہوا تھا جہاں درخواست گزار اپنے ایک دوست کے ساتھ، جو کہ دونوں مسیحی تھے، تبلیغ اور گستاخانہ باتیں کر رہے تھے۔ یکم اپریل 2021ء کو درخواست گزار کو گرفتار کیا گیا اور اس کے بعد سے وہ مسلسل قید میں رہا ہے۔ اس کی درخواستِ ضمانت فاضل سیشنز جج اور فاضل جج ہائی کورٹ نے مسترد کر دی؛ دونوں فاضل ججز نے ضمانت مسترد اس لیے کی کہ انھیں ایف آئی آر کے مندرجات اور چار دوستوں کے بیانات پر مکمل اعتماد تھا۔

3۔ درخواست گزار کے وکیل کا کہنا ہے کہ ایف آئی آر ایک کتابچے "زندگی کا پانی" کا حوالہ دیتی ہے جس میں کوئی گستاخانہ مواد نہیں ہے؛ ایف آئی آر کا اندراج 8 گھنٹوں کی بلا جواز تاخیر کے بعد ہوا حالانکہ ماڈل ٹاؤن تھانہ پارک کے قریب واقع ہے؛ چار دوستوں نے، جن میں ہر ایک کے پاس موبائل فون تھا، وقوعے کو، جو تقریباً تیس منٹ تک جاری رہا، ریکارڈ نہیں کیا؛ چار دوستوں نے ظاہر نہیں کیا کہ ان تیس منٹوں میں ان کی جانب سے کیا کہا گیا تھا، اور یہ کہ یہ ناقابلِ یقین ہے کہ وہ کسی کو تیس منٹ تک گستاخانہ باتیں کرنے دیں اور آرام سے ایک طرف کھڑے ہو کر چپ چاپ سنتے رہیں؛ پارک کا انتظام ماڈل ٹاؤن سوسائٹی کے پاس ہے جس نے پارک کے لیے دن رات مسلسل محافظین کا بندوبست کیا ہوا ہے لیکن نہ تو کسی محافظ نے، نہ ہی پارک میں آنے والے کسی اور شخص نے شکایت کی نہ اپنے بیانات ریکارڈ کروائے؛ اور وہ دو مسیحی نرے احمق ہوں گے اگر انھوں نے چار نوجوان مسلمانوں کے سامنے وہ کچھ کہا جس کا ان پر الزام لگایا گیا ہے، وہ بھی ایسے پارک میں جہاں تمام نہ سہی، زیادہ تر لوگ مسلمان ہوں۔

4۔ فاضل ایڈیشنل پروسیکیوٹر جنرل پنجاب ('اے پی جی') ضمانت کی مخالفت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پولیس رپورٹ[1] (چالان) جمع کرائی جا چکی ہے، فردِ جرم عائد کر دی گئی ہے اور ٹرائل

[1] زیرِ دفعہ 173، مجموعۂ ضابطۂ فوجداری، 1998

کورٹ نے پانچ گواہوں کے بیانات تحریر کر لیے ہیں اور استغاثہ کے پانچ گواہوں کی گواہی باقی ہے۔ اس لیے اس مرحلے پر ملزم کو ضمانت کی رخصت عطا کرنا مناسب نہیں ہو گا، اور ایف آئی آر کے مندرجات اور چار دوستوں کے بیانات کی رو سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ملزم نے ان جرائم کا ارتکاب کیا ہے جن کی فردِ جرم اس پر عائد کی گئی ہے۔ جناب سید رفاقت حسین شاہ، جو شکایت کنندہ کی نمائندگی کر رہے ہیں، فاضل اے پی جی کے موقف کی تائید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو گواہ گواہی دے چکے ہیں ان پر جرح نہ کر کے درخواست گزار مقدمے کی تکمیل میں تاخیر کر رہا ہے۔

5۔ ہم نے مقدمے کے فریقوں کے وکلا کے دلائل سنے اور ریکارڈ پر موجود دستاویزات کے علاوہ فاضل اے پی جی کی جانب سے پیش کی گئی دستاویزات کا جائزہ لیا۔ مقدمے کی تفتیش پولیس کے سپرنٹنڈنٹ ('ایس پی') نے کی۔[2] ہمارے پوچھنے پر فاضل اے پی جی اور ایس پی نے بتایا کہ ایف آئی آر میں مذکور کتاب (زندگی کا پانی) میں کوئی توہین آمیز مواد نہیں ہے۔ پھر ہم نے معلوم کیا کہ کیا گرفتاری کے وقت یا بعد میں جرم ثابت کرنے والا کوئی مواد درخواست گزار سے برآمد کیا گیا ہے، اور ہمیں بتایا گیا کہ ایسا کوئی مواد برآمد نہیں کیا گیا۔ ایس پی نے ہمیں بتایا کہ پارک کا اس کالج سے فاصلہ، جہاں یہ چار دوست پڑھتے ہیں اور جہاں سے یہ اس پارک میں آئے تھے، تقریباً دس کلو میٹر ہے لیکن ریکارڈ پر ایسا کچھ نہیں ہے جو یہ دکھائے کہ یہ وہاں کیوں گئے؟ ہمیں یہ بھی بتایا گیا کہ درخواست گزار لاہور ویسٹ مینجمنٹ کمپنی میں خاکروب کے طور پر ملازم ہے۔

6۔ ہم نے ایف آئی آر بھی پڑھی اور چالان بھی جس میں ایف آئی آر ہی کی باتیں دہرائی گئی ہیں اور اس میں کوئی اضافی ثبوت نہیں ہے جس سے ملزم کا جرم ثابت ہوتا ہو۔ فرد جرم 5 اپریل

---

2 مجموعۂ ضابطۂ فوجداری، 1898، کی دفعہ 156-اے لازم کرتی ہے کہ مجموعۂ تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 295-سی کے تحت جرم کی تفتیش ایسا افسر کرے جو پولیس کے سپرنٹنڈنٹ کے عہدے سے کم نہ ہو۔

2022ء کو فاضل ایڈیشنل سیشنز جج نے عائد کی جسے یہاں نقل کیا جاتا ہے:

کہ تم ملزم نے اپنے شریک ملزم /ایوب مسیح (اشتہاری مجرم) کے ساتھ مل کر 13 فروری 2021ء کو 4 بج کر 35 منٹ پر ماڈل ٹاؤن پارک لاہور میں قرآن مجید کی بے حرمتی کی، اور توہین آمیز کلمات کہے اور حضرت محمد ﷺ کے مقدس نام کی توہین کی۔ پس تم ملزم سلامت مسیح اور تمھارے شریک ملزم ایوب مسیح (جو تب سے اشتہاری مجرم ہے) نے زیرِ دفعہ 295-اے، 295-بی اور 295-سی، مجموعۂ تعزیراتِ پاکستان، جرم کیا ہے، جو اس عدالت کے اختیار کے تحت آتا ہے۔

اور میں حکم دیتا ہوں کہ تم ملزم سلامت مسیح پر اس عدالت میں مذکورہ بالا فردِ جرم کی رو سے مقدمہ چلایا جائے۔

فرد جرم کے جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں متعدد بنیادی خامیاں ہیں اور اس میں فردِ جرم عائد کرنے کے متعلق کئی اہم مقررہ شرائط نہیں پائی جاتیں۔[3] ضروری ہے کہ فردِ جرم میں جرم کی مختصر توضیح ہو اور ساتھ ہی ان حالات کا مختصر ذکر ہو جن سے وہ جرم تشکیل پاتا ہے۔ فردِ جرم میں (جس طرح وہ عائد کی گئی ہے) تین جرائم کو ملا کر ایک جرم کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ہر جرم کے الگ عناصر ہیں لیکن فردِ جرم ایسا نہیں کہتی۔ ضروری ہے کہ فردِ جرم ملزم کو اس کے خلاف مقدمے سے پوری آگاہی دے جس کا اس نے جواب دینا ہے، اور اس کا اس قابل ہونا ضروری ہے کہ وہ اس جرم کے خلاف دفاع کر سکے جس کا اس پر الزام عائد کیا گیا ہے۔[4] درخواست گزار کے خلاف قرآن مجید کی بے حرمتی کا الزام عائد نہیں کیا گیا تھا (نہ تو ایف آئی آر میں اور نہ ہی چالان میں)، لیکن پھر بھی اس پر دفعہ 295-بی کے تحت فردِ جرم

---

3 مجموعۂ ضابطۂ فوجداری، 1998، کا انیسواں باب زیرِ عنوان "فردہائے جرم کی صورت"۔

4 ایس اے کے رحمانی بنام ریاست (2005 ایس سی ایم آر 364، فقرہ 20، ص 381-382)؛ محمد بخش بنام ریاست، وفاقی شرعی عدالت کا ایک فیصلہ (2021 ایم ایل ڈی 1725، فقرہ 7، ص 1730)۔

عائد کی گئی۔

7۔ درخواست گزار کے خلاف استغاثہ کا مقدمہ چار دوستوں کے بیانات پر مبنی ہے۔ ہم نے ان کی گواہی کا جائزہ لیا ہے جو اس بات سے شروع ہوتی ہے کہ درخواست گزار کے شریک ملزم نے کتاب ''زندگی کا پانی'' پیش کی اور ''دونوں ملزمان نے قصداً مسیحیت کی تبلیغ شروع کی''۔ مسیحیت کی تبلیغ کوئی جرم نہیں ہے، نہ ہی اسے جرم بنایا جاسکتا ہے کیونکہ ''مذہب پر عقیدہ رکھنا، عمل کرنا اور اس کی تبلیغ'' بنیادی حق ہے۔[5] وہ اس کے بعد کہتے ہیں کہ دونوں ملزمان نے حضرت محمد ﷺ کی ازدواجی حیثیت پر بات کی اور اس کا موازنہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کے ساتھ کیا اور ذو معنی جملہ کہا اور پھر قرآن مجید اور بائبل کے متعلق بات کی۔ ہم مبینہ توہین آمیز الزامات نہیں دہرا رہے کیونکہ اس سے گریز ضروری ہے، اور اس لیے بھی کہ وہ غیر ضروری اذیت اور اشتعال کا باعث بن سکتے ہیں۔[6]

8۔ بدقسمتی سے ایسے مقدمات کی بہت تشہیر ہوتی ہے جس کا غلط اثر ہوتا ہے اور اس سے منصفانہ سماعت کا حق بھی متاثر ہو سکتا ہے۔ غیر ذمہ دارانہ اور سنسنی خیز نشر و اشاعت کے ذریعے بار بار وہ کچھ دہرایا جاتا ہے جو مبینہ طور پر ملزم نے کہا یا کیا ہوتا ہے؛ جبکہ اسے دہرانے والے شاید خود وہی جرم کر رہے ہوں۔ مذہب سے متعلق جرائم بہت سنگین ہیں اور دفعہ 295-سی کے جرم پر صرف موت کی سزا مقرر ہے۔ اس لیے تمام متعلقہ افراد پر یہ یقینی بنانا لازم ہے کہ عدل کے نفاذ میں کوئی بے انصافی نہ ہو جائے۔ عدالتوں نے اس حقیقت کا نوٹس لیا ہے کہ کئی بار حساب برابر کرنے کے لیے جھوٹے الزامات لگائے گئے ہیں اور مذموم مقاصد کے لیے یا

[5] دفعہ 20-اسے، آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان۔ مزید دیکھیے: ایس ایم سی نمبر 1 آف 2014 (پی ایل ڈی 2014 سپریم کورٹ 699، ص 718)۔

[6] پنجاب ریلیجس بکس سوسائٹی بنام ریاست، تین فاضل ججز پر مشتمل بنچ کا فیصلہ (پی ایل ڈی 1960 لاہور 629، ص 640)۔

غلط محرکات کی وجہ سے مقدمات بھی قائم کیے گئے ہیں۔[7]

9۔ فوجداری نظام کے تبدیل ہونے اور اسلامی اصولوں پر قائم ہونے سے قبل انسانی زندگی اور بدن پر اثر انداز ہونے والے جرائم[8] کو ریاست کے خلاف جرائم تصور کیا جاتا تھا۔ اب ان جرائم کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ ایسے جرائم ہیں جن سے متاثرہ افراد یا ان کے ورثا کے حقوق کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ اس عدالت کی شریعت اپیلیٹ بنچ کے ایک پانچ رکنی بنچ نے اس تبدیلی کی توضیح یوں کی ہے:

"اسلامی احکام کی رو سے۔۔۔ متاثرہ فرد یا اس کے ورثا کا ابتدا سے آخر تک پورے معاملے پر، بشمول اور مجرم کے، مکمل کنٹرول ہوتا ہے۔ وہ چاہیں تو اس کی اطلاع نہ دیں۔ وہ چاہیں تو مجرم کے خلاف استغاثہ نہ کریں۔ وہ چاہیں تو اپنی آزادانہ مرضی سے استغاثہ چھوڑ دیں۔ وہ چاہیں تو مجرم کو کسی بھی مرحلے پر سزا کی تنفیذ سے قبل معاف کر دیں۔ جرم اور مجرم کی معافی کے لیے وہ مالی یا کوئی اور عوض لے سکتے ہیں۔ وہ صلح کر سکتے ہیں۔ وہ مجرم سے قصاص لے سکتے ہیں۔ ریاست رکاوٹ نہیں بن سکتی، لیکن اپنی حد تک بھرپور کوشش کرتی ہے کہ ان کا مقصد پورا ہونے اور ان کے حقوق کے مناسب استعمال میں ان کی معاونت کرے۔[9]"

مجموعۂ ضابطۂ فوجداری، 1898ء ('مجموعہ') کی دفعہ 345 اور دوسرے جدول میں بھی ترمیم کر کے قتل کے علاوہ زخم کی بہت سی اقسام[10] کو قابلِ صلح بنا دیا گیا۔ تاہم "مذہب سے متعلق جرائم[11]" میں کوئی بھی جرم قابلِ صلح نہیں ہے (سوائے کسی شخص کے مذہبی جذبات کو

---

[7] یہ امور ان مقدمات میں بھی نوٹ کیے گئے ہیں: محمد محبوب بنام ریاست (پی ایل ڈی 2002 لاہور 587، فقرہ 30، ص 601)؛ ایوب مسیح بنام ریاست (پی ایل ڈی 2002 سپریم کورٹ 1048)۔

[8] مجموعۂ تعزیراتِ پاکستان کا باب 16

[9] وفاقِ پاکستان بنام گل حسن خان (پی ایل ڈی 1989 سپریم کورٹ 633، ص 684-685)۔

[10] مجموعۂ تعزیراتِ پاکستان کے باب 16 کے تحت جرائم۔

[11] مجموعۂ تعزیراتِ پاکستان کا باب 15۔

مجروح کرنے کے نسبتاً معمولی جرم کے [12] جس پر زیادہ سے زیادہ تین سال تک قید کی سزا ہے)۔ مذہب کے متعلق جرائم کے بارے میں ریاست کی حیثیت غالب ہے اور ان جرائم پر استغاثے کے لیے ریاست ذمہ دار ہے۔ ایسے مقدمات میں جب نجی شکایت کنندہ بہت ہی زیادہ دلچسپی لے تو اس سے اس کے قابلِ اعتبار ہونے پر شک ہو سکتا ہے اور یہ فساد یا کسی غلط محرک کی علامت ہو سکتی ہے۔ تاہم چند ایک مقدمات میں دیکھا گیا کہ شکایت کنندگان بڑا جتھا بنا لیتے ہیں اور ان کے ساتھ دوسرے لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو استغاثہ اور عدالتوں پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ موجودہ مقدمے میں شکایت کنندہ، جو ایک طالب علم ہے، لاہور سے اسلام آباد اس مقصد کے لیے آیا کہ ضمانت کی مخالفت کرے۔ اسے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اس معاملے کی پیروی کے لیے ریاست اور اس کے قانونی افسران موجود تھے۔ اور جب ہم فاضل اے پی جی اور ایس پی سے سوالات پوچھ رہے تھے، تو شکایت کنندہ اور اس کے وکیل اے پی جی اور ایس پی کو جوابات فراہم کر رہے تھے۔

10۔ درخواست گزار تقریباً ڈیڑھ سال سے قید میں ہے اور اس ساری مدت میں (جیسا کہ اوپر ذکر کر دیا گیا) اس سے کوئی ایسا مواد برآمد نہیں کیا گیا جس سے اس کا جرم ثابت کیا جا سکے۔ ایس پی اور فاضل اے پی جی کا کہنا ہے کہ درخواست گزار کا موبائل فون بھی چیک کیا گیا، لیکن اس سے بھی کوئی ایسا مواد نہیں ملا جس سے جرم کو ثابت کیا جا سکے، نہ ہی ایسا مواد ملا جس سے اندازہ ہو کہ درخواست گزار کا رجحان اس فعل کی طرف تھا جس کا اس پر الزام لگایا گیا ہے۔ ایف آئی آر اور چالان کے مطابق درخواست گزار تبلیغ کر رہا تھا لیکن اس بات کی تائید کے لیے کوئی مواد نہیں ہے اور اس بات کا وزن کم ہو جاتا ہے جب اس بات کا اعتراف کیا جاتا ہے کہ درخواست گزار کوئی مبلغ نہیں بلکہ ایک عام خاکروب ہے۔ استغاثہ کا پورا مقدمہ چار دوستوں کی گواہی پر قائم ہے۔ تاہم ایسا کچھ بھی نہیں ہے جس سے ان کی گواہی

---

12 مجموعۂ تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ 198۔

کیتائید ہوسکے۔اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیاتائید کاہوناضروری ہے؟

11۔ تائید (corroboration) سے مراد ہے تقویت اور تصدیق، اور تائیدی ثبوت اس ثبوت سے الگ ہوتا ہے جس کو وہ تقویت دیتا ہے۔[13] تائید سے عدالتی فیصلوں میں غلطیوں کا امکان کم ہو جاتا ہے اور یہ عقل کا تقاضا ہے۔تائید کا مقصد مجرم کی سزا یقینی بنانااور بے گناہ کو سزا سے بچانا ہے۔ تاہم تائیدی ثبوت کسی بے اعتبار گواہ یا ثبوت کو بااعتبار نہیں بنا دیتا۔[14] اس مقدمے میں درخواست گزار کے خلاف صرف چار دوستوں کی گواہی ہے۔ ہمیں جرائم کی سنگینی کی بات ذہن میں رکھنی ہے اور یہ بھی کہ دفعہ 295-سی کے جرم کے لیے مقرر کی گئی صرف سزائے موت ہی ہے۔اس لیے عقل کا تقاضا ہے کہ ان کے بیانات کو، جو اس مرحلے پر غیر یقینی نظر آتے ہیں، دوسرے ثبوتوں سے تائید ملے جو واقعاتی، دستاویزی اور/یا سائنسی ہو سکتے ہیں۔ اسلامی اصول بھی بعض حالات میں گواہی کے لیے تائید کے ہونے کو ضروری قرار دیتے ہیں۔[15]

12۔ ملزم کے بنیادی حقوق متعلقہ بہ منصفانہ سماعت اور قانونی طریقہ[16] کی ضمانت ضروری ہے، بالخصوص ان مقدمات میں جن میں سخت سزائیں مقرر کی گئی ہیں۔ایسی مثالیں موجود ہیں کہ

---

[13] ارشاد احمد بنام ریاست (1990 پی سی آر ایل جے 374، 383-اے)۔

[14] ڈائریکٹر آف پبلک پروسیکیشنز بنام کلبورن ([1973 اپیل کیسز 729) جس میں دارالامراء نے قرار دیا تھا (ص 746) کہ: ''تائید صرف اس گواہ کو دی جاسکتی ہے، یا وہ دے سکتا ہے جس پر اس کے بغیر اعتبار کیا جاسکتا ہو۔اگر کسی گواہ کی گواہی خود اپنی کمزوری کی بنا پر ساقط ہو جائے، تو اسے تائید کی ضرورت، یا اس کی جانب سے کسی کو تائید دیے جانے کی اہلیت، کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔'' اور ڈائریکٹر آف پبلک پروسیکیشنز بنام 1975 (1975 اپیل کیسز 421) میں دارالامراء نے قرار دیا تھا (ص 455) کہ: ''جب تک کسی گواہ کی گواہی ذاتی طور پر قابلِ اعتبار نہ ہو، وہ نہ کسی کو تائید فراہم کر سکتا ہے، نہ ہی یہ سوچا جاسکتا ہے کہ اسے تائید کی ضرورت ہے۔''
ارشاد احمد بنام ریاست (1990 پی سی آر ایل جے 374، 385-بی)۔

[15] ابو عیسیٰ الترمذی (824-892)، سنن، کتاب 11، حدیث 1180؛ ابو بکر السرخسی (1009-1090)، المبسوط، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، 1997، ج 16، ص 122۔

[16] آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان، دفعہ 10-اے۔ نوید اصغر بنام ریاست (پی ایل ڈی 2021 سپریم کورٹ 600، 618 اچ)۔

اشتعال دلانے والوں نے جذبات مشتعل اور برانگیختہ کر دیے، اور ہجوم اکٹھا کر کے اسے ابھارا کہ قانون اپنے ہاتھ میں لے، جس نے ملزم کو زخمی کیا اور یہاں تک کہ قتل بھی کر دیا، قبل اس کے کہ اسے عدالت مجرم قرار دیتی۔ خواہ عدالت کسی شخص کو مجرم قرار دے کر اسے سزائے سنائے، تب بھی اس سزا کا نفاذ اگر کسی ایسے فرد نے کیا جسے اس کے لیے اختیار نہ دیا گیا ہو، تو اسلامی اصولوں کے مطابق ایسا شخص افتیات (ریاست کا حق ضائع کرنے) کے لیے ذمہ دار ٹھہرتا ہے جس پر اسے سزا دی جائے گی۔[17]

13۔ اسلامی اصول[18] مذہب کے متعلق جرائم کو خدا کے خلاف جرائم قرار دیتے ہیں؛ فقہاء کی اصطلاح میں، جو انھیں حدود میں شمار کرتے ہیں، یہ ''خدا کے حقوق'' سے متعلق ہوتے ہیں۔ حد کے جرم میں کسی ملزم کا جرم ثابت کرنے کے لیے اسلامی اصولوں کی رو سے ثبوت کا سخت ترین، یا بہترین، معیار مقرر کیا گیا ہے اور کوئی شبہ ملزم کو بری کر دیتا ہے۔ نبی ﷺ کی ایک مشہور مستند حدیث[19] میں، جس کی روایت کئی صحابہ نے کی ہے، آیا ہے:

"ادْرَءُوا الْحُدُودَ بِالشُّبُهَاتِ"۔ (شبہات کی موجودگی میں سزاؤں سے گریز کرو۔[20])

دوسرے خلیفۂ راشد حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اس اصول کو ان الفاظ میں

---

17 سرخسی، المبسوط، ج 9، ص 121؛ ابن عابدین الشامی (1784-1836)، ردالمحتار، مصطفٰی البابی، القاهرة، ج 3، ص 176؛ ابن عبد البر الاندلسی (978-1071)، التمهید، وزارة الاوقاف والشؤون الاسلامية، المغرب، 1967، ج 21، ص 256؛ ابو اسحاق الشیرازی (1003-1083)، المهذب، دار الكتب العلمية، بیروت، 2002، ج 3، ص 258۔ مثال کے طور پر اگر کسی جنگی مجرم کو گرفتاری کے بعد سزائے موت کا مستحق قرار دیا گیا ہو اور اسے کسی شخص نے ریاست کی اجازت کے بغیر قتل کر دیا، تو اس شخص کو افتیات کے ارتکاب پر سزا کا سامنا کرنا ہوگا۔ سرخسی، شرح السیر الکبیر، دار الكتب العلمية، بیروت، 1997، ج 3، ص 126۔

18 اگرچہ مجموعۂ تعزیراتِ پاکستان میں ایسا نہیں کہا گیا۔

19 نبی ﷺ کی روایت۔

20 ابو یوسف (729-798)، کتاب الخراج، دار المعرفة، بیروت، 1979، ص 152؛ علاؤ الدین الحصکفی (1616-1671)، مسند أبي حنيفة، کتاب الحدود، حدیث 4؛ ابو عیسیٰ الترمذی (824-892)، سنن، کتاب 15، حدیث 1424۔

دہرایا:

"اِدْرَءُوا الْحُدُودَمَا اسْتَطَعْتُمْ"۔(سزاؤں سے گریز کرو جس حد تک تم کر سکتے ہو۔[21])

اس عدالت نے دفعہ 295-سی کے ایک مقدمے میں اس اصول کو ان الفاظ میں تسلیم کیا ہے: "یہاں اس بات کا تذکرہ بے جا نہیں ہوگا کہ یہ اصول (شک کا فائدہ) اسلامی قانون میں ایک مرکزی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے کیونکہ نبی ﷺ نے فرمایا تھا کہ: قاضی کسی مجرم کو چھوڑنے کی غلطی کرے تو یہ کسی بے گناہ کو سزا دینے کی غلطی سے بہتر ہے۔[22]"

میکگل یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز کے پروفیسر وائل بی حلاق نے بہت خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے:

"حدود جرائم پر سخت سزاؤں کا مقصد لوگوں کو ان کے ارتکاب سے باز رکھنا (زجر) تھا اور اس لیے عملاً ان کا نفاذ کم ہی کیا گیا۔۔۔ان کے ارتکاب پر اس دنیا میں سزا نہ ہونے کی صورت میں مجرم ابدی جہنم میں جا گرتا، مابعد الموت زندگی کا ایسا تصور جس کے نتیجے میں اخلاقی ذمہ داری کا احساس نفسیات میں راسخ ہو جاتا۔ حدود کے اطلاق میں بہت زیادہ احتیاط کا ماخذ یہ قاعدہ تھا جو ایک حدیث سے نکلا تھا کہ ""معمولی ترین شبہے کی موجودگی میں بھی" ان سے گریز ضروری ہے۔[23]"

14۔ اسلامی قانون کے اصولوں کی پابندی، منصفانہ سماعت اور قانونی طریقے کے بنیادی حقوق کا اطلاق جن کی ضمانت آئین میں دی گئی ہے، اور معقول طریقے پر عمل پیرا ہونا تاکہ یہ یقینی بنایا جائے کہ مذہب سے متعلق جرائم میں کسی بے گناہ کو غلطی سے سزا نہ ملے، ان سارے امور کا

---

[21] محمد بن الحسن (749-805)، کتاب الأصل، دار ابن حزم، بیروت، 2004، ج7، ص150۔

[22] ایوب مسیح بنام ریاست (پی ایل ڈی 2002 سپریم کورٹ 1048، 1056 بی)۔

[23] Sharia: Theory, Practice, Transformation, Cambridge University Press 2009, part II, chapter 10, p. 246.

تقاضا ہے کہ جب صرف گواہوں کی غیر یقینی گواہی ہو، تو اس کے ساتھ تائیدی ثبوت کا ہونا ضروری ہے۔ بسا اوقات پارسائی کا جذبہ، اخلاقی جوش اور/یا اشتعال بھی فوجداری مقدمات میں عمومی معیارِ ثبوت، یعنی ''معقول شبہے سے بالاتر''،[24] کو دھندلا کر دیتا ہے اور استغاثہ کو ایک پہلے سے طے شدہ ہدف کی طرف دھکیلتا ہے۔

15۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تفتیشی ایس پی نے دو ملزمان کی بات نہ مانی اور چار دوستوں کی بات قبول کی۔ ایسی ترجیح کے لیے کوئی معقول وجہ بیان کرنا تو در کنار، سرے سے کوئی وجہ ہی ذکر نہیں کی۔ کسی تفتیشی افسر کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ کسی کے ساتھ امتیاز برتے یا مذہبی بنیاد پر ترجیح دے۔[25] دفاع کا بیانیہ بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔[26] اس بات کا ذکر بھی بے جا نہیں ہوگا کہ وفاقی شرعی عدالت[27] نے بعض معروف علماے اسلام کی آرا نقل کی تھیں جنھوں نے رائے دی تھی کہ جہاں گستاخی کا ارتکاب بھی کیا گیا ہو، وہاں بھی اگر ملزم نے توبہ کر لی تو اسے سزا نہیں دینی چاہیے۔[28]

16۔ ہمیں بتایا گیا کہ درخواست گزار کا پیشہ عوامی مقامات کی صفائی ہے، جو قابلِ تحسین ہے۔ مذہبِ اسلام ذہن، بدن اور ماحول کی صفائی کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور اس سے محبت رکھتا ہے۔ قرآن مجید کا کہنا ہے:

''إِنَّ ٱللَّهَ يُحِبُّ ٱلتَّوَّٰبِينَ وَيُحِبُّ ٱلْمُتَطَهِّرِينَ''۔ یقیناً، اللہ محبت کرتا ہے توبہ کرنے والوں

---

[24] نوید اصغر بنام ریاست (پی ایل ڈی 2021 سپریم کورٹ 600، 617 ایف)؛ سلمان رفیق بنام قومی احتساب بیورو (پی ایل ڈی 2020 سپریم کورٹ 456)؛ رحمت بنام ریاست (پی ایل ڈی 1977 سپریم کورٹ 515، ص 527 ای)۔

[25] آئین اسلامی جمہوریۂ پاکستان کی دفعات 14، 20، 25(1) اور 26(1)۔

[26] عبید اللہ بنام ریاست (1991 ایس سی ایم آر 1734، 1736 بی)۔

[27] محمد اسماعیل قریشی بنام پاکستان (پی ایل ڈی 1991 وفاقی شرعی عدالت 10)۔

[28] ایضاً۔ مولانا مفتی غلام سرور قادری، فقرہ 5، ص 17، مولانا حافظ صلاح الدین یوسف، فقرہ 6، ص 17، اور مولانا سعد الدین شیر کوٹی، فقرہ 10، ص 18۔

سے، اور محبت کرتا ہے پاکیزگی اختیار کرنے والوں سے۔[29]

نبی پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اَلطُّهُورُ شَطْرُ الْإِيمَانِ"۔ صفائی نصف ایمان ہے۔[30]

نبی پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے مشاہدہ کیا کہ آپ خود گھر کے معمولی کام کیا کرتے تھے۔[31] پہلے خلیفۂ راشد ابو بکر رضی اللہ عنہ ایک بوڑھی نابینا خاتون کے گھر جا کر اس کا کوڑا کرکٹ اور گندگی صاف کرتے تھے۔[32]

17۔ اب ہم آگے بڑھتے ہوئے اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ کیا مقدمے کے اختتام سے قبل درخواست گزار کو ضمانت پر رہا کیا جانا چاہیے؟ یہ ہیں مقدمے کے حقائق اور ریکارڈ پر موجود ثبوت جنھوں نے ہمیں اس درخواستِ ضمانت کا فیصلہ کرنے میں مدد دی ہے۔ چار دوست اپنے کالج سے پارک میں آئے جو ان کے کالج سے دس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، لیکن انھوں نے وضاحت نہیں کی کہ انھوں نے اتنی دور واقع پارک کو کیوں چنا، یا یہ کہ وہ کالج سے وہاں کیسے پہنچے؟ اہم بات یہ ہے کہ پارک میں موجود دوسرے لوگوں یا پارک میں تعینات محافظین نے درخواست گزار پر الزام کے لیے انگلی نہیں اٹھائی، نہ ہی ان کو تفتیش میں شامل کیا گیا۔ چار دوستوں نے گواہی دی کہ درخواست گزار ''قصداً مسیحیت کی تبلیغ'' کر رہا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خیال میں یہ جرم تھا (جبکہ ایسا نہیں ہے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا)۔ درخواست گزار کے مبلغ ہونے کے متعلق ثبوت بھی پیش نہیں کیا گیا، جس سے ان کی گواہی کا وزن کم ہو جاتا ہے۔ پھر شکایت کنندہ نے پولیس کو اطلاع دینے میں تقریباً آٹھ

---

29 سورۃ البقرۃ (2)، آیت 222۔ نیز دیکھیے، آیت 151۔

30 مسلم بن الحجاج القشیری (815-875)، صحیح مسلم، باب 2، حدیث 223۔

31 محمد بن اسماعیل البخاری (810-870)، صحیح البخاري، باب 10، حدیث 676۔

32 ابن عساکر (1106-1176)، تاریخ دمشق، دار الفکر، بیروت، 1995، ج 30، ص 322۔

گھنٹے لگائے، اگرچہ پولیس تھانہ مزعومہ موقع واردات کے بالکل قریب تھا۔ مسلمہ طور پر درخواست گزار، جو کہ ایک خاکروب ہے، چار دوستوں کی بہ نسبت بہت کم تعلیم یافتہ ہے جس کی وجہ سے یہ بات قبول کرنا مشکل ہو جاتی ہے کہ انھوں نے ان اس کے مزعومہ بیانات کا جواب نہیں دیا ہو گا، اور تیس منٹ تک خاموش کھڑے رہے ہوں گے۔ نیز درخواست گزار سے جرم ثابت کرنے والا کوئی مواد برآمد نہیں کیا گیا۔ یہ تمام عوامل اسے مزید تحقیق کا مقدمہ بنا دیتے ہیں اور درخواست گزار کو ضمانت کا مستحق کر دیتے ہیں۔

18۔ اس لیے درخواست گزار کو ضمانت پر رہا کیا جاتا ہے، اس شرط پر کہ وہ مبلغ 50 ہزار روپے کا مچلکہ، مع ایک ضامن اسی مقدار کے مچلکے کے ساتھ، جو ٹرائل کورٹ کے لیے قابلِ اطمینان ہو، جمع کرائے۔ اس درخواست کو اپیل میں تبدیل کیا جاتا ہے اور اعتراض شدہ حکم کو منسوخ کرتے ہوئے اس درخواست کو مذکورہ شرائط کے ساتھ منظور کیا جاتا ہے۔

19۔ ہم نے انتہائی احتیاط کی ہے کہ مقدمے کی صحت و عدم صحت کے متعلق کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے درخواست گزار یا ریاست کے مقدمے پر غلط اثر پڑے، سوائے اس بات کے جو ضمانت کی درخواست کا فیصلہ کرنے کے لیے ضروری تھی۔ تاہم چونکہ درخواست گزار کا مقدمہ آئین اور قانون کے مطابق نہیں چل رہا تھا، تو ہم اپنا فریضہ ادا کرنے میں ناکام ہوتے اگر ہم مذکورہ خامیوں کی نشاندہی نہ کرتے۔ ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ ٹرائل کورٹ کے فاضل جج بھی ان امور کی طرف توجہ کریں گے۔

20۔ اس حکمنامے کی نقل چاروں صوبوں اور اسلام آباد وفاقی علاقے کے محکمہ ہائے استغاثہ کی طرف اطلاع اور عمل درآمد کے لیے بھیج دی جائیں تاکہ وہ یقینی بنائیں کہ مجموعۂ تعزیراتِ پاکستان کے باب 15 میں مذکور مذہب کے متعلق جرائم کی تفتیش آئین اور قانون کے مطابق اسی طرح سرانجام دی جائے جیسا کہ یہاں بتایا گیا اور واضح کیا گیا۔

- British Parliamentary Delegation Report on Pakistan's Minorities.. 387
- Efforts of Council of Islamic Ideology after Sialkot Tragedy 392
- Opinion of Scholars on Religious Intolerance and Minority Issues... 392
- The Loss of Youth's Abilities Leads to Stress and Lawlessness ....Dr. Jahanzaib 395
- Blasphemy Law and Legal Issues Prof. Dr. Mushtaq Ahmad 399
- The Importance of Training and Accurate Information to Combat Extremism ....Dr. Umair Mahmood Siddiqi 403
- Recommendation of Council of Islamic Ideology on Sialkot Tragedy... 406

Important Court Decisions about Religious Freedom and Minority Rights

- Justice Tassaduq Jilani's Verdict 408
- Supreme Court's Decision about Cases of Blasphemy....... 413

- The Issue of Extremism in Pakistan and the Role of Civil Society .... Muhammad Husain, Ghulam Murtaza 275

Minorities and Blasphemy Laws

- The Need for Improvement in the Blasphemy Law ....Prof. Dr. Mushtaq Ahmad 289
- Census of Pakistan and Actual Number of Minorities ....Islam Gul Afridi 297
- Minorities in Pakistan: Introduction and History .... Shakil Anjum Sawan 301
- Issues of Minorities in Pakistan: Facts and Recommendations .... Muhammad Israr Madani 310
- The Debate on the Constitutional and Religious s Status of Ahmadi Community ....Dr. Ammar Khan Nasir 316
- The Problem of Forced conversion in Pakistan ....Zia ul Rehman 328
- Blasphemy Law: International Standards, Reservations and Issues ....Zia ul Rehman 336
- Issues and Rights of Minorities in Pakistan ....Dr. Nadeem Abbas 347

Sectarian Conflicts

- Roots of Sectarianism: Religious, Political or Historical? .... Wali Nasr 357
- Sectarianism: How to Overcome these Conflicts .... Khursheed Nadeem 362
- Role of Mosques and Madrasas for Religious and Social Unity .... Khursheed Nadeem 367
- Barriers to Sectarian Harmony and Religious Freedom ..... Dr. Syed Mohsin Naqvi 372

Religious Freedom and Violent Incidents: Debate and Recommendations of Council of Islamic Ideology

- National Policy for Interfaith Harmony................................ 383
- Charter Demand for Minorities... 386

- Saudi Arabia's Vision 2030 and Efforts for Religious Tolerance .... Muhammad Israr Madani 147
- The Status of Religious Minorities in Iran .... Tahmeed Jan Azhari 156
- Lebanon, the Land of Religious and Sectarian Conflict .... Shafiq Mansoor 163
- Turkey, A Safe and Ideal Place for Minorities .... Faeza Haseeb 168
- Malaysia: A Multi-Religious and Diverse Society .... Rubaab Zainab 175

Roots and Issues of Religious Freedom in the Subcontinent

- Historical Relations between Hindus and Muslims in the Subcontinent .... Shafiq Mansoor 185
- The situation of the Muslim Minority in India; An Analysis of the Constitutional and Administrative structure .... Dr. M. K. Siddiqi, Prof Iqbal Ansari 192
- Religious Freedoms and Minorities in Bangladesh .... Kiran Fida 203

The Issue of Religious Freedom in Pakistan

- The Issue of Religious Freedom in Pakistan: Constitutional Discourse .... Zafrullah Khan 211
- The Issue of Religious Freedom: The role of Muslim Religious Movements .... Shams ul Din Hasan Shigri 220
- Why Sufis become intolerant ... Sahibzada Amanat Rasool 230
- Religious Freedom and laws Protecting Minorities in Pakistan .... Irum Khalid, Maqbool Anwar 237
- Standards of Religious Freedom in Islamic and Pakistani Law .... Dr. Muhammad Shahid Habib 246
- The Concept of Religious Freedom in Pakistan and the Role of Ulama .... Mujtaba Rathor 257
- Rights of Minorities in Manifestos of Religious Parties .... Muhammad Ejaz 266

CONTENTS

Editorial

- The Question of Religious Freedom in the Contemporary World 7

Religious Freedom: Islamic Perspectives

- The Concept of Freedom and Tolerance in Islam ....Fatehullah Gulan 19
- The Extent of Cultural and Geographical Manifestations of Islam: Practical Examples of Tolerance .... Dr. Syed Husain Nasr 30
- Religious Freedom, Apostasy and Conversion ....Dr. Hashim Kamali 41
- Islamic Declaration of Human Rights and Religious Freedom....................................... Mehboob Ahmad Ghazi 67

West, International Organizations and Religious Freedom

- Religious Freedom and Expression of Freedom in the West; Search for Balance .....Noor Hayat Khan, Ghias Ahmad 79
- Muslims and the West: Religious Tensions or Political Conflicts? .... Bernard Lewis 88
- Freedom of Religion and Belief and the Charter of the United Nations .... Rashad Bukhari 102
- Islamophobia in Western Politics and the Society: Problems and Solution ....Abdul Rasheed Agwan 131

Middle East and Religious Freedom

- Middle East Civil Wars: Is Religion the Only Reason .... Ibrahim Kalin 143

Muslim World and Religious Freedom

Perils and Prospects

This Special issue of ***Tahqiqaat*** published by the "International Research Council for Religious Affairs" (IRCRA) focuses on the question of Religious Freedom from Islamic and Western Perspectives. All the papers written for this special issue are in Urdu. The following content list shows the breadth and depth of the topics discussed and covered at length.

SPECIAL EDITION

YEARLY ISLAMABAD

TAHQIQAAT

2022

2

MUSLIM WORLD and RELIGIOUS FREEDOM

Perils and Prospects

Edited by: Muhammad Israr Madani